مکالمہ

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

دار الفکر الاسلامی

نام کتاب: مکالمہ
مصنف: ڈاکٹر حافظ محمد زبیر
ناشر: دار الفکر الاسلامی
جلد: دوم
صفحات: 250
قیمت: 350روپے
طبع اول: ستمبر، 2017ء
ای میل: mzubair@ciitlahore.edu.pk
hmzubair2000@hotmail.com

مصنف کی کتب کے ملنے کا پتہ:

☆ عبد المتین مجاہد: K-36، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ 0300-4199099
☆ مجلس تحقیق اسلامی، J-99، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ 042-35839404
☆ قرآن اکیڈمی، یسین آباد، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ 021-36337361

مصنف کی دیگر کتب:

☆ وجود باری تعالی: مذہب، فلسفہ اور سائنس کی روشنی میں
☆ صالح اور مصلح: کتاب وسنت اور سلف صالحین کے منہج پر تزکیہ نفس اور اصلاح احوال کا پروگرام
☆ اسلام اور مستشرقین
☆ مولانا وحید الدین خان: افکار و نظریات
☆ فکر غامدی: ایک تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ
☆ عصر حاضر میں تکفیر، خروج، جہاد اور نفاذ شریعت کا منہج

مصنف کی جملہ کتب کے پی ڈی ایف ورژن کا ڈاؤن لوڈ لنک:

http://kitabosunnat.com/musannifeen/muhammad-zubair-temi.html

بسم الله الرحمن الرحيم
In The Name Of Allah, The Most Beneficent, The Most Merciful

﴿وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾

[النحل: 125]

''اور ان سے مکالمہ کریں، اس طریقے سے جو بہترین ہو۔''

انتساب

اہلیہ محترمہ کے نام

کہ بلاشبہ میں آج جو کچھ بھی ہوں ‘اس ہونے کے ظاہری اسباب میں
سے ایک بڑا سبب وہ بھی ہیں۔

فہرست مضامین

مقدمہ

مکالمہ کی دوسری جلد قارئین کے پیش خدمت ہے۔ اس جلد میں فیس بک اور سوشل میڈیا پر شیئر کی جانے والی اُن تحریروں کو جمع کرنے کے بعد تہذیب وتنقیح کے ساتھ پبلش کیا جارہا ہے جو مذہب اور ریاست، لسانیات اور نفسیات، معاشرت اور معیشت، تعلیم اور تحقیق اور تصوف اور تزکیہ کے موضوعات سے متعلق تھیں۔ یہ جلد پانچ ابواب اور تقریباً 250 صفحات پر مشتمل ہے۔

اس کتاب کی پہلی جلد کے موضوعات وجود اور علم، الحاد اور ایمان، توحید اور شرک، روایت اور جدیدیت اور فلسفہ اور سائنس تھے۔ اور تیسری جلد کے موضوعات امن اور جنگ، اعلام اور شخصیات، مسالک اور جماعتیں، انکار حدیث اور حجیت حدیث، فنون لطیفہ اور اسلام، اور طنز ومزاح ہیں۔

اس جلد میں بہت سی تحریریں ایسی بھی جمع ہو گئی ہیں کہ جنہیں معروف معنی میں فتوی کہتے ہیں لیکن میں واضح کر دوں کہ میں معروف معنی میں مفتی نہیں ہوں۔ شرعی مسائل میں ایک رائے اور اس کے دلائل رکھتا ہوں اور اس پر اعتماد بھی ہے لیکن قارئین سے گزارش یہی ہے کہ میری کسی رائے پر عمل کرنے سے پہلے دو راسخ علماء سے مشورہ لے لیں۔ اگر وہ مشورہ دے دیں تو عمل کر لیں۔

میں ہمیشہ یہ کوشش کرتا ہوں کہ روایت کے دائرے میں رہوں اگرچہ تقلیدی جمود کا قائل نہیں ہوں لہذا سلف کی فقہی آراء میں سے جسے کتاب وسنت کے زیادہ موافق اور لوگوں کی مصالح کے لیے زیادہ مفید پاتا ہوں تو اسے ترجیح دے دیتا ہوں، چاہے وہ معروف رائے نہ بھی ہو۔ اسی حوالے سے میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے متاثر ہوں لیکن چونکہ مسلم معاشروں میں معروف فقہی آراء شریعت کا درجہ اختیار کر جاتی ہیں لہذا عوام اور خواص ان کی پابندی کرنے بلکہ کروانے کے بارے بھی زیادہ حساس ہوتے ہیں تو اس لیے عرض کر دیا کہ دو معروف علماء سے رائے لے لیں۔

اور مجھے ان آراء کے حوالے سے یہ بھی نہیں کہنا کہ مجھے کوئی ڈر اور خوف ہے کہ ان

پر عمل کی صورت میں میرا کوئی آخرت میں مواخذہ ہو گا بلکہ مجھے تو اپنے رب سے قوی امید ہے کہ اللہ عزوجل اس کام پر آخرت میں کوئی خاص اجر عطا فرمائیں کہ جب تقلیدی جمود کی وجہ سے لوگوں کے لیے شریعت پر عمل ایک چیلنج بنتا جا رہا تھا تو روایت سے تمسک اختیار کرتے ہوئے شریعت کی سہولتوں اور رخصتوں کا تعارف کروایا گیا۔

البتہ دینی طبقات سے رواداری کے تعلق کا تقاضا یہی ہے کہ ان کے فالوورز کے بارے یہ امید بھی نہ لگائی جائے کہ ہمارے فالوور بن جائیں۔ اس لیے یہ فقہی آراء ایک علمی رائے کے طور پیش کی گئی ہیں تاکہ دینی طبقہ خاص طور معتدل علماء ان آراء پر کھلے دل ودماغ سے غور کریں اور ان پر بحث کے دروازے کھولیں۔ اور عوام میں سے جن کو راقم کی تحقیق پر اعتماد ہو تو وہ ان پر عمل بھی کر سکتے ہیں لیکن بہتر یہی ہے کہ دو معتمد علماء سے بھی رائے لے لیں اور پھر کوئی فیصلہ کریں۔

میرا اصل تعارف مفتی ہونا نہیں ہے بلکہ میں ایک مفکر اور محقق ہوں۔ دین کے ہر شعبے میں ایک مکمل سوچ رکھتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ طلباء میں فکری صلاحیتیں پروان چڑھیں۔ اس کتاب کا اصل مقصد بھی طلباء کی فکری صلاحیتوں میں نکھار پیدا کرنا ہے۔ اور فکر و نظر کے ساتھ تحقیق کی جستجو بیدار کرنا اور تحقیقی اسالیب اور مناہج کا تعارف بھی زیر بحث رہا ہے۔

جزاکم اللہ خیرا

ابو الحسن علوی

باب ہفتم

مذہب اور ریاست

اس باب میں مذہب اور ریاست کے بارے بنیادی سوالات پر بحث کی گئی ہے۔

دین اور سیاست

بھائی، مجھے یہ مشورہ دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں تمہیں دین سکھاؤں اور سیاست پر تبصرہ سے دور رہوں۔ میں نے سیاسیات میں کم از کم ماسٹرز کیا ہے اور تم نے شاید ہی کوئی سیاست کی کتاب زندگی میں دیکھی ہو۔ اور میں شاید ہی کسی رات عالمی خبریں؛ ایشیاپیسیفک سے لے کر لاطینی امریکہ تک، پڑھے بغیر سویا ہوں اور تم نے شاید ہی کسی دن عالمی خبریں دیکھی ہوں۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جس معاشرے کا میں حصہ ہوں، وہاں اکثریت "سیاسی نابالغوں" ہی کی ہے۔

مذہب اور ریاست

تاریخی تناظر میں:

معلوم تاریخ میں جس قدیم ترین تہذیب اور شہری ریاست کا ہمیں علم ہے، اس کے قائم کرنے والے سمیری تھے۔ 5500-4000 قبل مسیح دجلہ اور فرات مابین جنم لینے والی سمیری تہذیب میں مذہب اور ریاست کا گہرا تعلق موجود ہے اور یہ تعلق آئندہ آنے والی جمیع تہذیبوں کی پیدا کردہ شہری ریاستوں میں موجود رہا ہے یہاں تک کہ یونانیوں نے آکر پہلی مرتبہ 500-300 قبل مسیح میں مذہب کو ریاست سے جدا کیا۔

اور تاریخ ایک واقعہ ہے جو اپنے معروف ذرائع سے قابل تصدیق (verifiable) ہے۔ پس تاریخی پس منظر بذات خود تو کوئی دلیل نہیں ہے لیکن فریق مخالف کی حیرت کو کم کرنے کا باعث ضرور ہے۔ دوسرا یہ کہ تاریخ انسانی میں مذہب اور ریاست کے تعلق کا مطالعہ یہ اشارہ کرتا ہے کہ مذہب، انسان کے فطری اجتماعی شعور کا ایک لازمی تقاضا رہا ہے۔ کچھ لوگوں کو اس بات کو سمجھنے کے لیے ذہن پر تھوڑا دباؤ ڈالنا پڑے گا۔

عمرانی تناظر میں:

سوسائٹی کے اصول ومبادی میں سے ایک اہم اصول مذہب ہے۔ سماجی ربط اور ہم آہنگ سازی (social relationship and integration) کے بغیر تو

سوسائٹی کی کوئی تعریف مکمل نہیں ہے۔ ورنہ تو ایک ہجوم ہے، جیسے کسی سیاسی جماعت کے جلسے میں ہوتا ہے۔ سماجی ربط اور ہم آہنگ سازی میں مذہب سے بڑھ کر کوئی فیکٹر نہ موجود ہے، نہ مفید ہے۔ اور سوسائٹی کے بغیر ریاست کا تصور ممکن نہیں ہے جس طرح خاندان کے بغیر سوسائٹی کا تصور نہیں ہے۔ فرد، خاندان، معاشرہ اور ریاست ایک سوشل آڈر ہے۔

قانونی تناظر میں:

کسی آئیڈیالوجی پر ایمان کے بغیر ریاستی قانون پر صحیح معنوں میں عمل درآمد ممکن ہی نہیں ہے۔ قانون کے احترام اور اس پر عمل درآمد اسی صورت ممکن ہے جبکہ قانون ریاست کی طرف سے کسی نظریاتی بنیاد پر نافذ کیا گیا ہو اور شہریوں کی طرف سے نظریے کی بنیاد پر قبول کیا گیا ہو۔ قانون بغیر آئیڈیالوجی کے نہ تو نافذ ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس پر عمل درآمد ہو سکتا ہے۔ اور اسی آئیڈیالوجی کا نام مذہب ہے۔

نفسیاتی تناظر میں:

انسانوں کے اجتماعی شعور (collective conciousness) کی انفعالی قوت (passivity) کی تسکین کا مذہب کے علاوہ کوئی ایسا خارجی مصدر موجود نہیں ہے کہ جو خود شعور کے لیے بھی قابل اطمینان ہو۔

عقلی تناظر میں:

اجزاء کا وہ باہمی تعلق جو ان کے ایک کل بننے اور کہلوانے میں بنیادی عنصر کی اہمیت رکھتا ہے کہ آپ کل سے اس کو خارج کر کے کل کا اثبات کسی طور نہیں کر سکتے۔ اجزاء یہاں شہری ہیں اور کل ریاست ہے۔ لہذا شہریوں کا مذہب ہو گا لیکن ریاست کا نہیں، چہ معنی دارد؟

جمالیاتی تناظر میں:

ایک ریاست کو مثالی ریاست بننے کے لیے جس مثالی تصور عدل اور خیر کی ضرورت ہے، وہ انسان کے اندر سے نہیں، اس کے خارج ہی سے فراہم ہو سکتا ہے۔

مذہبی تناظر میں:

ہم مخلوق ہیں اور اللہ تعالی خالق ہیں۔ خالق نے مخلوق کی دنیاوی مصالح اور اخروی فلاح کے لیے دین اسلام کی صورت میں ایک ضابطہ حیات فراہم کیا ہے۔ دنیاوی مصالح کا فیض مسلمان اور کافر دونوں کے لیے عام ہے جبکہ اخروی فوز وفلاح صرف اہل ایمان کے لیے ہے۔ آسمانی ضابطہ حیات میں انسان کی جن مصالح کا دھیان رکھا گیا ہے وہ اس کے دین، جان، عقل، مال اور عزت سے متعلق ہیں۔ خالق اپنی جمیع مخلوق کی ان مصالح کو اس آخری ضابطہ حیات کی تنفیذ سے پورا کرتے ہیں۔ یہ ضابطہ حیات ایک ایسا نظام عدل ہے جو مخلوق کے مخلوق پر سے مذہبی، جانی، عقلی، مالی اور نفسیاتی ظلم کو ختم کرتا ہے۔ خالق محض تھیورائزر نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اپنی مخلوق کی جمیع تقاضوں کو پورا کرنے کا ذمہ دار ہے لہذا وہ تھیورائزر کے ساتھ قاضی بھی ہو گا اور اپنی مخلوق میں اس کا رول انفعالی نہیں فاعلی یعنی ایکٹو ہو گا۔ پس ایک تھیوری ہے اور دوسرا اس تھیوری کا نفاذ ہے۔ ہر تھیورائزر کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی تھیوری نافذ ہو۔ تھیوری کو شریعہ کا نام دیا گیا اور اس کے مخلوق انسانی میں جاری اور ساری کرنے کے طریق کار کو منہاج کہا گیا۔ تھیوری کی غایت دنیاوی مصالح اور اخروی فلاح ہے جبکہ منہاج کی غایت اس غایت اولی کی اعلی درجے میں تکمیل ہے۔

اور مخاطبین کی دو قسمیں ہیں؛ مسلمان اور کفار۔ مسلمان کے لیے دلیل "علم الوحی" ہے۔ عقل کا کردار اس میں اضافہ یا تنسیخ یا تخریب کا نہیں بلکہ اس پر ایمان لانے اور وحی ہی کے متعین کردہ اصول وضوابط کی روشنی میں اس کی تشریح اور وضاحت کا ہے۔ پہلا کام عوام کا اور دوسرا علماء کا ہے۔ مخاطبین کی دوسری قسم کے لیے دلیل دو قسم کی ہے؛ اخلاق اور طاقت۔ اگر مسلم معاشرہ یا حکومت یا ریاست کمزور ہے تو دلیل اخلاق کی قوت میں ہے اور اگر مسلم معاشرہ یا حکومت یا ریاست طاقتور ہے تو دلیل تلوار کی طاقت ہے۔

عقل کا میدان اخلاق میں عالی پن پیدا کرنا ہے یا طاقت میں بالادستی نہ کہ دلیل کا کوئی نیا نظام کھڑا کرنا۔ یہ آخری صورت نہ تو صحابہ اور سلف صالحین کا منہج ہے اور نہ ہی

مفید۔ صحابہ اور سلف صالحین یا تو مجسمہ اخلاق تھے یا شہسوار میدان، ان میں کوئی بھی فلسفی اور متکلم نہیں تھا۔ اگر فلسفیانہ کاوشیں حقیقت تک پہنچا پاتیں تو فلاسفہ کی ایک جماعت ضرور اسلام تک پہنچتی۔ اس لیے تاریخ اسلام نے یہ سوال تو ضرور پیدا کیا ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے یا اخلاق سے، صوفیاء کا اس کے پھیلنے میں اہم کردار رہا ہے یا مجاہدین کا، لیکن یہ بحث کسی نے نہیں اٹھائی کہ متکلمین اسلام نے اتنے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا۔

انسان اور مسلمان

ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر زاہد صدیق مغل صاحب اپنی فیس بک کی ایک تحریر میں فرماتے ہیں:

"ان کا کہنا ہے کہ جدید ریاست مذہب سے ماوراء رہ کر اپنے تمام شہریوں کے حقوق کا تعین کرتی ہے لیکن آپ ایسا کہنے والوں سے پوچھئے گا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ مذہب سے ماوراء رہ کر یہ جو حقوق ڈیفائن کرتی ہے، ان حقوق کا ماخذ کیا ہے؟ ان میں سے پچاس فیصد سے زائد کو تو اس سوال کی ہوا بھی نہیں لگی ہوتی، یہ بس ایک عام سی چلتی ہوئی بات کرتے ہیں، یہ سوال سن کر سٹ پٹا کر کچھ ادھر ادھر کی کہنے لگیں گے۔ پھر جو اس سوال کا جواب واقعی جانتے ہیں، ان کی اکثریت بھی اس کا جواب دینے سے جان بوجھ کر احتراز کرتی ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس سوال کا اصل جواب دینے سے غلط فہمیوں سے بنے گئے اس جال کے تار ٹوٹ جاتے ہیں جس کے ذریعے یہ عوام الناس کا شکار کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے بہت تھوڑے ہی یہ جاننے اور کہنے کی جرات رکھتے ہیں کہ جی، ان حقوق کا ماخذ تنویری فکر سے ماخوذ ہیومن رائٹس فریم ورک ہے۔ تو گویا اب ان کی پوزیشن یہ ہوئی کہ جدید ریاست لبرل ہیومن رائٹس کے تناظر میں اپنے شہریوں کے حقوق کا تعین کرتی ہے۔ اور یہ مذہب سے ماوراء وغیرہ جیسے الفاظ محض اپنی پوزیشن کو خوشنما دکھانے کے لئے بولے جاتے ہیں۔ تو ہم ان سے کہتے ہیں کہ جس طرح آپ یہ کہتے ہو کہ ریاست کو چاہیے کہ وہ شہریوں کے

حقوق ہیومن رائٹس سے اخذ کرے بعینہ ہمارا یہ مقدمہ ہے کہ ریاست کو اپنے تمام شہریوں کے حقوق کا تعین قرآن و سنت کی روشنی میں کرنا چاہیئے۔ بتایئے اس میں سوائے ترجیحات کے کیا منطقی مسئلہ ہے؟ آخر ایک بندہ مؤمن قرآن و سنت کو پیچھے کر کے تنویری فکر سے ماخوذ ہیومن رائٹس کو کیوں کر مقدم کرلے؟"

اسی طرح مزید ایک مقام پر ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"یہ آپ سے کہیں گے کہ پہلے ہیومن (انسان) بنو بعد میں مسلمان۔ یہ سیکولرز کی عوام الناس کو پھانسنے کی ایک دیرینہ خوشنما دلیل ہے۔ آپ ان سے پوچھیے کہ اچھا بتاؤ مسلمان ہونے سے قبل انسان ہونے کا کیا مطلب ہے؟ دیکھیے مسلمان ہونے کا مطلب یہی ہے نا کہ میں اصلاً و حقیقتاً خدا کا بندہ ہوں۔ بتایئے کیا میری اس حقیقت سے ماوراء اور ماقبل بھی میری کوئی ایسی حقیقت ہے جس کا آپ مجھ سے اقرار کروانا چاہتے ہیں؟ دراصل یہ بات کہنے والوں کی اکثریت کو اس بات کا مطلب ہی معلوم نہیں ہوتا۔ میں کون ہوں؟، فی زمانہ اس کے دو غالب جواب ہیں؛ ایک یہ کہ میں خدا کا بندہ (مسلمان) ہوں، دوسرا یہ کہ میں آزاد و قائم بالذات ہوں۔ مسلمان ہونے سے قبل انسان ہونے کی دعوت کا اصل مطلب اسی بات کا اقرار کروانا ہے کہ میں اصلاً آزاد ہوں۔ پھر یہ جو خود کو مسلمان وغیرہ سمجھا جاتا ہے تو یہ اس آزاد ہستی کے اپنے ارادے کے تحت اختیار کردہ اپنی ذات کے بارے میں کچھ تصورات ہیں جو اصل حقیقت نہیں۔ اصل حقیقت میرا وہ ارادہ ہے جو حقیقت تخلیق کرتا ہے۔ خوشنما باتیں کر کے لوگوں کو کیوں گمراہ کرتے ہو؟ اپنا سچ کھل کر بتاؤ۔"

جناب مزید ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"اب یہ جو مسلمانیت کے بجائے انسانیت کا حوالہ دیتے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ان کی اصل بات، جس کا خود ان میں سے بہت سوں کو بھی ادراک نہیں، آپ کے سامنے رکھ دی جائے۔ میں اپنے انسان ہونے کے

بارے میں مختلف بنیادی حوالے رکھ سکتا ہوں، مثلاً ایک یہ کہ میں اصلاً سب سے پہلے مغل ہوں، یا یہ کہ میں اصلاً پنجابی ہوں، یا یہ کہ میں اصلاً پاکستانی ہوں، یا یہ کہ میں اصلاً مزدور یا سرمایہ دار طبقے کا نمائندہ ہوں، یا یہ کہ میں اصلاً مسلمان، ہندو یا عیسائی ہوں۔ اپنی ذات کے ادراک کے لئے میں جو بھی حوالہ اختیار کرتا ہوں، اسی کی بقا و غلبے کے لئے جدوجہد کرنے کا اخلاقی جواز رکھتا ہوں۔ اب یہ آپ سے کہیں گے کہ تم اصلاً یہ سب نہیں ہو، بلکہ یہ سب تو تمہاری اصل کا اظہار ہیں۔ اب آپ ان سے پوچھئے کہ بتاؤ پھر اصل میں میں کیا ہوں؟ تو یہ آپ سے کہیں گے کہ اصل میں تم ایک آزاد و خود مختار (قائم بالذات) ہستی ہو جسے یہ حق ہے کہ وہ اپنے ارادے سے خیر کو متعین کرے۔ پس مسلمان ہونا یہ اصل نہیں بلکہ صرف اپنے ارادے کے تحت ایک خیر کو ڈیفائن کر لینا ہے۔ یہ واحد خیر نہیں بلکہ خیر کے لاتعداد تصورات میں سے بس ایک ہے۔ یعنی خدا کا حوالہ چھوڑ دو، زمین پر اپنے ارادے سے بنائے ہوئے خیر کے حوالوں کو اپناؤ، اسی کے لئے جدوجہد کرو۔ یہ ہے ان کے نزدیک انسان ہونے کا اصلی معنی، جس کا یہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اقرار کروانا چاہتے ہیں۔ یہ بات اچھی طرح، جی بہت ہی اچھی طرح، سمجھ رکھنی چاہئے کہ انسان ہونا میری اصل نہیں بلکہ خدا کا بندہ ہونے کی ممکنہ صورتوں میں سے بس ایک صورت ہے۔ میرے وجود، یعنی ہونے کی امکانی صورتیں یہ تھیں کہ میں درخت ہوتا، جانور ہوتا، پہاڑ ہوتا، پتھر ہوتا یا پھر فرشتہ و جن ہوتا، مگر میں کچھ بھی ہوتا اپنے وجود کی ہر امکانی صورت میں خدا کا بندہ (مخلوق) ہی ہوتا۔ اس کائنات میں میرے وجود کا ایسا کوئی امکان نہیں جہاں میں اصلاً خدا کے بندے کے ماسواء کچھ اور بھی ہوتا۔ انسان ہونا میری اصل نہیں بلکہ میرے لئے ایک حادثہ ہے، ان معنی میں کہ خدا نے جس حال میں چاہا مجھے پیدا کیا اور وہ مجھے انسان بنانے پر مجبور نہ تھا، یہ محض اس کا فضل ہے۔ پس یہ سوال کہ اصلاً مسلمان ہو یا انسان، تو اس کا بالکل واضح جواب یہ ہے کہ اصلاً اور حقیقتاً میں خدا کا

بندہ (مسلمان) ہوں، انسان حادثاتی طور پر ہوں۔ میں لازماً being with God ہوں، نہ کہ اس سے ماوراء کوئی ہستی۔ اپنے انسان ہونے کو ڈیفائن کرنے کا اس کے علاوہ میرے پاس کوئی دوسرا حوالہ نہیں، سوائے اس کے کہ میں خود مختاریت کا دعوی کروں۔ میں کون ہوں؟، اس سوال کا جواب میں جو نہی خدا کے حوالے کے بغیر دینے کی کوشش کرتا ہوں، میں لازماً خود کو خدا سے ماوراء وما قبل وجود (being without God) فرض کرلیتا ہوں، اور یہی الحاد کی بنیاد ہے۔ خدا کا وجود میرے شعور انسانیت سے ما قبل ہے، لا الہ الا اللہ اسی بات کا اقرار ہے۔ مسلمان بننے سے قبل انسان بنو، اسی کلمے کا انکار ہے۔"

کیا اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے؟

لبرل کا سوال ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، یہ کس آیت یا حدیث کا ترجمہ ہے؟ جواب: یہ کس آیت اور حدیث کا ترجمہ ہے کہ اسلام ایک نامکمل ضابطہ حیات ہے کہ جسے انسانوں نے مکمل کرنا ہے؟ اسلام اگر مکمل ضابطہ حیات نہیں ہے تو کیا نامکمل ضابطہ حیات ہے، یہ کہنا چاہتے ہو؟ یہ تو تمہارے اسٹائل میں جواب ہوا۔

اصل بات یہ ہے کہ اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ اسلام مکمل ضابطہ حیات نہیں ہے تو اب اس کو مکمل کون کرے گا؟ آپ! اور مکمل کرنا اس لیے ضروری ہے کہ زندگی گزارنے کے لیے تو مکمل ضابطہ چاہیے نہ کہ نامکمل یا ناقص۔ نامکمل ضابطے سے تو نامکمل معاشرے پیدا ہوں گے، پس ایک اچھے معاشرے کی تشکیل کے لیے ایک مکمل ضابطہ حیات کا ہونا ضروری ہے۔ اور اب وہ اسلام تو ہے نہیں تو پھر کہاں سے آئے گا؟ یا تو اسلام کے ضابطے کو مکمل کرو گے یا اس کے مقابلے میں کوئی نیا ضابطہ بنا کر لاؤ گے۔

دوسری صورت کی تو تمہارے اندر نہ تو جرات ہے اور نہ ہی صلاحیت کہ اسلام کے مقابلے میں کوئی ضابطہ حیات بنا لاؤ۔ تو رہی پہلی بات تو اس میں اسلام تو رہا ناقص، تو اس کے نقص کی تکمیل جناب لبرل صاحب فرمائیں گے۔ پس دین اسلام جو اللہ نے دیا، وہ تو ناقص تھا، اور جو لبرل کے اجتہاد کی چھلنی سے تیار ہو گا، وہ مکمل ہو جائے گا۔ یہ دین اسلام

میں اپنا حصہ چاہتے ہیں جیسے اسلام نہ ہوا، سرکار کے کسی ادارے کا ٹینڈر رہوا۔

یہ لوگ دراصل اللہ کے ساتھ اس کے حقوق میں شراکت چاہتے ہیں، یہ خالق کا حق ہے کہ وہ مخلوق کو پابند کرے، تم کون ہوتے ہو کہ اسلام کو ناقص کہہ کر اب اس کی تکمیل کے نام پر لوگوں کی آزادیاں ان سے چھیننے لگ جاؤ، وہ آزادیاں جو ان کے خالق نے انہیں دی ہیں۔ اب ان بیچاروں کو معلوم ہی کیا کہ ان کے خالق نے انہیں کیا آزادیاں دے رکھی ہیں کہ جنہیں معاصر وضعی قوانین (man made laws) نے ان سے چھین رکھا ہے۔ یہ خالق کی پابندی سے بھاگے ہیں اور اب انسانی قوانین کی بیڑیوں میں آزادی کے سانس گن رہے ہیں۔

رہی یہ بات کہ اسلام میں یہ کہاں ہے کہ وہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے تو یہ اسلام میں بہت جگہ موجود ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ﴿مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ﴾ [الأنعام: 38] ترجمہ: ہم نے اس کتاب میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے۔ اسی طرح ایک جگہ ارشاد ہے کہ ﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ﴾ [النساء: 59] ترجمہ: جس چیز میں بھی تمہارا اختلاف ہو جائے تو اس اختلاف کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو یعنی کتاب و سنت سے اس کا حل لے لو۔ اور عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ جب نفی کے سیاق میں نکرہ ہو تو وہ اپنے عموم میں نص بن جاتا ہے جیسا کہ یہاں ہے۔

اور ضابطہ کا مطلب صرف قانون نہیں ہے، ضابطہ میں قانون بھی داخل ہے اور ہدایت بھی، ایک طرف ضابطہ فوجداری (criminal law) ہے تو دوسری طرف ضابطہ اخلاق (code of conduct) بھی ہے۔ اس لیے ضابطہ کا لفظ قانون سے بہت وسیع معانی رکھتا ہے۔ جس دین کی یہ شان ہو کہ اس میں بیت الخلاء جانے اور نکلنے کا طریقہ بھی سکھلایا گیا ہو، اس کے بارے ان کا دعوی ہے کہ یہ مکمل ضابطہ حیات نہیں ہے، کمال ہے! اب یہ اسلام کو نامکمل ضابطہ قرار دے کر اس کی تکمیل فرمائیں گے، یہ منہ اور مسور کی دال!

کیا اسلامی ریاست کی اصطلاح استعمال کرنا غلط ہے ؟

دوست نے سوال کیا ہے کہ کیا اسلامی ریاست کی اصطلاح استعمال کرنا غلط ہے ؟ عرض یہ ہے کہ بالکل کی جاسکتی ہے اور کرنی چاہیے۔ یہ اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے، اس لیے کہا کہ زبان وبیان کے قواعد واسالیب کی روشنی میں اس اصطلاح کا استعمال بالکل درست ہے۔ اور یہ اصطلاح استعمال کرنی چاہیے، اس لیے کہا کہ عرفی معانی ومفاہیم کی ادائیگی میں اس کی اہمیت مسلم ہو چکی ہے۔

الجھن اصل میں یہاں سے پیدا ہوئی کہ انگریزی لفظ state کا اردو میں ترجمہ عربی لفظ ریاست سے کر دیا گیا۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ایک انگریزی لفظ کے مفہوم کی ادائیگی کے لیے عربی زبان سے لفظ کیوں لیا گیا کہ اردو تو ہے ہی کرائے کی زبان، عربی سے نہ لیا تو فارسی سے لے لیں گے۔ ایشو اصل میں یہاں سے پیدا ہوا کہ عربی اور فارسی دونوں زبانوں نے انگریزی لفظ state کا ترجمہ "دولة" سے کیا اور اردو والوں نے ایک ایسے عربی لفظ سے کر دیا جو کہ عربی زبان میں سیاست شرعیہ کے میدان میں عرفی اصطلاح بن چکا تھا۔

عربی زبان میں ریاست کے لفظ کا استعمال احادیث اور آثار میں بھی ملتا ہے اور بعد ازاں جب علوم مدون ہونا شروع ہوئے تو سیاست شرعیہ پر لکھی جانے والی کتب میں اس لفظ کا استعمال کثرت سے ہوا یہاں تک کہ یہ لفظ ایک خاص معنی میں عرف بن گیا مثلاً شرف، بزرگی، مقام وغیرہ جیسا کہ رئیس کا لفظ بھی اسی سے نکلا ہے۔ اور عربی زبان کا بہت معروف محاورہ جو کہ عام طور فقہاء اور علماء کے ہاں مستعمل ہوا، وہ یہ ہے: "انتهت إليه الرياسة" کہ اس علم اور فن میں شرف اور بزرگی ان پر ختم ہو گئی۔ محمد بن علی القلعی متوفی 630ھ غالباً وہ پہلے شخص ہیں کہ جنہوں نے اپنی کتاب کا نام "تهذيب الرياسة وترتيب السياسة" رکھا کہ اس لفظ کو امراء اور حکمرانوں کے اعمال وافعال کی تہذیب کے لیے استعمال کیا۔

پس ریاست کا لفظ اگر آپ اس معنی میں استعمال کر رہے ہیں کہ جس معنی میں یہ

سیاست شرعیہ میں استعمال ہوا ہے تو اس معنی میں اسلامی ریاست کا مفہوم اسلامی امارت ہے اور اس لحاظ سے یہ بالکل درست معنی ہے۔ اور اگر آپ ریاست سے مراد ریاست کا جدید تصور لے رہے ہیں تو پھر بھی اسلامی ریاست کی مصطلح استعمال کرنا درست ہے کہ اس سے مراد اسلامی نظام ریاست ہوتی ہے۔ لیکن اس میں اتنا واضح رہے کہ اسلامی نظام ریاست میں جغرافیے کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ اسلامی نظام ریاست آبادی، حکومت اور اقتدار اعلی سے مل کر وجود میں آتا ہے۔ پس مکہ المکرمہ میں بھی اسلامی نظام ریاست موجود تھا کہ جسے اسلامی نظام امارت کا نام بھی دے سکتے ہیں، چاہے اس کی حدود یا باؤنڈریز نہ بھی تھیں بلکہ متعین حدود تو مدینہ کی ریاست کی بھی نہ تھیں۔

نظام امارت میں ایک امیر ہے، دوسرا مامور ہے اور تیسرا امر ہے۔ اور جدید تصور ریاست کی روشنی میں امیر حکومت ہے، مامور آبادی ہے اور تیسرا امر الہی ہے یعنی اقتدار اعلی ہے۔ پس ان تین چیزوں کے ملنے سے جو نظام وجود میں آتا ہے، اسے نظام امارت یا نظام ریاست کہتے ہیں۔ اور ریاست کے اسلامی ہونے کا معنی یہ ہے کہ امیر، مامورین میں امر الہی کو جاری وساری کرنے کے لیے خلافت یعنی نیابت کا کردار ادا کرے۔

علم اور طاقت

ایک بزرگ دیوبندی عالم دین نے کسی نوجوان اہل حدیث عالم دین کے بارے تبصرہ کیا کہ بندہ بہت قابل ہے لیکن چڑھ اہل حدیثوں کے ہاتھ گیا ہے، اگر یہ دیوبندی ہوتا تو کہاں سے کہاں پہنچ جاتا۔

ان دیوبندی عالم دین کی یہ بات اصولی طور صد فی صد درست ہے۔ آپ کی قابلیت، صلاحیت، دانشوری، فکر وفلسفہ سب خاک میں مل جائے گا، اگر آپ کو انہیں پھیلانے کے لیے کچھ قوتیں میسر نہ ہو سکیں۔ اس لیے تو ہم نے بہت پہلے لکھ دیا تھا کہ مستقبل قریب میں اسلام کے نام پر دو ہی بیانیے باقی رہ جائیں گے؛ ایک سلفی اور دوسرا اثنا عشری کہ ان دونوں کے پیچھے ریاست کی طاقت ہے۔

دنیا میں وہی فقہیں رائج ہوئیں کہ جنہیں حکومتوں کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ ابن

ابی لیلی، لیث بن سعد اور داود ظاہری وغیرہ کی فقہیں کتابوں میں رہ گئیں لیکن ائمہ اربعہ اور ابن حزم رحمہ اللہ کی فقہ ریاستی لاء بننے کی وجہ سے آج تک عملاً معاشرے میں ہمیں نظر آتی ہیں۔ تو اپنے افکار کا رواج چاہتے ہو تو رستہ یہی ہے کہ اپنے علم کو طاقت کا ستون میسر کر دو، پھر اگر سطحی بھی ہو گا تو عام ہو جائے گا۔ ہم مسلکی، جماعتی اور تحریکی تعصب سے نہیں نکل سکتے۔ ہم مذہبی لوگ کیا سائنسدان تک ابھی تک اس بات سے نہیں نکل سکے کہ یہ روسی سائنسدان ہے اور یہ امریکی۔

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ نے اسی عصبیت کو اپنے فکر وفلسفہ کی بنیاد بنایا ہے۔ اس زمانے میں عصبیت قبائلی ہوتی تھی، آج قبائلی نظام ختم ہو چکا، اب جماعتی موجود ہے لہذا جماعتی عصبیت کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ آپ اگر ادیب ہیں اور کمیونسٹ رجحان رکھتے ہیں، تو دنیا بھر کے کمیونسٹ آپ کو پبلش کریں گے گویا کمیونسٹ طبقہ آپ کے افکار کے پھیلنے کے لیے ایک ذریعہ اور واسطہ بن جائے گا۔ یہی صورت حال سرمایہ داروں کی بھی ہے اور مذہبی لوگوں کی بھی۔ بلکہ ایک ہی مذہب میں موجود مسالک اور جماعتوں میں بھی عصبیت موجود ہے۔ اہل حدیث کی جماعت کسی دیوبندی عالم دین کی فکر کی ترویج کا ذریعہ نہیں بنے گی، چاہے وہ مسلکی فکر نہ بھی ہو اور دیوبندی مسلک کسی اہل حدیث عالم کی فکر کو پبلش نہیں کرے گا، چاہے وہ عالم اسلام سے متعلق ہو، الا ماشاء اللہ۔

علم اور طاقت کا ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ مغرب نے اپنے فکر وفلسفہ کو اپنی سیاسی اور عسکری طاقت کے بل بوتے پر پھیلایا ہے اور یہ بات اظہر من الشمس ہے۔ "دلیل کی قوت" کیا ہوتی ہے؟ یہ ایک بے کار کی ترکیب اضافی ہے، قوت تو قوت ہے، سیاسی ہو یا عسکری۔ جتنی بڑی طاقت سے، چاہے مسلکی ہو، جماعتی ہو، تحریکی ہو، لسانی ہو، قومی ہو، ریاستی ہو، مذہبی ہو، یا سیاسی ہو، آپ وابستہ ہو جائیں گے، اتنی ہی آپ کی دلیل بھی قوی ہو جائے گی، یہ دنیا اسی اصول پر چل رہی ہے۔ اس کو ایک سادہ سی مثال سے سمجھ لیں کہ جو علماء کسی مسلک، جماعت یا تحریک کی خوب نمائندگی کرتے ہیں، وہ مسلک، جماعت اور تحریک انہیں خوب پبلش کرتی ہے، بھلے ان کا فکر وفلسفہ ردی ہی

کیوں نہ ہو۔اور جو علماء کسی کے نمائندہ بن کر نہیں لکھتے تو انہیں اپنا پبلشر خود بننا پڑتا ہے، بھلے سقراط جیسی دانشوری رکھتے ہوں۔

اگر تو یہ چاہتے ہو کہ دنیا میں تمہارا نام اور کام باقی رہے تو اس کا طریقہ یہی ہے کہ طاقت کے منابع (power sources) پر قبضہ کرو، یا انہیں تخلیق کرو، یا ان سے گہرا رابطہ پیدا کرو، ورنہ تاریخ کے صفحات میں گم ہو جاؤ گے۔ اور یہ بات یہاں تمام مسالک، مذہبی جماعتوں اور اسلامی تحریکوں کے نمائندوں کو سمجھ آ چکی ہے۔ اور ان سب کی فکر "اپنی فکر" نہیں ہے بلکہ "اللہ کی فکر" ہے، یہ بھی واضح ہے۔ اور اگر آخرت کی شہرت چاہیے تو اس سب کچھ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو۔

اور اگر دنیا اور آخرت دونوں کی شہرت اور ناموری چاہیے تو پہلی کے لیے دعا کر لیا کرو کہ اے پروردگار! میری فکر اگر صالح ہے تو اسے طاقت کے سرچشموں اور قوت کے ستونوں سے سیراب فرما دے اور دوسری پر عمل یعنی خود کا عمل یہی ہو کہ طاقت کے سرچشموں اور قوت کے ستونوں کے حصول بلکہ قرب سے بھی بچتا رہے کہ سو میں سے ننانوے کا ایمان ان کے حاصل ہو جانے یا ان کے قریب آ جانے سے داؤ پر لگ جاتا ہے۔ اور وہ ایک فی صد جو محفوظ رہتے ہیں وہ رات کے راہب اور دن کے شہسوار ہوتے ہیں۔ اور المیہ یہ بھی ہے کہ اس میدان میں کودنے والوں کی اکثریت بلکہ سب کے سب اپنے آپ کو اسی ایک فی صد میں شمار کر رہے ہیں۔

داعش پر امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے فکری اثرات

کچھ دوستوں نے توجہ دلائی کہ قاری حنیف ڈار صاحب کا یہ دعوی ہے کہ داعش وغیرہ جیسی دہشت گرد جماعتوں پر امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے گہرے فکری اثرات ہیں۔ قاری صاحب کا کہنا ہے کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ بھی اپنی فکر میں خوارجی (extremist) تھے اور یہ جماعتیں بھی خوارجی فکر کی حامل ہیں۔

میرے پاس ایک نوجوان آیا، کوئی سترہ سال اس کی عمر ہو گی، آتے ہی کہنے لگا کہ میں جہاد کرنا چاہتا ہوں، مجھے بتائیں کیسے کروں؟ اور اس کا جذبہ ایسا تھا کہ جیسے اب گھر

جانے کی بجائے میدان جہاد میں ہی جائے گا۔ میں اس وقت قاری حنیف ڈار صاحب کے لیول کا مفکر تھا، فوراً ہی اس کا ذہن پڑھ لیا کہ یہ کہیں سے طالبان کا لٹریچر پڑھ کر آیا ہے۔ میں نے کہا: بھئی، کن چکروں میں پڑ گئے ہو، یہ ٹی ٹی پی کے لوگ غلط ہیں۔ وہ نوجوان سنجیدگی سے پوچھنے لگا کہ یہ ٹی ٹی پی کون ہے؟ میں نے کہا: طالبان، اس نے پوچھا: طالبان کون ہیں؟

میں نے سوچا کہ یہ کسی کشمیری جہادی تحریک کے لٹریچر سے متاثر ہوا ہے لہذا جہادی تحریکوں کے نام لینا شروع کر دیے۔ لیکن حیران کن بات تھی کہ وہ نوجوان کسی جہادی تحریک سے واقف نہ تھا۔ میں نے تنگ آ کر کہا: بھئی، کہاں سے جہاد کے لیے اتنے موٹیویٹ ہو گئے ہو؟ نوجوان نے کہا کہ میرے گھر میں حدیث کی ایک کتاب تھی، جس میں جہاد کے فضائل پر حدیثیں تھیں، میں نے وہ پڑھی ہیں اور آپ کے پاس آ گیا ہوں، میں اللہ کے رستے میں شہید ہونا چاہتا ہوں لیکن مجھے کچھ پتہ نہیں ہے کہ میں نے کیسے شہید ہونا ہے؟

اسی طرح ایک اور نوجوان بہت ہی جذبہ تھا اس میں، میں نے پوچھا کہ اتنا جہادی جذبہ کہاں سے ملا آپ کو؟ کہنے لگا کہ نسیم حجازی کے ناولوں سے۔ میں شک میں ہی رہا کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ لیکن جس نے نسیم حجازی کے ناول پڑھے ہو تو اسے معلوم ہے کہ یہ ممکن ہے۔ اسی طرح ہمارے ایک جاننے والے کو پولیس والے اٹھا کر لے گئے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کو کیوں لے گئے تھے؟ انہوں نے بتلایا کہ میں "دار السلام" کی کتابیں بیچتا ہوں۔ میں نے کہا: "دار السلام" کی کتابوں میں ایسا کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ بعض دہشت گرد پکڑے گئے ہیں، ان کے پاس سے "دار السلام" کی کتابیں برآمد ہوئی ہیں۔ میں نے سوچا کہ دہشت گردوں کے پاس تو قرآن مجید بھی برآمد ہوتا ہے تو یہ لوگ خدا کو کیوں نہیں پکڑتے؟ یہاں ان کی ساری سمجھداری ختم ہو جاتی ہے۔

اب ہم آپ کو نکتے کی بات بتلانا چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص 1949ء میں نسیم حجازی کے لکھے گئے ناول کو پڑھ کر دہشت گرد بن جاتا ہے تو اس میں کمال نسیم حجازی

کا نہیں، دہشت گرد کا ہے۔ یہ بات لسانیات میں معاصر دنیا کا ذہین ترین فرنچ فلسفی کہہ رہا ہے کہ جسے لوگ دریدہ (Derrida) کے نام سے جانتے ہیں کہ جس نے ڈی-کنسٹرکشن کی تھیوری دی جو پوسٹ ماڈرن ازم کی بنیادی بنی۔

اس تھیوری کے مطابق آج کے دور میں مصنف مر چکا ہے۔ تحریر مرتب کرنے کے بعد مصنف کا رشتہ تحریر سے ختم ہو جاتا ہے اور اب قاری اور ریڈر کے اوپر ہے کہ وہ اس تحریر سے کیا نتائج اخذ کرتا ہے۔ اور قاری اور ریڈر اس تحریر سے جو بھی نتائج اخذ کرے گا تو وہ درست ہوں گے۔ ہر تحریر کا ایک بنیادی اسٹرکچر ہوتا ہے، اس اسٹرکچر کی روشنی میں اس تحریر سے جو نکلے، نکال لو، چاہے وہ مصنف کی منشا ہو یا نہ ہو۔ پہلے یہ کام شاعروں کے ساتھ ہوتا تھا کہ ان کے شارحین ان کے کھاتے میں وہ باتیں بھی ڈال دیتے جو ان کی مراد نہ ہوتی تھیں اور اب سب سے زیادہ یہ کام مذہبی لٹریچر کے ساتھ ہو رہا ہے۔

دریدہ کی تھیوری استعمال کی جائے، اور اگر آپ ذہین ہوں تو آپ قاری صاحب کی تحریر سے ابو بکر بغدادی کی فکر نکال سکتے ہیں۔ ان بے وقوفوں کو کیا پتہ کہ لفظ ایک سمندر ہے کہ جس سے جو چاہیں نکال سکتے ہیں، لیکن بندہ ذہین ہونا چاہیے۔ پس آتھر، اتھارٹی ہے، میں زندہ ہوں، مر نہیں گیا۔ میری تحریر سے اگر کوئی ایسا مطلب نکالتا ہے جو کہ میری مراد نہیں تھی، تو میں ہر گز یہ حق نہیں دوں گا۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ بھی زندہ ہیں، اپنے شاگردوں کی صورت میں، ان کی تحریر کا وہ مطلب جو کبار علماء کو سمجھ آیا ہے، ان علماء کو سمجھ آیا جو اپنی سند ابن تیمیہ رحمہ اللہ تک پہچانتے ہیں، وہی ان کی تحریر کا مطلب ہے، نہ کہ وہ جو قاری حنیف ڈار کو سمجھ آیا ہو یا دہشت گرد کو۔

ہمارے استاذ مولانا حافظ عبد الرحمن مدنی صاحب نے اپنے استاذ شیخ محمد بن عطیہ السالم، انہوں نے اپنے استاذ شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ آل باز، انہوں نے اپنے استاذ شیخ عبد الحق ہاشمی، انہوں نے اپنے استاذ شیخ احمد بن عبد اللہ بن سالم بغدادی، انہوں نے اپنے استاذ شیخ عبد الرحمن بن حسن بن محمد بن عبد الوھاب، انہوں نے اپنے استاذ اور دادا شیخ محمد بن

عبد الوھاب، انہوں نے اپنے استاذ شیخ عبد اللہ بن ابراہیم مدنی، انہوں نے اپنے استاذ شیخ عبد القادر التغلبی، انہوں نے اپنے استاذ شیخ المحدث عبد الباقی، انہوں نے اپنے استاذ احمد بن مفلح الوفائی، انہوں نے اپنے استاذ شیخ احمد بن موسی الحجاوی، انہوں نے اپنے استاذ شیخ احمد بن محمد المقدسی، انہوں نے اپنے استاذ شیخ احمد بن عبد اللہ عسکری سے، انہوں نے اپنے استاذ شیخ علاؤالدین مرداوی، انہوں نے اپنے استاذ شیخ ابراہیم بن قندس البعلی، انہوں نے اپنے استاذ شیخ ابن اللحام، انہوں نے اپنے استاذ شیخ ابن رجب الحنبلی، انہوں نے اپنے استاذ شیخ ابن قیم الجوزیہ، اور انہوں نے اپنے استاذ شیخ امام ابن تیمیہ رحمہم اللہ سے علم حاصل کیا۔ ایسی سینکڑوں اسناد کے بعد بھی کوئی بے وقوف یہ کہہ سکتا ہے کہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کو کوئی جانتا ہی نہیں تھا اور انہیں تو داعش نے مشہور کیا ہے۔

دہشت گردوں کے امام کی تلاش میں: شارٹ اسٹوری

گوانتانامو نامی خلیج پر ایک بند کمرے میں اعلی امریکی فوجی افسران کا اجلاس ہو رہا تھا کہ جس کا موضوع وہ عرب قیدی تھے کہ جنہیں شمالی اتحاد نے پکڑ کر امریکہ کے حوالے کیا تھا۔ اجلاس کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ کسی طرح ان جہادیوں کے فکری امام تک رسائی حاصل کی جائے کہ وہ ہے کون کہ جس نے ان میں اتنی انرجی بھر دی ہے کہ یہ روس کے بعد اب امریکہ سے بھی ٹکرا گئے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے امریکہ کے بہترین ماہرین نفسیات کی مدد بھی حاصل کی گئی تھی۔

دنیا کے ان ذہین ترین گدھوں کا خیال یہ تھا کہ اگر ہم نے قیدیوں سے براہ راست ان کے فکری امام کے بارے پوچھ گچھ کی تو وہ لازماً ہمیں کسی اور کا نام بتلا کر غلط رستے پر ڈالنے کی کوشش کریں گے لہذا مشترکہ اجلاس میں طے یہ پایا کہ ہر قیدی کا علیحدہ علیحدہ انٹرویو لیا جائے گا۔ اور انٹرویو پینل میں فوجی افسران کے ساتھ سائیکالوجسٹ بھی موجود ہوں گے جو اس قیدی کے الفاظ وکلمات، لب ولہجے اور حرکات وسکنات وغیرہ سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کریں گے کہ اس کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر کس کا ہے۔

قیدیوں کے انٹرویوز شروع ہوئے، سوشل سائنسز اور ہیومینیٹیز میں سوالنامہ

تیار کرنے میں جتنی مہارتیں استعمال کی جا سکتی تھیں، کی گئیں کہ سوالنامہ پُر کرنے والے کو شک بھی نہ پڑے کہ اس سے اصل سوال کیا کیا جارہا ہے اور اس کا ذہن بھی پڑھ لیا جائے۔ علاوہ ازیں فوجی افسران نے اپنی ذاتی بلا کی ذہانت استعمال کرتے ہوئے بھی کبھی گھما پھرا اور کبھی بے پرواہی کے انداز میں سوالات کرنا شروع کیے اور ماہرین نفسیات نے غیر محسوس انداز میں قیدیوں کا ریسپانس نوٹ کرنا شروع کر دیا۔

ایک قیدی سے سوال ہوا کہ اسے سب سے زیادہ محبت کس شخصیت سے ہے؟ اس نے جواب دیا کہ احمد سے۔ دوسرے سے سوال کچھ یوں کیا گیا کہ مسلمانوں میں سب سے عظیم مفکر کون ہے؟ اس نے جواب دیا کہ احمد ہے۔ تیسرے قیدی سے سب سے بڑے عالم دین کا سوال ہوا تو اس نے کہا کہ احمد بن حنبل۔ انٹرویوز ختم ہو چکے تھے اور اعلی امریکی فوجی افسران اور دانشوروں کا اجلاس جاری تھا اور ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے اور وہ دمکتے بھی کیوں نہ کہ انہوں نے دہشت گردوں کا امام تلاش کر لیا تھا۔ دوسرے اجلاس میں دہشت گردوں کے امام، احمد بن حنبل کو پکڑے کی اسٹریٹیجی طے پا رہی تھی۔

احمد بن حنبل کا ایڈریس معلوم کرنے کے لیے قیدیوں پر تشدد کیا گیا، انہیں کرنٹ لگایا گیا، بے لباس کیا گیا، بھوکا رکھا گیا، الٹا لٹکایا گیا، ناخن اکھاڑے گئے لیکن کسی قیدی نے بھی امام احمد بن حنبل کا ایڈریس نہ بتلایا بلکہ سب نے کہا کہ وہ فوت ہو چکے ہیں۔ قیدیوں سے مایوس ہو کر امریکیوں نے ساری دنیا میں احمد بن حنبل کی تلاش میں جاسوس پھرا دیے لیکن بے سود، احمد بن حنبل کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا، دو سال کی انتھک محنت کے باوجود ان کا ادنی سا سراغ بھی نہ ملا۔ دو سال بعد، اسی بند کمرے میں، امریکی فوجی افسران اور دانشوروں کا ایک اور اجلاس منعقد ہو رہا تھا کہ جس کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ دہشت گرد، امریکیوں سے زیادہ ذہین ہیں۔

دینی طبقات کی خدمت میں

میں ایک عرصے سے جاوید چوہدری کو پڑھتا چلا آرہا ہوں کہ ایک دو باتیں جو یقین

سے ان کے بارے کہی جاسکتی ہیں؛وہ یہ ہیں کہ ایک توان کی تحریر کا معاشرے کے ایک بڑے طبقے پر اثر ورسوخ ہے اور دوسرا یہ کہ وہ مخلص آدمی ہیں، بھلے کنفیوژڈ ہوں۔اور تیسری اور اہم تربات یہ ہے کہ مذہبی طبقات کوفی زمانہ ایسے ترجمانوں کی ضرورت ہے جو جاوید چوہدری جیسا قلم اور معاشرتی رسوخ رکھتے ہوں لیکن مذہبی طبقات اس ضرورت کوکسی درجے میں محسوس کرنے سے قاصر ہیں۔ مولانا مودودی رحمہ اللہ سے سو اختلافات سہی، لیکن ان کے قلم کے بعد کوئی ایک ایسا قلم کہ جس نے امت کے ذہین طبقات کوانہی کی طرح متاثر کیاہو، کہاں نظر آتاہے؟ باقی عوامی سطح پر دین کا کام بہت ہوا ہے،اس سے انکار نہیں ہے۔

بدقسمتی سے مذہبی طبقات کا مزاج جوڑنے سے زیادہ توڑنے کا بن چکا ہے۔ ہم لوگوں کواپنے دھارے میں شامل کرنے کی خواہش کم اور نکالنے کی کاوش زیادہ کرتے ہیں۔ ہم داعیانہ مزاج سے زیادہ مناظرانہ ذہن رکھتے ہیں۔ اور دعوت تبلیغ محض کسی جماعت میں چار ماہ، سال لگا لینے کا نام نہیں ہے بلکہ دعوت تبلیغ، ایک مزاج ہے۔اور جس میں یہ مزاج رچ بس جائے، وہ دعوت تبلیغ کے نبوی منہج پر ہے۔ اور جس میں دعوت تبلیغ کا نبوی مزاج ہوگا، تووہ ایک ہاتھ سے دشمن پر تلوار اٹھائے گا تو دوسرے ہاتھ سے اس کے لیے دعا کرے گا۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنی جان کے دشمنوں تک کے لیے نہ صرف خواہش رکھیں بلکہ دعا کا بھی اہتمام کریں کہ اللہ ان کو دین اسلام کا سپاہی بنادے اور ہم کلمہ گو مخلص مسلمان دینی بھائیوں کے بارے ایسا سوچ لینے سے بھی محروم ہیں۔ بھائی، ہم سب کے علم میں ہے کہ مذہبی طبقات کے پاس دنیا کے بہترین ذہن کو متاثر کرنے کے لیے کون سے رجال موجود ہیں؟ اللہ نے ہماری آزمائش اسی میں رکھ چھوڑی ہے کہ ہمیں یہ شخصیات اپنے طبقات سے باہر ہی ملتی ہیں، لیکن انھیں ادھر لانے کی آرزو اور کوشش تو ہم نے ہی کرنی ہے نا۔ آپ کے پاس قلم کا ہتھیار نہ سہی، دعا کا ہتھیار تو ہے نا۔ لیکن اب تو یہ سوچتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ کیا ہمارے دعا کے ہتھیار بھی اتنے ہی کند ہیں جتنے

کہ دوسرے؟

پس جو لوگ بھی غلبہ دین کے لیے کام کر رہے ہیں انہیں یہ اہتمام کرنا چاہیے کہ جس میں کوئی اچھی خاصیت دیکھیں، تقریر کی، تحریر کی، ذہانت کی، اخلاق کی، معاشرے میں اثر ورسوخ کی وغیرہ تو دعا کریں کہ اللہ عزوجل اسے دین اسلام کا موید بنادے۔ اور شاید ہمیں کبھی کبھار، تنہائی میں، سجدے کی حالت میں، اللہ سے کچھ لوگوں کو مانگتے رہنا چاہیے، جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ مانگا کرتے تھے۔ یہ اس مسئلے کو دیکھنے کا ایک زاویہ ہے، کل نہیں۔ لہٰذا دوسرے زاویے بھی درست ہو سکتے ہیں، مجھے انکار نہیں ہے۔

طیب اردوغان کی صفائی مہم

فوجی بغاوت کے بعد سے طیب اردوغان نے نہ صرف فوج بلکہ پولیس، ججوں، بیوروکریٹس اور محکمہ تعلیم میں بھی صفائی کا ہفتہ منانا شروع کر دیا ہے اور ہمارے خیال میں ریاست کی نظریاتی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے ایسا کرنا بہت ضروری ہے، چاہے وہ کچھ بھی ہوں۔ طیب اردوغان جس قدر صفائی پسند واقع ہوئے ہیں، ان سے یہی امید تھی کہ وہ گند کو کسی صورت برداشت نہیں کریں گے۔ اپنی اسی طبیعت کی وجہ سے تو وہ 1996ء میں استنبول کے کامیاب ترین میئر قرار پائے تھے اور اپریل 2016ء میں جا کر اردوغان کی حکومتی پارٹی کے اسپیکر اسمبلی نے پہلی بار اعلانیہ اپنا ایجنڈا یہ بھی بیان فرمایا کہ ہم مسلمان ملک ہیں اور ہم اپنے ملک میں آئین کو اسلامی بنانا چاہتے ہیں۔

ہمارے بعض دوستوں کو طیب اردوغان صاحب کی صفائی مہم پر اعتراض ہے، تو ان کے جواب میں عرض یہ ہے کہ اگر فوجی بغاوت کامیاب ہو جاتی تو کیا فوج اردوغان کے حامیوں کو سیلوٹ مارتی، انہیں پھول بوٹے لگاتی، ترقیاں عطا کرتی، امریکہ کے ویزے لگا کر دیتی؟ یہ تو شکر کریں کہ اردوغان حکومت صرف معطلی پر اکتفا کر رہی ہے، اگر مصر کی طرح فوجی بغاوت کامیاب ہو جاتی یا حسینہ واجد جیسی سیکولر جمہوری حکومتی ہوتی تو اردوغان کے سارے حامی نہ صرف معطل ہوتے بلکہ جیلوں میں قید ہوتے، تشدد کیے جاتے، قتل کیے جاتے، پھانسیاں دیے جاتے، پتہ نہیں کیا کیا، کیا جاتا اور دنیا خاموش

رہتی، لبرل بھی اور میڈیا بھی، اور وہ ڈاڑھی والے بھی ساری نصیحتیں بھول چکے ہوتے جو غلط فہمی میں اپنے آپ کو اسلام پسند سمجھتے ہیں۔

جو اپنے آفس کے چپڑاسی کو دبانے کی ہزار دلیلیں رکھتے ہیں، انہیں اردوغان پر اعتراض ہے کہ وہ بغاوت کی حمایت کرنے والوں کو دبا کیوں رہا ہے؟ کمال ہے! دوسری طرف مغرب کو دیکھیں، کہ یورپی یونین نے اردوغان سے سختی سے کہا ہے کہ فوجی بغاوت کرنے والے قیدیوں کو پھانسی نہ دی جائے، حالانکہ ان کی وجہ سے تین صد لوگ قتل ہوئے، اور انسانی حقوق کے چیئرمین کہہ رہے ہیں کہ ہم جیلوں تک رسائی حاصل کرکے قیدیوں کی صورت حال دیکھیں گے کہ ان کے حقوق پورے کیے جا رہے ہیں یا نہیں؟

ہمیں اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اسلام میں قیدیوں کے حقوق ہے لیکن اس وقت تمہاری ان نصیحتوں پر لعنت بھیجنے کو دل کرتا ہے جبکہ مصر میں فوج ہزاروں کو قتل کر دیتی ہے، سینکڑوں کو پھانسی لگا دیتی ہے۔ بنگلہ دیش میں سیکولر جمہوری حکومت سینکڑوں کو تختہ دار پر لٹکا دیتی ہے لیکن تمہاری آواز بھی نہیں نکلتی کہ وہ مرنے والے اسلام پسند ہیں۔ لیکن جب تمہارے بھائیوں کی باری لگتی ہے تو تمہیں مذہب، انسانیت، اخلاقیات، حکمت، مصلحت معلوم نہیں کیا کیا یاد آجاتا ہے۔ چپ کرکے پڑے رہو! اللہ میاں باریاں لگا رہے ہیں۔ اسلام پسندوں نے اگر صبر کر لیا ہے تو تم بھی تھوڑا حوصلہ کر لو، کوئی مر نہیں جاؤ گے اتنی سی سختی سے، کہ اللہ میاں نے تمہیں بھی قیامت تک باقی رکھنا ہے، کہ اس کا یہی وعدہ ہے شیطان سے!

یہ اچھی جمہوریت ہے!

ووٹ ہیلری کو زیادہ پڑے ہیں لیکن صدر ٹرمپ منتخب ہوئے۔ ہیلری کو کل ملا کر 59739748 ووٹ پڑے جبکہ ٹرمپ کو 59520091 ووٹ پڑے یعنی ہیلری کو تقریباً پونے دو لاکھ ووٹ زیادہ ملے۔

حیرانگی کی بات ہے نا! لیکن یہی جمہوریت ہے، ادھر پاکستان میں بھی۔ ذرا غور

کریں کہ ٹرمپ کم ووٹ لینے کے باوجود کیسے جیت گیا ہے؟ لیکن کیا یہ جمہوریت کا کھلا تضاد نہیں ہے کہ عوامی جمہوریت، منتخب نمائندوں کی جمہوریت کا انکار کر رہی ہے۔

ٹرمپ کو فتح مبارک ہو

اب یہ تو مستقبل میں ہی معلوم ہو گا کہ ٹرمپ کی فتح امریکہ کے لیے باعث برکت تھی یا سبب نحوست لیکن جس طرح سے وہ جیتا ہے، اس پر تو مبارکباد بنتی ہے! کچھ دوستوں کا خیال ہے کہ امریکہ کی تباہی کے لیے ٹرمپ کا جیتنا ضروری ہے لیکن مجھے نہیں معلوم کہ امریکہ کے زوال کے لیے احمق مرد زیادہ مفید ہو سکتا تھا یا کرپٹ خاتون۔ البتہ امریکیوں نے بے وقوف مرد کو تجربہ کار خاتون پر ترجیح دے کر یہ ضرور بتلا دیا ہے کہ امریکہ میں آج بھی عورت کو مرد کے برابر نہیں سمجھا جاتا۔

جنت الحمقی اور جہیم العقلاء

جن کا یہ خیال ہے کہ نواز شریف کے بعد دوسرے کرپٹ سیاستدانوں کا بھی احتساب ہو گا، وہ "جنة الحمقى"(paradise of fools) میں رہ رہے ہیں اور جنہیں یہ امید ہے کہ عمران خان کے آنے سے نیا پاکستان بن جائے گا وہ "جهيم العقلاء"(hell of the wise) کے باسی ہیں۔

❁❁❁❁❁❁❁

باب ہشتم

لسانیات اور نفسیات

اس باب میں لسانیات اور نفسیات کے بارے بنیادی سوالات پر بحث کی گئی ہے۔

متن کے پیچھے

متن (text) کے پیچھے ایک دنیا آباد ہے، مصنف کے تخیلات اور احساسات وجذبات کی۔اس دنیامیں جھانکنے کی کوشش کرو، شاید کہ انسان کچھ سمجھ آجائے۔

خاموشی اور اظہار

بعض اوقات خاموشی، اظہار سے زیادہ بلیغ ہوتی ہے بشر طیکہ آپ کا مخاطب ذہین ہو۔ بلیغ سے مراد وہ بات جو دل تک پہنچ جائے کہ ابلاغ، تبلیغ اور بلاغت کے الفاظ بھی اسی مادہ(root word)سے ہیں۔

ہر بات

ہر بات فیس بک پر کرنے کی نہیں ہوتی، کاش کوئی ان "بالغ بچوں" کو سمجھادے۔

فیس بک لکھاری

بھائی روزانہ لکھناضروری نہیں ہے، اگر آج نہیں آرہاتومت لکھو ورنہ اچھے لکھاری مارے غم کے لکھنا بند کردیں گے۔

ذہن کا مطالعہ

دوست نے کہا کہ میں تمہارے ایک لفظ سے دس خیالات پڑھ سکتا ہوں، میں نے کہا کہ فخر کی بات نہیں، میں اس عذاب سے گزر چکا ہوں کہ میں بیس پڑھ سکتا تھا۔ دوست نے کہا کہ اس عذاب سے جان چھڑانے کی کوئی تدبیر؟ میں نے کہا کہ سادگی اختیار کرلو، چاہے تکلف سے کرو۔اور میری مراد لباس کی سادگی نہیں ہے، سوچ بچار میں سادگی۔

سنجیدگی اور مزاح

انتہائی سنجیدگی، بہترین مزاح کو جنم دیتی ہے بشر طیکہ حس لطافت فعال ہو۔اور حس لطافت سے مراد فنون لطیفہ کی حس ہے۔

اردو املاء کے قواعد و ضوابط

اردو الفاظ کی املاء ماہرین زبان کے نزدیک تاحال متفق علیہ نہیں ہے بلکہ ہر زبان میں معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ انگریزی کو ہی لے لیں تو امریکہ اور برطانیہ کی انگریزی کی املاء میں بہت فرق موجود ہیں کہ ایک ہی لفظ کے سپیلنگ وہ کچھ لکھتے ہیں اور یہ کچھ لہذا املاء پر اتفاق ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ قرآن مجید میں بھی املاء کے اختلافات موجود ہیں جیسا کہ قراءات، ضبط اور رسم الخط کا علم رکھنے والے ان سے بخوبی واقف ہیں۔

یہ واضح رہے کہ "املاء"، "خط" اور "رسم الخط" میں فرق ہوتا ہے۔ املاء سے آسان الفاظ میں کسی لفظ کے سپیلنگ مراد ہوتے ہیں۔ خط سے مراد "فونٹ" ہے یعنی لکھنے کا اسٹائل وغیرہ جیسا کہ اردو میں "نسخ" اور "نستعلیق" وغیرہ خط ہیں۔ اور رسم الخط سے مراد اردو کو "رومن" یا "دیوناگری" یا "فارسی" رسم الخط میں لکھنا ہے۔ "دیوناگری" ہندی زبان کو لکھنے کا رسم الخط ہے۔ تو اردو زبان کے رسم الخط کی تبدیلی کی تحریک کہ اردو کو "رومن" یا "دیوناگری" میں لکھنا چاہیے تو یہ حماقت ہے اور کچھ نہیں کہ اس کا مطلب زبان کو ایک مرتبہ مار کر دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کرنا ہے۔

علاوہ ازیں جہاں تک املاء کی بات ہے تو ہمارے ہاں جو لوگ غلطی سے املاء کی تصحیح یا اصلاح وغیرہ پر کوئی ایک آدھا مضمون یا کتاب دیکھ لیں تو ایک ایکسپرٹ کی طرح دوسروں کی تصحیح شروع کر دیتے ہیں کہ یہ لفظ یوں نہیں یوں لکھا جاتا ہے بلکہ ان میں سے تو بعض کو "اردو" کے "اردو" کہلوائے جانے پر بھی اعتراض ہوتا ہے کہ ان کا اصرار ہے کہ اسے "ریختہ" کہو کہ یہی اس کا اصل نام ہے۔

لیکن انسان اگر اس موضوع پر زیادہ نہ سہی لیکن دو چار اچھی کتابیں ہی دیکھ لے تو اس میں اتنی عاجزی پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں کہ اگر کوئی اچھا رائٹر ایسے لکھ رہا ہے تو اس کی بھی گنجائش نکلتی ہی ہو گی۔ مثال کے طور ڈاکٹر گوہر شاہی کی کتاب "اردو املا و رموز اوقاف" ایک اچھی کتاب ہے کہ جسے "مقتدرہ قومی زبان" نے شائع کیا ہے جو پندرہ ماہرین لسانیات کے منتخب مقالات پر مشتمل ہے۔

مثال کے طور ترقی اردو بورڈ، انڈیا نے دو کتابیں شائع کی ہیں؛ ایک رشید حسن خان صاحب کی "اردو املا" اور دوسری ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی "املانامہ"۔ ان دونوں کتابوں میں بھی املاء کے قواعد میں یکسانیت نہیں ہے جیسا کہ پہلے کے نزدیک "ذرا" لکھنا چاہیے تو دوسرے کے نزدیک "زرا" اصل املا ہے۔ پہلے کے نزدیک "آزمایش" صحیح املاء ہے تو دوسرے کے نزدیک "آزمائش"۔[1] پہلے کے نزدیک "چوں کہ" لکھنا چاہیے اور دوسرے کے نزدیک "چونکہ" وغیرہ وغیرہ

املاء کے زیادہ تر اختلافات "ہائے مختفی"، "ہمزہ" اور "نون غنہ" سے متعلق ہیں۔ مثلاً "ڈراما" لکھنا چاہیے یعنی "الف" کے ساتھ یا "ڈرامہ" یعنی "ہائے مختفی" کے ساتھ۔ تو اس میں اہل لغت کا کہنا ہے کہ وہ الفاظ جو انگریزی زبان سے آئے ہیں، انہیں "ہائے مختفی" کی بجائے "الف" سے لکھنا چاہیے یعنی "ڈراما"۔ لیکن اس میں بھی ہمارا کہنا یہ ہے کہ یہ دیکھنا چاہیے کہ اہل زبان اس لفظ کو بول کیسے رہے ہیں۔ اگر وہ یعنی ان کی ایک بڑی تعداد "ڈرامہ" بھی بول رہی ہے یعنی بولنے میں "ہائے مختفی" کی آواز بھی نکال رہی ہے تو دونوں طرح لکھنا ہی راجح قرار دیا جائے۔

ماہرین لسانیات کا کہنا یہ ہے کہ عربی الفاظ کہ جن کے آخری میں ہمزہ ہے، اردو میں انہیں لکھتے وقت ہمزہ غائب کر دیں جیسا کہ "علماء" کو "علما" لکھیں۔ میں نے اپنی کتاب "صالح اور مصلح" میں ایسے ہی کیا تھا لیکن اب کی بار اپنی کتاب "مکالمہ" میں اسے "علماء" ہی لکھنے کا اہتمام کیا ہے کہ یہ خواہ مخواہ کا تکلف ہے اور رائج املاء کی مخالفت ہے کہ ہمارے ہاں اردو لکھنے پڑھنے والا بڑا طبقہ مذہبی ہے اور اسے عربی الفاظ کو عربی اصل کے ساتھ املاء اور عربی لہجے میں ادائیگی کی ایسی عادت ہے کہ اسے ترک کرنے کی دعوت دینا بھی تکلف محض ہے۔

اسی طرح ماہرین لسانیات کا کہنا ہے کہ جن عربی الفاظ کے آخر میں الف مقصورہ ہے

[1] اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام یعنی دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے املاء کے فیصلوں میں ہمزہ کو باقی رکھا گیا ہے نہ کہ یاء کو۔

تو ان کو اردو میں "الف" کے ساتھ لکھا جائے اور "یاء" کو املاء میں سے ختم کر دیا جائے مثلاً "تقوی" کو اردو میں "تقوا" اور "دعوی" کو "دعوا" لکھا جائے۔ یہ بھی تکلف ہی ہے کہ یونانیوں کے اصول "شعور حرف بوسیلہ سماعت" کے مطابق اس کی املاء "تقوی" رکھنے میں بھی حرج نہیں ہے۔ اور مجھے بھی یہی پسند ہے کہ اس سے ہم عربی اصل سے بھی جڑ جاتے ہیں اور یہ دو علیحدہ حروف معلوم نہیں ہوتے اور رائج اور عرف کا بھی دھیان رہ جاتا ہے۔ بلکہ پہلی مرتبہ جب میں نے "دعوا" لکھا ہوا دیکھا تو سوچ میں ہی پڑ گیا کہ یہ کیا لفظ ہے کیونکہ رائج املاء بہر حال "دعوی" ہی کی ہے اور عوام اسی سے واقف ہیں۔ اب لسانیات کی کتابیں پڑھنا نہ تو ہر کسی کے بس میں ہے اور نہ ہی ہر کسی کا شوق ہے اور اردو زبان کی نشر واشاعت میں حکومت کی کتنی دلچسپی یا کردار ہے، وہ بھی واضح ہے۔ تو ایسے میں اخبار پڑھ کر اردو سیکھنے والے عوام سے امید رکھنا کہ وہ آپ کی اردو معلی کو سمجھ پائیں گے، بے کار ہے۔ اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام یعنی دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور میں یاء کو باقی رکھا گیا ہے۔

اسی طرح ایک اور اختلاف یہ بھی ہے کہ اردو میں تائے مدورۃ یعنی گول تاء نہیں ہے لہذا عربی کے جن الفاظ کے آخر میں گول تاء ہے، انہیں اردو میں استعمال کرتے وقت تائے مبسوطہ یعنی لمبی تاء سے لکھنا چاہیے یعنی "رحمۃ" کو "رحمت" لکھنا چاہیے۔ عام الفاظ میں تو اس ضابطے کا دھیان رکھنا ہی چاہیے بلکہ عرف میں بھی رکھا ہی جاتا ہے کہ اردو میں "جنت" لکھا جاتا ہے نہ کہ "جنۃ"۔ لیکن مصطلحات (terminology) کے استعمال میں اگر ان الفاظ کو گول تاء کے ساتھ بھی لکھ دیا جائے جیسا کہ وہ عربی یا دینی مصادر میں ہیں تو بھی حرج نہیں ہے مثلاً ہمارے ہاں بڑے بڑے لوگ "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" لکھتے ہیں نہ کہ "السلام علیکم ورحمت اللہ"، اس لیے دونوں طرح ہی درست ہے۔ اسی طرح میری رائے میں تو "زکات" کو "زکوۃ" لکھنے میں بھی حرج نہیں ہے بلکہ میں تو قرآنی مصطلحات کو اسی طرح لکھنا راجح املاء سمجھتا ہوں کہ یہ معروف املاء بھی ہے، کم از کم اس امت کے لیے کہ جس کا اوڑھنا بچھونا قرآن مجید ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ

انہیں "زکاۃ" اور "صلاۃ" لکھ لینا چاہیے کہ عربی زبان میں یہ الفاظ ایسے ہی ہیں تو یہ اس کا جواب دیا ہے۔ لیکن جب اردو ضابطے سے نکلنا ہی ہے تو عربی زبان کی بجائے قرآن مجید کی املاء میں پناہ لینا زیادہ بہتر ہے کہ ہمارے عام لوگ عربی املاء سے ناواقف ہیں لیکن قرآن مجید کی املاء سے بچپن ہی میں نورانی قاعدہ پڑھتے ہوئے واقف ہو جاتے ہیں۔ اور اسی طرح "صلوۃ" کو بھی واحد کے طور "صلات" تو لکھ لیں گے لیکن جمع میں پھر "واؤ" واپس لوٹ آئے گی جیسا کہ "صلوات" ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی صاحب یہ اعتراض کریں کہ اب ہم نورانی قاعدے سے اردو کی املاء سیکھیں گے! تو عرض یہ ہے کہ آپ نے اپنی عوام کو املاء سکھانے کا اور بندوبست کیا بھی کیا ہے؟ اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام یعنی دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور کی املاء میں بھی ایسے الفاظ میں قرآنی املاء ہی کو باقی رکھنے کی رائے کو ترجیح دی گئی ہے۔

اب "لیے" اور "دیے" وغیرہ کو "لئے" اور "دئے" لکھنا چاہیے یا "لیئے" اور "دیئے" تو اس میں ماہرین لسانیات میں تینوں رائے موجود ہیں:- کچھ صرف "یاء" سے لکھتے ہیں، کچھ صرف "ہمزہ" سے اور کچھ دونوں سے اور ہر کسی کے پاس اپنی اپنی دلیل موجود ہے۔ اردو میں شامل کیے جانے والے انگریزی الفاظ کو ایک ساتھ لکھنا چاہیے یا علیحدہ علیحدہ مثلاً "یونیورسٹی" کو "یونی ورسٹی" تو اس بارے میں دونوں رائے موجود ہیں اور دونوں کے پاس اپنی اپنی دلیل ہے۔ میری رائے میں بس کوئی سی صورت آپ کو اچھی لگے، اسے اختیار کر لیں۔ اور دوسرے کی "تصحیح" یا "اصلاح" کا فریضہ سرانجام نہ دیں کہ تاحال املاء کی بہت سی صورتیں متفق علیہ نہیں ہیں۔

اصولی اختلاف اس بارے میں یہ ہے کہ "شعورِ حرف بوسیلہ سماعت" اصل ہے یا "شعورِ حرف بوسیلہ حدوث"۔ یونانیوں کا کہنا یہ ہے کہ حرف کے اسی شعور کا اعتبار ہو گا جو سماعت سے حاصل ہوتا ہے جبکہ اہل ہند کا عمومی رجحان اس بارے یہ ہے کہ حرف کا شعور وہی معتبر ہے جس کی ادائیگی پر انسان قدرت رکھتا ہو۔

اسے ایک مثال سے یوں سمجھیں کہ عربی زبانی میں "ڑ" نہیں ہے تو اگر اہل عرب

"پہاڑ" کا لفظ سنیں گے تو اب اس "پہاڑ" کے لفظ کی ادائیگی میں ان کے لیے "سماعت" اصل ہے یا "حدوث"۔ یعنی انہوں نے جیسے یہ لفظ سنا ہے، ایسے ہی اس کی ادائیگی ضروری ہے یا اس لفظ کی ادائیگی ویسے ضروری ہے جیسے ان کے حنجرہ صوت (larynx) کے لیے آسانی ہو؟

میرا رجحان اس طرف ہے کہ یہ دونوں اصول اپنی جگہ درست ہیں اور کسی زبان کی املاء میں ان دونوں سے برابر طور استفادہ کرنا چاہیے اور استفادے کی اصل عرف اور رواج کو بنایا جائے کہ زبان میں جو املاء رائج اور عام ہے، اگر وہ ان دونوں میں سے کسی بھی اصول کے تحت آ رہی ہے تو اسے رائج رہنے دینا چاہیے، اس کی اصلاح یا تصحیح پر اصرار وقت کا ضیاع ثابت ہو گا۔ واضح رہے کہ املاء کی تصحیح اور اصلاح میں بھی فرق کیا جاتا ہے کہ تصحیح، غلط املاء کی ہوتی ہے جبکہ اصلاح سے مراد راجح املاء کا تعین ہے۔

ایک دوست نے کہا کہ یہ دونوں اصول تو زبان بولنے سے متعلق ہیں نہ کہ لکھنے سے۔ تو عرض یہ ہے کہ یہ اصول زبان بولنے اور لکھنے دونوں سے متعلق ہیں اور یہ صرف ہم نہیں کہہ رہے بلکہ بعض ماہرین لسانیات کا بھی یہی کہنا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا کتاب "اردو املا و رموز او قاف" کا مقدمہ دیکھ لیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ خود ان اصولوں کی تراکیب میں غور کر لیں کہ "شعورِ حرف بوسیلہ سماعت" اور "شعورِ حرف بوسیلہ حدوث"۔ تو "شعورِ حرف" ان تراکیب میں اصل ہے باقی دونوں تو اس کے وسائل ہیں۔ اور اب یہی "شعورِ حرف" ہے کہ جس کا اظہار املاء میں بھی ہونا ہے اور لفظ میں بھی۔

لفظ اور معنی میں تعلق کی نسبتوں کا علم بہت اہم ہے کہ اس کا علم نہ ہونے کی وجہ سے فتنوں کے خلاف کام کرنے والے خود فتنوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ اور اس کی وجہ اخلاص اور للہیت کی کمی نہیں ہو گی بلکہ دینی علوم میں رسوخ نہ ہونا اور تنقیدی تجزیہ کی صلاحیت میں کمی ہونا ہو گا۔

اس باب میں اصولی بات یہ سمجھ لینی چاہیے کہ لفظ کے معنی سے تعلق کی نسبت یا تو لغوی ہوتی ہے یا عرفی یا شرعی۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اہل لغت نے ایک لفظ کا کیا معنی مراد لیا ہے، اور عرف اور رواج میں اس لفظ کا معنی کیا لیا جاتا ہے اور شرع میں اس لفظ کا کیا معنی ہے؟ بس لفظ کا معنی انہی تین جہتوں سے متعین ہوتا ہے۔ ان تین نسبتوں سے ہٹ کر اگر کسی لفظ کا کوئی معنی بیان کیا جا رہا ہے تو اس کی حیثیت ریڈر کے وہم سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

مثال کے طور پر کچھ دن پہلے فیس بک پر موجود بعض فاضل دوستوں نے "شاعرانہ ذوق" کے نام سے ایک ترکیب میں لفظ "ذوق" کے خوب معانی بیان کیے۔ کسی نے کچھ کہا، کسی نے کچھ۔ لیکن اگر کسی نے کچھ نہیں کہا تو وہ یہ نہیں کہا کہ ذوق کا لغت، عرف اور شرع میں کیا معنی ہے؟ بھائی، اگر آپ ابوالکلام آزاد کی نثر میں ذوق کے معنی کو متعین کرتے ہوئے دس جملے ارشاد فرمادیں گے تو یہ ذوق کا وہ معنی ہے جو محض آپ کی اپنی "کتاب التعریفات" میں موجود ہے۔

اور یہ وہ "کتاب التعریفات" ہے کہ جس کے مصنف بھی آپ ہی ہیں اور اس کے واحد ریڈر بھی آپ ہی ہیں۔ اگر یقین نہ آئے تو اپنی گلی میں نکل کر دس افراد یا شہر میں نکل کر سو ایسے افراد کو روک کر ذوق کا معنی معلوم کر لیں کہ جنہیں آپ پڑھا لکھا سمجھتے ہوں، چاہے وہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی۔ تو ان میں سے کوئی ایک بھی ذوق کے اس معنی کو بیان کرنے والا نہ ملے گا کہ جو آپ بیان کر رہے ہوں گے حالانکہ ان میں سے ہر شخص ہر ہفتے یا مہینے اس لفظ کو نہ صرف بول رہا ہو گا بلکہ اسے سمجھ اور سمجھا بھی رہا ہو گا۔

زبان وہ نہیں ہوتی کہ جو آپ کے تراشے ہوئے مفاہیم میں مستعمل ہو، زبان وہ ہوتی ہے کہ جسے معاشرے کے افراد کے ذہن میں موجود افراد کے معانی میں استعمال کیا جائے۔ الفاظ کو اپنے تخیل یا قلبی واردات میں موجود معانی میں استعمال کرنا اور ان معانی کے صحیح ہونے پر اصرار کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ پوسٹ ماڈرنسٹوں کا یہ مقدمہ ثابت کرنا کہ لفظ کا کوئی معنی نہیں ہوتا اور یہ کہ ہر شخص کے لیے لفظ کا معنی اضافی اور ریلیٹو ہے۔

ہماری کلاسیکل دینی روایت میں رواج یہی ہے کہ سب سے پہلے لفظ کو ایک بنیادی کھونٹے سے باندھتے ہیں کہ جسے ہم "بنیادی معنی" یا "اصل معنی" کہتے ہیں، اور یہ بنیادی اور اصل معنی بھی لغت، عرف اور شرع سے ثابت ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد اس میں مزید معانی سے اس مصطلح کی وضاحت کرتے ہیں اور یہ مزید معانی بھی اس اصل معنی کی بنیاد پر ایسے ہی کھڑے ہوتے ہیں جیسا کہ کوئی چھت کسی ستون پر قائم ہو۔

بہر حال بہت سے دوستوں کا خیال ہے کہ ہم فوری ردعمل میں لکھتے ہیں اور مخالفت میں شدت اختیار کر جاتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ ہمیں فلاں موضوع پر نہیں لکھنا چاہیے تھا یا فلاں موضوع پر لکھ کر ہم نے غلطی کی ہے۔ پہلی بات تو درست نہیں ہے البتہ دوسری پر میں تبصرہ نہیں کرتا کہ شاید جان بوجھ کر ایسا کرتا ہوں کہ چلتی گاڑی کو روکنے کے ایک بار تو زور سے بریک لگانے ہی پڑتے ہیں، تبھی کچھ اثر پڑتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اکثر لوگ کسی کی مکمل فکر سے آشنا نہیں ہوتے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ مجھے لکھتے ہوئے دس برس سے زائد ہو گئے ہیں، تقریباً 150 مقالہ جات لکھ چکا ہوں، بہت مکالمے کیے ہیں اور ہر فن میں کیے ہیں لہذا ہر فن اور میدان میں ایک سوچی سمجھی رائے رکھتا ہوں۔

پس فلسفہ، منطق، کلام، سائیکالوجی، اکنامکس، سوشیالوجی، تاریخ، ادب، تصوف، مذہب، شخصیات، علوم قرآن، علوم حدیث، اصول تفسیر، اصول حدیث، اصول فقہ، عقیدہ و منہج، استشراق، فنون لطیفہ، معاصر مسلم دنیا وغیرہ جیسے بیسیوں موضوعات پر نہ صرف لکھ چکا ہے بلکہ اس سب فکر کو میں نے دس بارہ صفحات میں " اسلامی نظریہ حیات" کے نام سے جمع کیا ہے کہ جس کے دوسرے ایڈیشن پر اب کام کر رہا ہوں۔ مثال کے طور فلسفے کے بارے میری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ فلسفہ، ادب کی ایک شاخ ہے۔

اب کسی کو یہ تبصرہ پسند نہیں یا سطحی معلوم ہو تو بھائی کیا کریں؟ میں تو لکھ رہا ہوں جیسا کہ ہر کوئی لکھ رہا ہے، اور خوب لکھ رہا ہوں، سوچ سمجھ کر لکھ رہا ہوں، دلیل اور

تفصیل سے لکھ رہا ہوں۔ مستقبل میں کوئی اس کو جمع کر دے گا تو دین کا ایک نیا بیانیہ مرتب ہو کر سامنے آ جائے گا۔ اب آپ اس بیان کو بھی ریاکاری سمجھ لیں اور میرے رویوں کی روشنی میں مجھ پر میرے قلبی احوال منکشف کرتے رہیں یا اسے وضاحت سمجھ لیں یا کچھ اور۔ لیکن اب عرصے سے عادت ہے کہ جو لکھتا ہوں، سوچ کر لکھتا ہوں کہ اس کا لکھنا جائز بھی ہے یا نہیں۔ بعد میں نتائج غلط نکلیں تو توبہ استغفار کر لیتا ہوں کہ انسان یہی کر سکتا ہے لیکن خاموش نہیں رہ سکتا کہ وہ شاید موت کے مترادف ہے۔ جہاں بہت سے لوگ اپنی اپنی لاٹھی پھیر رہے ہیں تو ہمیں بھی پھیرنی ہے کہ اس کے بغیر زندگی میں سکون نہیں ہے۔

لفظ کے بارے تھیوریز

ایک ماہر لسانیات دوست ڈاکٹر مدثر احمد صاحب کے توجہ دلانے اور کچھ اپنے تجسس کی عادت کے ہاتھوں مجبور، آجکل لفظ کے بارے تھیوریز کا مطالعہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر کوئی دوست اس بارے فکری کتاب یا تحریر کی طرف رہنمائی فرمائیں تو ممنون ہوں گا۔ تحریر اردو میں ہو تو بہت اچھا ہے کہ میری مادری زبان اردو ہے۔

لفظ بذات خود کیا ہے؟ اس کی تاثیر کہاں واقع ہوتی ہے؟ خود لفظ میں یا اس لفظ کے سیاق (context) میں؟ لفظ کسی معنی کا ظرف (container) ہے یا نہیں؟ لفظ کا معنی لفظ میں ہوتا ہے یا لفظ سے باہر کلچر میں؟ یا مخاطب کے ذہن میں؟ لفظ خارج میں کیا ہے اور انسانی ذہن میں کیا ہے وغیر ذلک کثیر

اس کو چند مثالوں سے بھی سمجھ لیں کہ ایک لفظ کسی شخص پر کچھ اثر کرتا ہے تو وہی لفظ کسی دوسرے پر کچھ اور۔ کسی کو آپ گالی دیں تو وہ آپ کو دعا دے گا اور کوئی آپ کو جواباً گالی دے گا اور کوئی نظر انداز کر دے گا وغیرہ۔

ڈاکٹر مدثر صاحب نے ایک مثال شیئر کی ہے کہ اگر آپ اپنی دیوار پر اردو میں یہ لکھ دیں کہ پیشاب کرنا منع ہے تو اکثر لوگ پروانہ کریں گے لیکن یہی عبارت عربی میں لکھ دیں تو اکثر لوگ رک جائیں گے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ یہاں تاثیر لفظ کی ہے یا معنی کی

یا سیاق کی؟

لفظ ایک خاص ترتیب اور فریکوئنسی سے بولا جائے تو آپ مخاطب کو ہپنٹائز تک کر سکتے ہیں۔ ماں الفاظ کی لوری دے کر بچے کو سلاتی ہے جبکہ معنی بچے کے پلے کچھ بھی نہیں پڑ رہا ہوتا۔ تو معنی کے علاوہ بھی لفظ میں کچھ طاقت ہے۔

لفظ جاگتے کو سلا دیتا ہے اور سوئے ہوئے کو جگا دیتا ہے۔ لفظ لمحات میں پوری دنیا کو جنگ کی آگ میں جھونک سکتے ہیں تو لفظ ہی لمحوں میں خون کے پیاسوں کو بھائی بنا سکتے ہیں۔ لفظ کے ذریعے لوگوں کو بے وقوف بنایا جا سکتا ہے، گمراہ کیا جا سکتا ہے، اپنا اندھا معتقد بنایا جا سکتا ہے۔ لفظوں میں ایک جادو نگری ہے، مجھے اس کی سیر کرنی ہے، کوئی کتاب تو بتلا دیں جو یہ سیر کروا دے۔

لفظ اور معنی: مذہب، لغت، ادب اور ذہن کے تناظر میں

لفظ اور معنی کے بارے متنوع علوم میں بحث کی گئی ہے۔ مثلاً اصول فقہ میں ہم مذہبی جہت سے لفظ اور معنی کے تعلق کی گہرائیوں اور وسعتوں کا مطالعہ کرتے ہیں کہ جن سے عموماً ادب والے واقف نہیں ہوتے اور اسی طرح لسانیات میں لفظ اور معنی کی جن مباحث کا مطالعہ کیا جاتا ہے عموماً مذہبی لوگ ان سے واقف نہیں ہوتے۔

اگر لفظ اور معنی کو مذہبی عقلی و منطقی تناظر میں دیکھنا ہو تو اصول فقہ کی کتابیں دیکھنی چاہییں اور زبان و لغت کے اعتبار سے جانچنا ہو تو علم بلاغت کی کتب مفید ہیں۔ اور ادب کے تناظر میں لفظ اور معنی کا مطالعہ کرنا ہو تو لسانیات کے علم سے واقفیت ہونی چاہیے اور اگر لفظ اور معنی کے ذہنی تناظر کے بارے معلوم کرنا ہو تو علم نفسیات میں بہت کچھ موجود ہے۔

مجھے تو صرف یہی معلوم تھا کہ لفظ اور معنی کی بحث اصول فقہ اور بلاغت کی کتابوں میں ہی ہے لیکن اب جبکہ لسانیات اور نفسیات کی کچھ کتب دیکھی ہیں کہ جن میں لفظ اور معنی کے بالکل نئے تناظر سامنے آئے ہیں تو احساس ہوا ہے کہ اہل مذہب کو لفظ اور معنی کے ان جدید تناظروں سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ اور لسانیات اور نفسیات والوں کو بھی

چاہیے کہ وہ اصول فقہ میں خاص طور لفظ اور معنی کی بحث کا ضرور مطالعہ کریں۔

مرد اور عورت: دانشوروں کی نظر میں

ہمارے دانشوروں اور ادیبوں نے مرد اور عورت کو کیسے کیسے بیان کیا ہے، اس کا اندازہ ذرہ ان اقوال زریں سے لگائیں:

① ممتاز احمد مفتی صاحب کا کہنا ہے کہ عورت نہ حسن ہے، نہ جنس ہے، نہ جسم ہے۔ کئی عورتیں آپ کے پاس سے گزر جائیں گی لیکن آپ کو خبر بھی نہ ہو گی۔ کوئی عورت آپ سے بہت دور کھڑی ہو گی اور آپ محسوس کریں گے کہ وہ عورت کھڑی ہے۔

اگر عورت حسن، جنس اور جسم نہیں ہے تو کیا ہے؟ اس کا جواب اسی متن میں موجود ہے۔ اسے اصطلاح میں ٹیکسٹ اینالسس کہتے ہیں کہ متن کا ایسے تجزیہ کرو کہ جو بات لفظ میں موجود نہیں ہے لیکن مصنف کہنا چاہ رہا ہے تو اس تک پہنچ جاؤ۔ جو ریڈر اس ایک لفظ تک پہنچ گئے ہیں کہ جس سے مصنف عورت کو بیان کرنا چاہتا ہے تو اس کی متن کے تجزیہ (text analysis) کی صلاحیت اچھی ہے۔ اور وہ لفظ یہ ہے کہ عورت "احساس" کا نام ہے یعنی عورت وہ ہے جو آپ کو اپنی موجودگی محسوس کروادے۔ ویسے مفتی صاحب نے کمال اسلوب سے عورت کی تعریف کی ہے لیکن ہر عورت کی نہیں کی، یہی اس اقتباس کی کمی ہے۔

② کرشن چندر صاحب کا کہنا ہے کہ ہمیشہ عورتوں نے گدھوں سے عشق کیا ہے، عقلمند آدمی کو تو وہ پسند ہی نہیں کرتی ہیں۔

معلوم نہیں اس اقتباس میں مردوں کی زیادہ برائی ہے یا عورتوں کی۔ مردوں کی اکثریت گدھوں کی سی ہے تو عورتوں کی اکثریت بے وقوف ہے۔ ویسے جدید عورت کے بارے یہ بات درست معلوم ہوتی ہے لیکن تمام عورتوں کے بارے کلی طور نہیں اور یہی اس اقتباس کی خامی ہے۔

③ مشتاق احمد یوسفی صاحب کا کہنا ہے کہ ایک فرانسیسی ادیبہ کیا خوب کہہ گئی ہے

کہ میں آدمیوں کو جتنا قریب سے دیکھتی ہوں، اتنے ہی کتے اچھے لگتے ہیں۔

اس جملے کا کمال اس کے آخر کے الفاظ ہیں کہ جس سے مردوں کی مذمت بھی ثابت ہوتی ہے اور تعریف بھی نکالی جاسکتی ہے۔ تعریف اس طرح کہ لفظ "کتے" کو ایسی گالی سمجھ لیا جائے جو پیار سے کسی کو دی جاتی ہے اور مذمت تو واضح ہے ہی۔

④ علی عباس جلالپوری صاحب فرماتے ہیں کہ مرد کی سرشت میں ہے کہ وہ ایک عورت سے فیض یاب ہونے کے بعد بھنورے کی طرح دوسری کلی کا طواف کرنا شروع کر دیتا ہے۔

اس اقتباس میں لفظ "فیض یاب" اور "طواف" کا استعمال کیا خوب کیا ہے! مرد کی مذمت اور عورت کی تعریف میں یہ مبالغہ آمیز کلمات ہیں۔

بھئی، مردوں کی تعریف میں بھی کوئی دو چار اقوال زریں کمنٹس میں پیش کر دیں۔ ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے تو عورتوں ہی کی تعریفیں کی ہیں، مردوں میں بھی کوئی تعریف والی بات ہے یا نہیں؟ اب تو مرد کی تعریف سننے کو دل ترس گئے ہیں! عورت میں تو شاید اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ وہ مرد کی تعریف کر سکے لہذا مرد ادیبوں ہی سے گزارش ہے کہ کچھ اس طرف بھی توجہ دیں کہ کچھ شاعری واعری مردوں پر بھی فرما دیں، غزل کے باب میں نہ سہی، حماسہ کے باب میں ہی سہی۔ اگرچہ غزل کے باب میں بھی بہت ہو سکتی ہے بشرطیکہ انہیں عورتوں کے حسن ماپنے سے کچھ فرصت ملے تو مرد کی وفاشعاری، ایثار اور شجاعت وغیرہ کی طرف کچھ توجہ دے سکیں۔

تحریر کی بلاغت

تحریر کی بلاغت شاذ اور نادر الفاظ کے استعمال یا مشکل تراکیب کے بیان میں نہیں ہے بلکہ تحریر کی بلاغت، حسن ترکیب کا نام ہے۔ بلاغت کا لفظ بلوغ سے ہے کہ جس کا معنی پہنچ جانا ہے۔ پس بلیغ کلام وہ ہے کہ جس کا معنی دل تک پہنچ جائے، وہ بات جو کہ دل میں اتر جائے۔

مجھے تو ہمیشہ ایسی تحریر پڑھ کر کوفت ہوتی ہے کہ جس میں نادر الفاظ اور مشکل

تراکیب کا استعمال ہو، چاہے وہ مولانا ابو الکلام آزاد رحمہ اللہ ہی کی کیوں نہ ہو۔ اور سچ بتلا دوں تو مجھے تو ان لوگوں کے فہم پر بھی شک ہوتا ہے، جو ایسی نادر تحریروں کی تعریف بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ یہاں فیس بک پر بھی بعض دوست بعض تحریروں کو بہت تحسین کی نظر سے دیکھ رہے ہوتے ہیں لیکن مجھ میں اتنا حوصلہ بھی نہیں ہوتا کہ انہیں لائک بھی کر سکوں۔

شاید مزاج کا مسئلہ ہے۔ چلیں، میں تو کسی شمار قطار میں نہیں لیکن حسن عسکری رحمہ اللہ جب یہ کہتے ہیں کہ مجھ سے ابو الکلام آزاد رحمہ اللہ کی تحریر کے دو صفحے نہیں پڑھے جاتے کہ سر درد شروع ہو جاتی ہے تو مجھے اطمینان ہوتا ہے کہ ایسی ثقیل تحریر کو ناپسند کرنا کم از کم ادبی بے ذوقی نہیں ہے۔ میرے نزدیک تحریر کی بلاغت یہ ہے کہ اسے سمجھنے کے لیے دماغ پر زور نہ لگانا پڑے۔ جس تحریر کو سمجھنے کے لیے مجھے دماغی ورزش کرنی پڑے گی، وہ تحریر، پہیلی تو ہو سکتی ہے، بلاغت ہر گز نہیں۔

لکھتے ہوئے میرے سامنے ہمیشہ یہ ٹارگٹ ہوتا ہے کہ قاری کو کس طرح آسانی سے بات سمجھ آئے گی۔ بعض اوقات لکھتے لکھتے کوئی مشکل لفظ لکھ جاتا ہوں تو دوبارہ نظر ثانی کے دوران اس کا کوئی ایسا مترادف تلاش کرتا ہوں جو عام لوگوں کی روزمرہ زبان میں مستعمل ہو۔ اور بعض اوقات تو کوئی انگریزی لفظ بھی اسی لیے لکھتا ہوں کہ لوگوں کے ہاں اس کا مفہوم اس کے اردو ترجمے سے زیادہ واضح ہوتا ہے۔

پس جہاں تک بلاغت کا تعلق ہے تو میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ اس ذخیرہ الفاظ سے بلاغت پیدا کروں کہ جو عام لوگوں کے ہاں روزہ مرہ زندگی میں مستعمل ہے اور لوگوں کو اس کے معانی معلوم ہیں۔ اور اس ذخیرہ الفاظ سے بلاغت پیدا کرنے کا طریقہ پھر ایک ہی بچتا ہے، اور وہ حسن ترکیب ہے کہ اس ذخیرہ الفاظ کو آپس میں یوں متعلق کر دیں کہ اس تعلق کے نتیجے میں تحریر کا حسن پیدا ہو جائے۔

انگریزی اردو

مجھے بھی ایسی اردو زیادہ اچھی سمجھ میں آتی ہے کہ جس میں بیس فی صد الفاظ

انگریزی کے ہوں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں اب خالص اردو کی بجائے وہ زبان زیادہ رائج اور بلیغ ہے کہ جس میں بیس فی صد انگریزی کے الفاظ استعمال ہوتے ہوں۔ اب اہل زبان اسے اردو انگریزی کا نام دیں گے یا انگریزی اردو کا، مجھے نہیں معلوم لیکن ہے یہ کمال کی چیز۔ یہ ولایتی اردو اس وقت بہت تیزی سے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی زبان بنتی جارہی ہے۔

اب سماجی علوم کا لفظ ذہن پر کیا تصور چھوڑتا ہے جبکہ سوشل سائنسز کہو تو جیسے پورا ذہن روشن ہو جاتا ہے۔ اب سرقہ کہیں تو صرف اردو معلی والوں کو سمجھ آتا ہے اور پلیجرزم کہیں تو سب کو سمجھ آجاتا ہے اور پروفیسروں کو تو کچھ زیادہ ہی۔ ذہنی تناؤ کے لفظ کو سمجھنے کے لیے ذہن پر دباؤ ڈالنا پڑتا ہے لیکن ٹینشن کا لفظ ابھی متکلم کی زبان پر ہی ہوتا ہے تو فوراً معنی ذہن میں منتقل ہو جاتا ہے۔ عام پڑھے لکھے فرد کو نفسیات اور معاشیات کے الفاظ سے وہ معانی نہیں پہنچتے جو سائیکالوجی اور اکنامکس کہنے سے منتقل ہوتے ہیں۔

میں بعض اوقات اپنی تحریروں میں جان بوجھ کر انگریزی لفظ استعمال کرتا ہوں کہ میری نظر میں اس سے معنی زیادہ منتقل ہوتا ہے۔ ہماری زبان میں انگریزی الفاظ کا یہ استعمال اس قدر عام ہو چکا ہے کہ اب ان الفاظ کی اردو بنانا یا تو تکلف ہے۔ اور اگر اردو متبادل ہے بھی تو وہ اتنا بلیغ نہیں رہا کہ بلاغت ہمیشہ اسی لفظ میں ہوتی ہے جو رائج ہو اور جس کے استعمال سے لوگوں کے ذہن میں تصورات روشن ہوں اور تخیلات پروان چڑھیں۔

اردو تو ویسے بھی مختلف زبانوں کا مجموعہ ہی ہے۔ اس میں پہلے ہی عربی، فارسی، سنسکرت اور ترکی وغیرہ جیسی زبانوں کے الفاظ کی کثرت ہے بلکہ اردو خود ترکی زبان کا لفظ ہے تو اب اگر انگریزی کے الفاظ بھی قبول کر لیے جائیں گے تو اس کی بلاغت میں اضافہ ہی ہو گا نہ کہ کوئی کمی۔ آج بھی اگر ہم انگریزی لفظ کا اردو میں ترجمہ کرنا چاہیں گے تو اس کی عربی یا فارسی ہی بنائیں گے جیسے بلڈ پریشر کو بلند فشار خون کہہ دیا۔ تو لینا تو ہم نے

ادھار ہی ہے، انگریزی سے نہ سہی عربی اور فارسی سے سہی۔

بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں اس زبان کو رواج دینا چاہیے کہ جس میں بیس فی صد انگریزی شامل ہوتی ہے اور یہی اردو ہمارے پڑھے لکھے طبقے اس وقت استعمال کر رہے ہیں۔ اب تو کچھ اردو ناول نگار چھوٹے چھوٹے جملے بھی انگریزی میں ہی لکھنا شروع ہو گئے ہیں جیسے واٹ آ نان سینس وغیرہ۔ بہر حال اہل زبان میں اب ایسی کوئی مقتدر کمیٹی تو موجود نہیں ہے جو ایسے فیصلے کرے یا اس کے فیصلوں کو کوئی اہمیت حاصل ہو لہذا لکھاریوں نے ہی یہ فیصلہ کرنا ہے اور زبان کا رخ متعین کرنا ہے۔ واللہ اعلم

ایک دوست نے اس تحریر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ویسے میں سوچ رہا تھا کہ اس پر لکھوں کہ اگر کوئی لکھاری اس لیے لکھ رہا ہے کہ اس کی بات یا پیغام عام لوگوں تک پہنچے تو اُسے اسی زبان میں لکھنا چاہیے جو زبان عام طور پر بولی سمجھی جاتی ہے۔ کچھ افرد کی تحریر پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فیروز الغات کا جدید ترین ایڈیشن سامنے رکھ کر الفاظ چھانٹ چھانٹ کر پڑھنے والے کی طرف گولے کی طرح داغے گئے ہیں۔ ایسی تحریر پڑھنے کے بعد مجھ جیسا بندہ خود کو طالب علم کم اور زخمی زیادہ سمجھتا ہے۔ اور خود کو سمجھاتا ہوں کہ طفلِ مکتب کے لیے تحریر نہیں تھی بلکہ بابائے مکتب کے لیے لکھی گئی تھی۔

ایک اور ریڈر نے یہ تبصرہ کیا کہ میری بہترین تحریر، جس نے قارئین کے دلوں کو چھوا، ہمیشہ وہی رہی ہے جسے میں نے ویسے ہی لکھ دیا جیسے میں بولتی ہوں۔ جب بھی رائج انگریزی الفاظ کے متبادل ڈھونڈ ڈھونڈ کر یا سوچ سوچ کر تحریر میں فٹ کیے، تحریر خود میرے لیے ہی نامانوس ہو گئی۔ سو باتوں کی ایک بات کہ بہترین ابلاغ انہی الفاظ سے ممکن ہے جو رائج ہوں۔ اب ہمیں اس بات کو سمجھ لینا چاہیے، مان لینا چاہیے، اردو کا ظرف بہت وسیع ہے لہذا کسی بھی تحریر کو محض یہ کہہ کر رد نہیں کر دینا چاہیے کہ انگریزی الفاظ کا غیر ضروری استعمال کیا گیا ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ مزید انگریزی الفاظ کو اردو میں تیزی سے در آنے کا موقع نہ دینے کی تراکیب بھی سوچنی چاہئیں۔

عربی زبان میں بہتری کیسے لائی جائے؟

بعض دوست سوال کرتے ہیں کہ ہم عربی زبان میں اپنی صلاحیت اور استعداد بڑھانا چاہتے ہیں تو اس کا کیا طریقہ ہے؟ جواب: بھائی، اگر آپ نے عربی زبان کی مناسب گرامر پڑھ رکھی ہے تو اب آپ زیادہ سے زیادہ عربی متن کا مطالعہ کریں، چاہے سمجھ میں آئے نہ آئے، چاہے حرکات اور اعراب درست پڑھ رہے ہوں یا غلط۔

اور مناسب عربی گرامر سے مراد اتنی عربی گرامر کہ جتنی چرتھالوی صاحب کی کتابوں علم الصرف اور علم النحو میں ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ یہ بھی کافی زیادہ عربی گرامر ہے اور اس سے زیادہ عربی گرامر تو وقت کا ضیاع ہے، بس۔ پس اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ گرامر پر گرامر پڑھنے سے آپ کی عربی بہتر ہو جائے گی تو یہ سوچ غلط ہے۔ اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ لغت کو رٹا لگانے سے آپ کی عربی زبان کی استعداد بڑھ جائے گی تو یہ بھی غلط ہے۔

حل وہی ہے جو میں نے عرض کیا ہے کہ آپ آج سے عہد کر لیں کہ آئندہ رات اس وقت تک سوئیں گے نہیں جب تک کہ روزانہ عربی زبان میں چالیس صفحات کا مطالعہ نہ کر لیں۔ اور ایسا ایک سال تک کر لیں تو پھر دیکھیں کہ آپ کی عربی بہتر ہوتی ہے یا نہیں۔ عربی زبان کو بہتر بنانے کا ایک ہی حل ہے کہ عربی میں مطالعہ کریں اور زیادہ سے زیادہ کریں۔

اور اس سے نہ گھبرائیں کہ آپ حرکات غلط پڑھیں گے۔ دیکھیں، حرکات تو ہم اردو زبان میں بھی غلط پڑھتے ہیں لیکن سب سمجھتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے کوشش کی کہ اپنی اردو زبان کو بہتر بناؤں تو عام بول چال کے الفاظ کے صحیح تلفظ کے لیے اردو لغت دیکھنے لگا۔ اور جب قلِعہ، جسے ہم زیر سے پڑھتے ہیں، کو قلعہ کہا یعنی زبر کے ساتھ، اور ہرِن کہ جسے ہم زیر کے ساتھ پڑھتے ہیں، ہرَن یعنی زبر کے ساتھ کہنا شروع کیا تو اکثر لوگ سوال کرتے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تو میں ایک دوسری مشکل میں پڑ گیا۔

عام عربی عبارت کوئی قرآن مجید نہیں ہے، بعض اوقات ہم اپنی اردو زبان میں

حرکات غلط پڑھ جاتے ہیں تو عربی میں بھی پڑھ لیا تو کچھ گناہ نہیں ہو گا البتہ تصورات (concepts) واضح رہنے چاہییں، ان میں غلطی نہ ہو کہ آپ بات کو صحیح طور سمجھ رہے ہیں کہ مصنف کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ حرکات اور اعراب کی غلطیوں میں بھی کمی آتی رہتی ہے۔ اور اگر آپ کا مقصد کتاب کا لغوی، صرفی اور نحوی حل (grammatical analysis) ہے تو آپ کی رفتار بہت کم ہو جائے گی اور اصل مقصد بھی فوت ہو جائے گا اور وہ مقصد مصنف کی بات کو سمجھنا ہے۔

دوسری زبان (second language) کیا، اپنی مادری زبان کو بھی ہم اسی طرح سیکھتے ہیں۔ کیا ہم انگریزی جاننے کے باوجود بولتے اور پڑھتے وقت اس میں تلفظ اور لہجے کی غلطیاں نہیں کرتے؟ بہت کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم انگریزی میں لکھی ہوئی اور سنی ہوئی بات سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ آپ عربی عبارت پڑھتے ہوئے حمام، بغیر تشدید کے، کو حمّام یعنی تشدید کے ساتھ، پڑھ دیں گے۔ کوئی حرج نہیں جب تک کہ جملے کا مفہوم واضح ہے۔ اور بعض لیکچرز میں ایسا تجربہ کر کے دیکھا جائے کہ بغیر غور کیے تیزی سے عربی متن کا مطالعہ کیا جائے اور اصل زور ترجمے پر رکھا جائے تو غلط اعراب اور حرکات پڑھ کر بھی طالب علم کو ساری بات اسی طرح سمجھ میں آ رہی ہو گی جتنا کہ صحیح اعراب اور حرکات پڑھ کر بشرطیکہ ترجمہ درست ہو۔ تو یہ سب باتیں عربی سیکھنے کے لیے بطور تجربہ ذکر کر دی ہیں نہ کہ یہ کوئی پڑھنے پڑھانے کا مستقل منہج یا کرنے کا کام ہے۔

اور خاص طور اگر آپ کلاسیکل ٹیکسٹ کا مطالعہ کر رہے ہیں تو اس میں قدیم ناموں میں حرکات لگانا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ نام آج کل معروف نہیں ہیں۔ آپ شبَابہ کو شبّابہ، سوّار کو سوَار، شمْر کو شمَر پڑھ جائیں گے لیکن بس پڑھتے جائیں کہ رک رک کر نہیں بلکہ مسلسل پڑھنے سے عبارت بہتر ہو گی۔ البتہ اتنی صلاحیت پیدا کر لیں کہ اگر کوئی روک کر پوچھ لے تو غور کر کے صحیح حرکات اور اعراب بتلا سکیں یا کہیں سے دیکھ کر بتلا سکیں۔ مثلاً اگر تو نام ہیں تو "سير أعلام النبلاء" دیکھ لیا کریں کہ فوراً حرکات

معلوم ہو جائیں گی اور اگر عام الفاظ ہیں تو کوئی معروف لغت مثلاً "المعجم الوسیط" وغیرہ دیکھ لیا کریں۔

اردو گالی: لسانی، نفسیاتی، معاشرتی اور مذہبی تناظر میں

گالی کا لفظ "پراکرت" زبان کا ہے جو کہ ایک رائے کے مطابق "سنسکرت" کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور اس کا معنی فحش گفتگو کرنا ہے۔ گالی کا معنی تو یہی ہے لیکن چونکہ اس کا مقصد مخاطب کو ذلیل اور رسوا کرنا ہوتا ہے لہذا ایسے الفاظ بھی گالی کہلانے کے مستحق ہیں کہ جن سے مقصود مخاطب کی تذلیل اور تحقیر ہو۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ کسی بھی زبان میں اکثر وبیشتر معروف گالیاں، فحش کلام پر ہی مشتمل ہوتی ہیں لیکن ہر گالی میں فحش کلام نہیں ہوتا۔

کہا جاتا ہے کہ پنجابی زبان، گالیوں میں بہت فصیح اور بلیغ ہے لیکن اس بات میں مبالغہ ہے کہ اول تو پنجابی کی گالیاں، اردو سے ماخوذ ہیں۔ اور خود اردو زبان میں جو گالیاں دی جاتی ہیں، وہ اکثر وبیشتر دوسری زبانوں سے ماخوذ ہیں اور بہت کم ایسی ہیں کہ جنہیں آپ عرفی یا عامی زبان (slang) کہہ سکتے ہیں۔ البتہ یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہیں کہ ہم اردو بولنے والے گالی کی ایجاد میں بہت ہی خلاق (creative) صلاحیتوں کے مالک ہیں کہ چاہیں تو "ٹریکٹر ٹرالی" کے الفاظ کو نسبت عطا فرما کر گالی بنادیں۔

اردو میں گالی یا تو دوسری زبان سے ماخوذ ہے تو یہ تو لغت کا حصہ بن گئی کہ جس کا اصل ہم لغت سے معلوم کر سکتے ہیں۔ یا پھر گالی عامی زبان میں ہو گی اور عامی زبان کبھی بھی تحریر کا حصہ نہیں ہوتی بلکہ محلے گلی کا کلچر ہوتا ہے لہذا اس کے معانی لغات میں تلاش کرنا بے وقوفی شمار ہوتا ہے جیسا کہ لفظ "دل...." کہ یہ عامی زبان (slang) ہے کہ جس کا معنی "دیوث" ہے یعنی بے غیرت کہ جو اپنی گھر کی عورتوں کے معاملے میں غیر محرم مردوں پر غیرت نہ کھاتا ہو۔

کہا یہ جاتا ہے کہ اردو اور پنجابی گالیاں محرم سے زنا (incest) کے گرد گھومتی ہیں لیکن یہ بات بھی درست نہیں ہے۔ ایسا دعوی کرنے والے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اردو

بولنے والوں کے لاشعور میں محرم سے زنا کی خواہش کس قدر موجود ہے کہ اسے گالیوں سے پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ معروف اردو اور پنجابی گالیوں کا مفہوم زنا کی نسبت رکھتا ہے کہ گالی کا معنی ہی فحش گفتگو ہے لہذا معروف گالی وہی ہوتی ہے کہ جس میں زنا کا تصور شامل ہو۔

اور اس سے پہلے کہ کوئی سایئکالوجسٹ اس کی وجہ اردو سپیکنگ سوسائٹی کے لاشعور کی ان دیکھی جنسی خواہشات بتلانا شروع کر دے، ہم یہ واضح کر دیں کہ اس کی وجہ دوسرے پر غالب آنے کی خواہش ہے اور دوسرے پر غلبہ، اس کو نیچا کر کے یعنی اس کی تحقیر اور تذلیل سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اور تحقیر اور تذلیل میں مبالغہ فحش گوئی کی صورت ممکن ہوتا ہے۔ مجھے اپنے ماحول یعنی یونیورسٹی، بازار وغیرہ میں جو گالی سب سے زیادہ سننے کو ملتی ہے، وہ "...چود" ہے کہ جس کا معنی بہن سے زنا کرنا ہے۔ یہ شاید اردو اور پنجابی زبان کی معروف ترین گالی ہے اور یہی وہ واحد گالی ہے کہ جس میں محرم سے زنا کا تصور شامل ہے۔

اسی طرح اردو اور پنجابی کی دوسری معروف گالی "...تیا" سنسکرت زبان کا لفظ ہے اور اس کا معنی بیوی کے زنا کی کمائی کھانے والا ہے اور تیسری معروف گالی "...امی" یا "...زادہ" تو واضح ہے کہ حرام کی اولاد کے معنی میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ غالب نے کسی کو گالی کے آداب سکھاتے ہوئے کہا تھا کہ بچے کو ماں، جوان کو بہن اور بوڑھے کو بیٹی کی گالی دینی چاہیے۔

اگر تو غالب نے ایسا کہا تھا تو بہت ہی بے کار بات کہی تھی اور میں مذہبی اعتبار سے بے کار نہیں کہہ رہا بلکہ معاشرتی اور نفسیاتی پہلو سے کہہ رہا ہوں۔ غالب کا خیال تھا کہ گالیاں سن کر ان پر غیرت کھانے والے، گالی کے معانی کی وجہ سے غیرت کھاتے ہیں حالانکہ یہ بات مشاہدہ کے خلاف ہے۔ اکثر و بیشتر لوگ معروف گالیوں پر ان الفاظ کے عرف میں گالی ہونے کی وجہ سے ان پر غیرت کھاتے ہیں ورنہ تو اکثر کو ان گالیوں کے معانی کا علم تک نہیں ہوتا، خاص طور بچوں کو۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہر شخص کا کبھی نہ کبھی گالی دینے کو دل ضرور کرتا ہے اور بچوں میں یہ جبلت بہت غالب ہوتی ہے۔ ہماری رائے میں یہ کہنے میں حرج تو نہیں ہے کہ انسان میں بہت سی جبلتیں ہیں جو کہ اپنی تسکین چاہتی ہیں اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب کسی سے انسان کی لڑائی یا اختلاف ہو یا اس سے تکلیف اور اذیت پہنچے تو انسان بدلہ لے اور اس بدلے لینے کی خواہش میں وہ دوسرے کی اسی طرح تحقیر اور تذلیل چاہتا ہے جیسا کہ دوسرے نے اس کی تحقیر اور تذلیل کی ہے۔ پس گالی انسانی جبلت میں اتنی ہی موجود ہے اور جو اس سے زائد ہے تو وہ ظلم ہے اور ظلم، ظالم کی صفت تو ہو سکتی ہے، انسان کی نہیں۔

مذہبی پہلو سے گالی دینا حرام ہے کہ کسی مسلمان یا انسان کی تحقیر اور تذلیل جائز نہیں ہے جیسا کہ صحیح بخاری کی روایت کے الفاظ ہیں کہ مسلمان کو گالی دینا، گناہ کا کام ہے۔ اور گالی کے اخلاقی گراوٹ ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں ہے لہذا اخلاقاً بھی ممنوع ہے کہ کسی انسان کی تحقیر اور تذلیل کو کون جائز کہہ سکتا ہے؟ البتہ کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ گالی اگر پیار سے دی جائے تو کیا پھر بھی حرام ہے؟ تو اس کا جواب ہے کہ تب بھی حرام ہے کہ اس میں اکثر و بیشتر فحش گفتگو ہوتی ہے اور مومن کبھی فحش گفتگو نہیں کرتا۔ یا پھر گالی میں تذلیل ہوتی ہے، چاہے اپنے دو سال کے بچے کو ہی پیار سے "کتا" کہہ دے لیکن انسان کی نہ سہی تو انسانیت کی تذلیل تو ہے ہی۔

البتہ شریعت میں یہ جائز ہے کہ اگر کوئی گالی دے تو اس کو جواب میں گالی دی جا سکتی ہے جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ اگر دو لوگ ایک دوسرے کو گالی دیں تو گناہ ابتداء کرنے والے پر ہو گا جب تک کہ دوسرا جوابی گالی میں زیادتی نہ کرے۔ البتہ جوابی گالی میں یہ ملحوظ رہے کہ فحش گالی سے اجتناب کرے کہ سنن ترمذی کی روایت کے مطابق مومن فحش گو نہیں ہوتا۔ اور اگر کسی نے فحش گالی دی ہے تو اسے "تم خود ایسے" (same to you) جیسے الفاظ سے اس پر لوٹایا جا سکتا ہے لیکن یہ بھی اجازت ہے جبکہ مستحب عمل یہی ہے کہ گالی کے جواب میں گالی نہ دے۔

اسلام میں حلال

حرام امور ہم نے معاشروں کو بہت بتلا دیے، اب وہ اسلام میں حلال کے بارے میں کچھ سننا چاہتے ہیں۔ اصلاح معاشرہ کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ لوگوں کو منبروں پر حلال بتلانا شروع کر دو، حرام کم ہو جائے گا، ان شاءاللہ۔ اسلام میں حلال کے عنوان سے کتابیں لکھنے سے، چاہے علم میں اضافہ نہ بھی ہو، لیکن نفس کو نفسیانی تسکین ضرور ملے گی۔

اسلامی معاشرے میں کیک کھانے کے حلال مواقع پیدا نہیں کرو گے تو لوگ "کرسمس کیک" کو ہی حلال کریں گے۔ اسی سے تو لوگوں کو غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ مولوی ہر وقت حرام حرام ہی کرتے رہتے ہیں، کچھ حلال بھی ہے اسلام میں؟ تو ان کی نفسیانی تسکین کے لیے ضروری ہے کہ حلال حلال کیا جائے۔

کیک کھانے کے مواقع پیدا کرنے سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہم اس دن میں کیک کاٹنے، کھانے اور کھلانے کی ترغیب دیں کہ جس دن عیسی ابن مریم علیہ السلام کے بندہ اور اللہ کے رسول ہونے اور اللہ کا بیٹا نہ ہونے کے بارے میں قرآن مجید کی آیات نازل ہوئیں۔ یہ ایک رائے کا اظہار ہے، کوئی اصرار نہیں کہ ایک غلط رسم کو ختم کرنے کے لیے ایک ایسی رسم کا آغاز کریں کہ جس سے صحیح فکر کو فروغ ملے۔ اسلام نئی رسمیں پیدا کرنے سے منع نہیں کرتا البتہ خلاف شریعت رسموں سے منع کرتا ہے۔ رسم کا علاج رسم سے ہی بہتر طور ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم

قوم کے سیاسی لیڈر

دوست کا کہنا ہے کہ کبھی کبھار کوئی سیاسی تجزیہ بھی کر دیا کریں۔ میں نے کہا کہ کیا پوچھنا ہے؟ اس نے کہا کہ ملک کی بڑی سیاسی جماعتوں کے لیڈران کے بارے آپ کا کیا موقف ہے؟ میں نے کہا کہ جب بھی ان میں سے کسی کا خیال آتا ہے تو اس کے ساتھ ہی ایک لفظ ذہن میں آ جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ لفظ کیا ہے؟

میں نے کہا کہ ہر ایک کے بارے میں ایک ہی نہیں بلکہ علیحدہ سے لفظ ذہن میں آتا

ہے اور خود سے ہی آ جاتا ہے، یعنی سوچنا بھی نہیں پڑتا۔ اس لیے میں اسے اپنا کوئی سیاسی تجزیہ نہیں کہوں گا بلکہ یہ حالات کا جبری تجزیہ ہے کہ اگر کسی جماعت کا تعصب نہ ہو تو اس کی طرف کسی پاکستانی کا ذہن خود بخود سے چل پڑتا ہے۔

اس نے کہا کہ کس جماعت کے کس لیڈر کے بارے کیا لفظ ذہن میں آتا ہے؟ میں نے کہا کہ میں لیڈر کا نام تو نہیں بتاؤں گا کہ یہ سیاسی تجزیہ تو ہے نہیں بلکہ ذہن کا خیال ہے اور وہ بھی خودکار۔ پس لیڈر کا تعین آپ نے خود کرنا ہے اور الفاظ یہ ہیں: کاہل، کمینہ، بے وقوف، قاتل اور مطلبی۔

اس نے کہا کہ کسی جماعت سے آپ کی سیاسی وابستگی ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں کسی جماعت کو اس قابل نہیں سمجھتا۔ البتہ ووٹ جماعت اسلامی کو کاسٹ کرتا ہوں۔ اس نے کہا کہ ان حالات میں کرنے کا اصل کام کیا ہے؟ میں نے کہا دعا کریں کیونکہ لگتا ہے کہ ہماری تقدیر میں یہی لوگ ہیں۔ اس نے کہا کہ کیا دعا کریں؟ میں نے کہا کہ اللہ عزوجل کاہل کو کام کرنے کی توفیق دے، کمینے سے جان چھڑائے، بے وقوف کو عقل دے، قاتل کو مقتول بنائے اور مطلبی کو ہدایت دے۔[1]

سائل نے کہا کہ آپ نے اس عنوان کو "لسانیات اور نفسیات" کے باب میں کیوں رکھا ہے؟ یہ تو سیدھا سادھا سیاست کا موضوع ہے۔ میں نے کہا: اس لیے کہ لوگ لفظ سے وہ بھی جاننا سیکھ لیں جو وہ عموماً نہیں جان پاتے۔ کسی متن کا عمومی موضوع تو سب کو نظر آتا ہے، کمال تو یہ ہے کہ متن کا وہ موضوع بھی دیکھ لیں کہ جو سامنے نظر نہیں آ رہا۔

سائل نے کہا کہ کیا میں آپ کے الفاظ "اللہ عزوجل کاہل کو کام کرنے کی توفیق

---

[1] فرینڈز لسٹ میں بہت سے لوگ سالہا سال سے سوئے پڑے ہیں، تو انہیں جگانے کے لیے یہ پوسٹ لگائی گئی ہے کہ لاہور آ گیا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ فرینڈز لسٹ میں سینکڑوں لوگ قطار میں لگے ہیں، گاڑی میں سیٹ خالی نہیں ہے اور پلیٹ فارم پر رش لگا ہو۔ پس ایسے لوگ کہ جن کی کسی سیاسی لیڈر کے ساتھ جذباتی وابستگی ہو، ان کے لیے اسٹیشن چھوڑنے کے مواقع پیدا کیے جا رہے ہیں تا کہ دوسرے لوگوں کو جگہ مل سکے۔ اور بظاہر یہ سب بے کار اور لایعنی گفتگو ایسے لوگوں کے شعور کی تربیت کے لیے کی گئی ہے کہ جنہوں نے شعور انسانی کی ورکنگ کے بارے میں کبھی زیادہ سوچا نہیں ہے۔

دے، کمینے سے جان چھڑائے، بے وقوف کو عقل دے، قاتل کو مقتول بنائے اور مطلبی کو ہدایت دے" سے یہ بات نکال سکتا ہوں کہ آپ صرف تین سیاسی پارٹیوں کی بقا چاہتے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ نواز شریف اپنی کارکردگی بڑھائے، عمران خان حماقتیں کم کرے، فضل الرحمن اپنی اصلاح کرے۔ اور رہی بقیہ دو پارٹیاں تو ایم کیو ایم مقتول ہو جائے یعنی اسے جبراً بھی ختم کرنا پڑے تو ختم کر دیا جائے اور پیپلز پارٹی سے جان چھوٹ جائے کہ از خود مر جائے۔ میں نے کہا کہ متن کے شارح یہی کام کرتے ہیں لیکن متکلم کا کلام اپنی اصل میں زیادہ بڑے معانی لیے ہوتا ہے کہ جنہیں شرح و بیان کی تنگنائے میں داخل کرنا مناسب نہیں ہے۔ اور میں نے یہ نہیں کہا کہ درست نہیں ہے بلکہ یہ کہا ہے کہ مناسب نہیں ہے۔

سائل نے کہا کہ الفاظ میں بڑے معانی کب پیدا ہوتے ہیں؟ میں نے کہا کہ جب تعصب ختم ہو جائے تو آپ کا کلام بڑے معانی پیدا کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس نے کہا کہ کیا متکلم کا کوئی کمال نہیں ہے اس میں؟ میں نے کہا کہ کچھ ایسا ہی ہے۔ سائل نے کہا کہ تعصب کا لفظ سے کیا تعلق؟ میں نے کہا کہ تعصب، کلام کے معانی محدود کر دیتا ہے اور جس قدر کم ہو گا، اس قدر آپ کے کلام کا معنی بڑھ جائے گا۔ اور جس قدر آپ کے کلام کا معنی بڑا ہو گا، اس قدر آپ کی بات بڑی ہو گی۔ اور جس قدر آپ کی بات بڑی ہو گی، اس قدر آپ بڑے ہوں گے۔ سائل نے کہا کہ کوئی بڑا آدمی؟ میں نے کہا کہ حسن عسکری۔ سائل نے کہا کہ دانشور کون ہے؟ میں نے کہا کہ "میں"۔ سائل نے کہا کہ "میں" سے کیا مراد ہے؟ میں نے کہا کہ اس کی وضاحت سے کلام چھوٹا ہو جائے گا۔

لسانیات اور نفسیات

دوست نے کہا کہ ادب و زبان کا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اچھے رائٹرز نہیں رہے۔ میں نے یہ ایک المیہ ہے کہ بڑے لکھاری نہیں رہے لیکن زیادہ بڑا المیہ یہ ہے کہ ریڈرز چھوٹے ہو گئے ہیں۔ اس نے کہا کہ "چھوٹا ریڈر" کون ہے؟ میں نے کہا وہ جو تحریر میں مصنف کی شخصیت کا عکس تلاش کرے۔ اس نے کہا اور بڑا ریڈر؟ میں نے کہا جو تحریر میں انسان کو

ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کرے۔

اس نے کہا کہ موجودہ دور میں لکھنے لکھانے کے فن کا اصل المیہ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ سو میں سے نوے لکھ رہے ہیں اور دس پڑھنے والے ہیں۔اس نے کہا کہ اس کا حل کیا ہے؟ میں نے کہا کہ اچھے لکھاری کو چاہیے کہ اپنا اسپیکر وقفے وقفے سے بند کر لیا کرے اور بقیہ اناسی اسپیکروں سے آنے والی آوازوں کو ایک ساتھ سن کر اپنی حماقت پر کچھ دیر ہنس لیا کرے کہ اتنے اسپیکروں کی آوازوں میں میرے اسپیکر کی آواز کتنے لوگوں تک پہنچ سکتی ہے؟ اس نے کہا کہ اچھا لکھاری کون ہے؟ میں نے کہا کہ جو اپنے لیے لکھے یا اپنے جیسے دو چار لوگوں کے لیے۔

معاشرت اور نفسیات

دوست کا کہنا ہے کہ بیوی سے بن نہیں پا رہی، کیا کروں؟ کچھ سمجھ نہیں آ رہی، یہ بھی نہیں معلوم کہ مجھے اس سے کوئی تعلق ہے بھی یا نہیں؟ روز روز کی لڑائی سے تنگ آ گیا ہوں، بار بار علیحدگی کا سوچتا ہوں، آپ ہی مشورہ دیں کیا کروں؟ میں نے کہا کہ بھائی بیوی وہ ہے کہ جسے تم یہ کہہ سکو کہ "تمہارے ساتھ رہنا مشکل ہے اور تمہارے بغیر رہنا مشکل تر۔" بس جب تک یہ کہہ سکتے ہو تو تمہارا اپنی بیوی سے تعلق آئیڈیل ہے، علیحدگی کے بارے میں سوچنا بھی مت۔

اس نے کہا کہ یہ تو ممکن نہیں ہے کہ علیحدگی کے بارے سوچوں بھی ناں۔ جب جب لڑائی ہوتی ہے تو یہی خیال آتا ہے کہ شاید اب کے ساتھ رہنا ممکن نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ انسانی نفسیات یہی ہے کہ اسے پہلا حل تعلق توڑنے میں ہی نظر آتا ہے اور اگر تعلق توڑنے کا حوصلہ نہ کر پائے تو جوڑنے پر ہی صبر کر لیتا ہے۔اس نے کہا کہ ہم تعلق توڑ کر اپنا مسئلہ حل کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا کہ جہاں تعلق سچا اور گہرا ہو، وہاں لڑائی میں تکلیف اور اذیت بڑھ جاتی ہے، انسان تعلق توڑ کر اس تکلیف اور اذیت سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔

جنسیات اور نفسیات

دوست کا کہنا ہے کہ اپنے سے ہائی اسٹیٹس کی لڑکی سے شادی کرنے میں کوئی مسئلہ تو نہیں، ڈر لگ رہا ہے۔ میں نے کہا اب آپ نے مشورہ مانگ ہی لیا ہے تو کچھ عرض کیے دیتا ہوں: "اگر اپنے سے ہائی اسٹیٹس کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو تو اپنی جنسی ضرورت پوری کرنے کے لیے ایک لونڈی ضرور خرید لینا۔ ہاں، البتہ وہ تمہاری کچھ دوسری ضرورتیں ضرور پوری کر دے گی مثلاً مال کی ضرورت، سوشل اسٹیٹس کی ضرورت وغیرہ وغیرہ"

اس نے کہا کہ کیا اپنے سے بہت زیادہ لو اسٹینڈرڈ کی لڑکی سے شادی کرنی چاہیے؟ میں نے کہا کہ اگر ایسا کیا تو اس سے ازدواجی تعلق قائم کرنے کی خواہش بھی نہ کر پاؤ گے۔ تو اس نے کہا کہ پھر کیا کروں؟ میں نے کہا کہ اپنے اسٹینڈرڈ کی لڑکی سے شادی کرو اور اسی بات کو فقہاء نے یوں بیان کیا ہے کہ "کفو" میں شادی کرو یعنی اس سے شادی کرو جو تمہارے ہم پلہ ہو؛ سوشل اسٹیٹس میں، حسن وجمال میں، ذہنی سطح میں، اور مال ودولت میں۔

خوابوں کی دنیا

لوگ اپنے مطالعہ اور مزاج کی بدولت مختلف چیزوں میں تجسس رکھتے ہیں۔ کسی کو خدا کے بارے کھوج ہے تو کسی کو کائنات کے راز تلاش کرنے میں دلچسپی۔ مجھے سب سے زیادہ تجسس خوابوں کی دنیا کے بارے رہا ہے بلکہ ابھی تک ہے کہ یہ کیا دنیا ہے کہ جس میں ہم پہنچ جاتے ہیں اور اس دنیا کے کرداروں کی کیا حقیقت ہے؟

ڈیکارٹ کا کہنا تھا کہ جب میں جاگ رہا ہوتا ہوں تو مجھے یہ دنیا حقیقی لگتی ہے اور جب سو رہا ہوتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ خواب کی دنیا حقیقی ہے۔ اس حد تک تو بات ٹھیک ہے کہ دوران خواب وہ دنیا حقیقی لگتی ہے لیکن میں بہر حال ڈیکارٹ کی طرح اتنا عقلمند واقع تو نہیں ہوا کہ جاگنے کے بعد بھی اس شبہے میں پڑ جاؤں کہ ان دونوں میں سے کون سی دنیا حقیقی ہے؟

مذہب، تصوف اور نفسیات تینوں میں اس بارے کچھ باتیں موجود ہے۔ مثلاً قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ خواب میں ہماری روح ہمارے جسم کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ اب یہ روح جاتی کہاں ہے؟ واللہ اعلم۔

تصوف والوں کا خیال ہے کہ شاید عالم مثال میں جاتی ہے حالانکہ عالم مثال کی تو تعریف ہی یہ ہے کہ وہ آئیڈیل دنیا ہے۔ اور خواب میں ہمیں جس دنیا کا مشاہدہ ہوتا ہے، وہ ناقص ہوتی ہے، بالکل ہماری دنیا کی طرح۔ اور اسی طرح یہ عالم برزخ بھی نہیں ہو سکتا کہ ہمارے خواب کے سارے کریکٹر فوت شدگان نہیں ہوتے ہیں۔

ماہرین نفسیات میں سے فرائڈ وغیرہ کا خیال ہے کہ یہ لاشعور کی دنیا ہے لیکن بہت دفعہ مجھے یا کسی دوسرے شخص کو یہ تجربہ ہوتا ہے کہ وہ خواب میں کوئی ایسا واقعہ دیکھتے ہیں جو مستقبل میں اسی طرح واقع ہو جاتا ہے جیسا کہ خواب میں دیکھا ہوتا ہے تو لاشعور مستقبل کے واقعات تک کیسے رہنمائی کر سکتا ہے؟ جبکہ شعور یہی کام حالت بیداری میں نہیں کر سکا۔

یہاں بھی فرائیڈ نے ایک تھیوری لگائی ہے کہ یہ اصل میں سوتے میں لاشعور کا ہمارے مستقبل کے بارے تجزیہ ہوتا ہے جو کہ درست ثابت ہوتا ہے۔ فرائڈ کی یہ بات بعض خوابوں کے بارے شاید درست ہو لیکن مستقبل کے بارے ہر خواب ایسا نہیں ہوتا ہے کہ لاشعور سوتے میں اس کا اس قدر مہارت سے تجزیہ کر سکے کہ وہ وحی کا علم معلوم ہونے لگے۔

میں دراصل اس حوالے سے کوئی تخلیقی کام کرنا چاہتا ہوں تو اگر کسی بھائی کے مطالعہ میں اس حوالے سے کچھ لٹریچر ہو تو ضرور شیئر کریں۔ اور واضح رہے کہ میرا اصل مسئلہ خوابوں کی دنیا ہے نہ کہ خوابوں کی تعبیر۔ یعنی خواب میں ہم جہاں پہنچ جاتے ہیں، یا جن لوگوں سے ملتے ہیں، یا جو کچھ کام کرتے ہیں، اس کی کیا حقیقت ہے؟ اس بارے لوگوں کے کیا خیالات رہے ہیں یا ہیں، وہ جاننا چاہ رہا ہوں۔

خوابوں کی اہمیت

خواب دیکھنا بہت ضروری ہے، جاگتے میں بھی اور سوتے میں بھی۔ اور جو خواب نہ دیکھے، وہ صحت مند نہیں، بیمار ہے۔ ٹھیک ہے خوابوں کی دنیا میں رہنا درست نہیں ہے لیکن کبھی کبھی زندہ رہنے کے لیے خوابوں میں رہنا بہت ضروری ہو جاتا ہے۔ نہ تو آپ کا ہر خواب جھوٹا ہے اور نہ ہی ہر خواب سچا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ رویہ بھی درست نہیں ہے کہ ہر الم غلم خواب کی تعبیر بنانا شروع کر دے اور یہ بھی درست نہیں ہے کہ ہر اچھے خواب کی نسبت شیطان یا نفس کی طرف کر دے۔

میں بہت عرصے تک اس رویے میں مبتلا رہا کہ ہمیشہ اچھے خوابوں میں شک کرو کہ یہ شیطان یا نفس کی طرف سے ہے تاکہ انسان اپنی اوقات میں رہے۔ اور شاید یہ خوابوں کی دنیا میں رہنے والوں کا رد عمل تھا یا اہل حدیث ہونے کا اثر لیکن چونکہ اپنے رویے ریوائز کرتا رہتا ہوں تو اب محسوس ہوتا ہے کہ یہ غلط رویہ ہے۔ بھئی، اگر آپ خدا کے لیے کچھ کر رہے ہو تو خدا اب آپ کی طرف فرشتہ بھیج کر تو بتلانے سے رہا[1] کہ وہ آپ سے راضی ہے، وہ خواب ہی کے ذریعے تو آپ کو تسلی دے گا۔

پس وہ اچھے خواب جو آپ خود اپنے بارے میں دیکھتے ہیں یا آپ کے چاہنے والے آپ کے بارے میں دیکھتے ہیں تو اس میں غالب گمان یہی ہے کہ یہ رحمان کی طرف سے ہیں اگرچہ ان کے شیطان یا نفس کی طرف سے ہونے کا امکان بھی ہو سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خوابوں کو مبشرات میں سے شمار کیا ہے کہ یہ مومن کو خوشخبری دینے والی چیزوں میں سے ہیں یعنی اللہ کے اس سے راضی ہونے کی خوشخبری تاکہ وہ مزید شکر گزار بندہ بنے۔ ایک بیٹا اپنے باپ اور شاگرد اپنے استاذ کی طرف کچھ کرنے کے بعد داد طلب نظروں سے دیکھتا ہے تو وہ مبتدی سمجھ کر ضرور اس کی حوصلہ افزائی کر دیتے ہیں تو خدا سے تو اس کی زیادہ امید رکھی جا سکتی ہے اور وہ "شکور" بھی ہے یعنی قدر کرنے والا۔

ضروری تو نہیں ہے کہ انسان اچھے خواب کو رحمان کی طرف سے سمجھ کر بگڑ ہی

[1] وہ بھیج سکتا ہے لیکن یہ اس کی سنت نہیں رہی ہے۔

جائے بلکہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ اسے نعمت سمجھ کر مزید شکر گزار بن جائے۔ رسول اللہ ﷺ ہر روز فجر کی نماز کے بعد مسجد نبوی میں صحابہ کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے اور ان سے ان کے خوابوں کے بارے میں پوچھتے تھے کہ رات کس نے کیا خواب دیکھا؟ اور پھر اس کی تعبیر کرتے تھے۔ مبتدی یعنی اللہ کے رستے پر چلنے کی ابتداء کرنے والے کو تو خوابوں کی بہت ضرورت ہوتی ہے کہ اسی سے اس کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

کہنے کا مقصد یہی ہے کہ خوابوں کی دنیا میں رہنے کا طرز عمل اگر درست نہیں ہے تو ہر اچھے خواب میں شک کرنے کا رویہ بھی غلط ہے۔ آپ کو زندہ رہنے کے لیے اور خاص طور اسلام پر، اچھے خوابوں کی بہت ضرورت ہے، نفسیاتی طور بھی اور دینی طور پر۔ اسی لیے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ نبوت کے اجزاء میں سے صرف خواب باقی رہ گیا ہے، باقی سب کچھ اٹھا لیا گیا ہے۔ آئیں، اپنے اور دوسروں کے اچھے خوابوں پر شک کرنے کے ساتھ شکر کرنا بھی سیکھ لیں۔

خوابوں کی تعبیر

دوست کا کہنا ہے کہ ایک بہن نے سوال کیا کہ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ کہیں سے سفید رنگ کا سانپ پکڑ لیتی ہیں، اور ایک جگہ لکڑیاں جل رہی ہیں تو وہاں سے سانپ کے سر کو آگ لگا لیتی ہیں اور اب اسے دم سے پکڑ کر گھوم رہی ہیں۔ اس خواب کی کیا تعبیر ہے؟

تعبیر کرنے والے خواب میں سانپ سے مراد دشمن لیتے ہیں یعنی وہ شخص جو آپ سے حسد کرتا ہو، یا عداوت رکھتا ہو، یا بغض رکھتا ہو۔ اور سانپ سے مراد ایسا دشمن ہے جو صرف بغض اور حسد نہیں رکھتا بلکہ موقع ملتے ہی آپ کو نقصان پہنچانے کی پوری کوشش بھی کرتا ہے۔ سفید سے مراد یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے نیکی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے یا وہ بظاہر نیک ہے۔

سانپ پکڑنے سے مراد دشمن پر غالب آ جانا ہے اور اس کے سر کو آگ لگانے سے مراد یہ ہے کہ اس پر اس طرح غالب آ جانا کہ اب دوبارہ وہ آپ کو نقصان پہنچانے کے

قابل نہ رہے یعنی جہاں سے اس کے ڈسنے کا امکان تھا، آپ نے اس مقام کو ہی جلا دیا۔ اور دم پکڑ کر ہاتھ میں لیے پھرنے کا مطلب ہے کہ غلبہ پانے کے بعد اب وہ اسے دوسروں کے سامنے عبرت بنا رہی ہیں۔ بہر حال اس آخری معاملے میں یہ مشورہ دیا جا سکتا کہ انہیں نرمی کرنی چاہیے بشر طیکہ خواب کی یہ تعبیر حقیقت حال سے کچھ مناسبت رکھتی ہو۔

ایک اور دوست نے خواب دیکھا کہ ایک شخص ہے کہ جس سے معافی کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور اسے کہا جاتا ہے کہ تمہاری معافی اس صورت قابل قبول ہے کہ تم اپنی گردن خود اتارو۔ وہ شخص اپنی گردن پر چھری چلا دیتا ہے اور اس کا سر ڈھلک کر کندھے پر گر جاتا ہے۔ اب وہ شخص، دوسرے شخص سے کہ جس کے کہنے پر اس نے اپنا سر اتارا ہے، یہ کہہ رہا ہے کہ میرا سر میری گردن پر رکھ دو، یہ جڑ جائے گا اور میں بچ جاؤں گا۔ لیکن دوسرا شخص ایسا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور اس کی خواہش ہے کہ یہ مر جائے۔ اس کی کیا تعبیر ہے۔

یہ قیامت کی نشانیوں میں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے اخلاق اتنے بگڑ جائیں کہ ایک شخص دوسرے سے معافی چاہے گا اور وہ اس کو معاف نہیں کرے گا یہاں تک کہ اس کی جان ہی لے لے۔ اور معافی مانگنے والا اپنی جان بھی لگا دے گا لیکن پھر بھی دوسرا اس سے راضی نہیں ہو گا اور اسے دل سے معاف نہیں کرے گا یا اس کے بارے اپنے دل سے بغض نہیں نکال پائے گا۔

ایک دوست کا کہنا ہے کہ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ان کے والد صاحب جو کہ پندرہ بیس سال پہلے فوت ہو چکے، خواب میں آئے اور ان سے کہنے لگے کہ میں بہت خوش ہوں کہ پہلے بھی تمہاری داڑھی تھی لیکن اب کافی بڑھ گئی ہے۔ خواب میں داڑھی سے عموما مراد دین ہوتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ان کا دین پہلے سے بہت بہتر ہو گیا ہے، اللہ عزوجل استقامت عطا فرمائے اور اس میں مزید اضافہ کرے۔ واللہ اعلم بالصواب

سفید اور سیاہ ہاتھی

دوست کا سوال ہے کہ اس نے خواب میں یہ دیکھا کہ ایک دیوار ہے، بہت بڑی دیوار، دیوار چین جیسی۔ اس کے دونوں طرف ہاتھی ہیں، ایک طرف سفید اور دوسری طرف سیاہ کہ جن پر کچھ لوگ سوار ہیں۔ یہ ہاتھی دونوں طرف سے اس دیوار کو گرانے میں لگے ہیں یہاں تک کہ وہ دیوار گرادیتے ہیں لیکن ہاتھی والوں کے مابین کوئی جنگ نہیں ہوتی اور ہاتھی والوں نے اپنے ہاتھوں میں سرخ جھنڈے پکڑ رکھے ہیں۔

محسوس یہ ہوتا ہے کہ اس خواب کا تعلق عالمی حالات وواقعات سے ہے۔ دیوار کے دونوں طرف ہاتھیوں سے مراد دو سپر پاورز ہیں یعنی چائنہ اور رشیا اور دیوار سے مراد ان کے درمیان تعلقات کی دوری ہے۔ دیوار گرانے سے مراد یہ ہے کہ وہ تعلقات کی اس دوری کو ختم کر کے عنقریب آپس میں مل جائیں گے یعنی اتحاد کر لیں گے۔ سفید ہاتھیوں سے مراد امن پسند لوگ ہیں اور یہ چینی ہیں اور سیاہ ہاتھیوں سے مراد وہ ہیں جو اپنے نقصان کا غم کھانے والے ہیں یعنی روسی جو روس کے ٹوٹنے کے بعد غم کی کیفیت میں ہیں۔ اور سرخ جھنڈوں سے مراد سُرخے ہیں یعنی کمیونسٹ۔ واللہ اعلم بالصواب

خواب کی تعبیر کے بارے ذہن میں رہے کہ یہ کوئی یقینی بات نہیں ہوتی بلکہ تعبیر کرنے والے کا ایک اندازہ ہوتا ہے جو صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ پس یہ ایک ظنی علم ہے کہ جس میں غلطی کا امکان بہر حال موجود رہتا ہے۔ دوسرا یہ کہ کسی خواب کی تعبیر کے لاجیکل ہونے کی صورت میں بھی ضروری نہیں ہے کہ امر واقعہ میں بھی ایسا ہی ہو، امر واقعہ کو اللہ عزوجل ہی جانتے ہیں۔ اسی طرح بعض اوقات تعبیر کرنے والے کو خواب دیکھنے والے کے احوال کا علم نہیں ہوتا لہذا اس کی تعبیر میں غلطی کا امکان بڑھ جاتا ہے۔

دوست احباب خواب کی تعبیر پوچھ لیتے ہیں تو اگر اللہ تعالی کوئی بات سجھا دیں تو ایک رائے کے طور بیان کر دیتا ہوں، اسے حتمی نہیں سمجھنا چاہیے۔ اور بعض اوقات تو خواب اس قدر پیچیدہ ہوتا ہے کہ اس کی تعبیر کچھ سجھائی نہیں دیتی۔ کچھ عرصے میں خوابوں کی

تعبیر پر چند ایک پوسٹیں اس لیے لگائی ہیں کہ اب یہ علم، علماء میں سے بھی ناپید ہوتا جا رہا ہے کہ اس کی طرف توجہ اور دلچسپی کم ہے۔ خواب اور اس کی تعبیر علم نبوت کا ایک حصہ ہے کہ جس کا وارث علماء کو بنایا گیا ہے، انہیں اس علم کے سیکھنے اور سکھانے کی طرف ممکن توجہ دینی چاہیے۔

البتہ سائیکالوجسٹ اس کو نہیں مانتے کہ خواب نبوت کے علم میں سے ہے، ان کے نزدیک یہ لاشعور کا تجزیہ ہے یعنی خواب میں حاصل کیے گئے علم کا مصدر خود انسان کا "نفس" ہے نہ کہ خارج سے "الہام" وغیرہ۔ مثلاً مذکورہ بالا خواب کے سچا ثابت ہو جانے کی صورت میں فرائیڈ یہ کہے گا کہ خواب دیکھنے والے کے لاشعور نے سوتے میں ایک تجزیہ کیا اور سوتے میں لاشعور چونکہ فل ورکنگ میں ہوتا ہے لہذا اس نے درست تجزیہ کر لیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو اس صورت میں ہے جبکہ خواب دیکھنے والا عالمی حالات سے واقف ہو، اخبار اور میڈیا سے متعلق ہو، تجزیہ نگار ہو، بعض اوقات خواب دیکھنے والا بالکل ان پڑھ اور جاہل ہوتا ہے کہ اس کے لاشعور تو کیا، شعور سے بھی اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کسی چھوٹے سے معاملے میں بھی کوئی سوجھ بوجھ والا تجزیہ کر سکے۔

خواب میں محرم سے مباشرت کرنا

تین دوستوں نے اس بارے پوچھا ہے کہ ایسے خواب کا کیا مطلب ہے کہ جس میں کوئی شخص اپنی کسی محرم عورت سے جنسی تعلق قائم کرتا ہے؟

جواب: ایسے خواب کی تعبیر دو طرح سے ہے:- ایک یہ کہ یہ شیطان کی طرف سے بندہ مومن کو اذیت پہنچانے کا طریقہ ہے جیسا کہ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ شیطان تم میں سے کسی ایک کے خواب میں آ کر اس سے کھیلتا ہے۔ تو ایسے خواب کے بارے کہ جس میں شیطان انسان سے کھیلے، آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ جب یہ خواب دیکھے تو اعوذ باللہ پڑھے اور اپنے بائیں طرف ہلکا سا تین مرتبہ تھوک دے کہ شیطان بائیں طرف سے حملہ کرتا ہے۔

یہ ذہن میں رہے کہ شیطان آپ کے خواب میں آپ کے کسی بھی رشتہ دار کی شکل

میں آ سکتا ہے۔ تو خواب میں جو آپ کو ماں، بہن، بیٹی نظر آ رہی ہے تو وہ حقیقت میں شیطان ہے۔ اور شیطان کا اس سے مقصود مومن کو ذہنی اذیت پہنچانا ہوتا ہے تو آپ اگر یہ نکتہ ذہن میں رکھ لیں کہ وہ شیطان ہے تو آپ اس ذہنی اذیت سے محفوظ رہیں گے کہ آپ نے وہ خواب دیکھا تو دیکھا کیوں؟ اور اگر ایسا خواب آپ کو تکرار سے آتا ہو تو پھر آپ کے ساتھ آسیب یا سحر کا مسئلہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور اس کا علاج "رقیہ شرعیہ" ہے کہ جسے شرعی دم کہتے ہیں یعنی کتاب وسنت سے علاج۔

پس ایسے خوابوں سے ایک تو ڈیپریشن میں مبتلا نہیں ہونا کہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ اس کا بہترین علاج آذان کا سننا ہے کہ شیطان آذان سن کر بھاگ جاتا ہے۔ آپ کے جاننے والوں میں اگر کوئی متقی امام، قاری یا مؤذن ہو تو ان سے اکیس دن تک صبح وشام اکتالیس مرتبہ اپنے کان میں آذان پڑھنے کو کہیں اور پڑھنی اس رفتار سے ہے کہ جس رفتار سے تکبیر کہتے ہیں، یا کسی اچھے موذن کی ریکارڈڈ آذان روزانہ ہینڈ فری کانوں میں لگا کر اسی طرح اتنی مرتبہ سن لیا کریں تو یہ خواب جاتے رہیں گے، ان شاء اللہ۔

دوسرا یہ کہ ایسے خوابوں کی وجہ عام طور تو شیطان ہی ہوتا ہے لیکن اگر شیطان نہ ہو تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ ایسا شخص اپنے اس محرم کے حقوق ادا نہیں کر رہا ہے یا اس نے اس سے اپنا دل سخت کیا ہوا ہے۔ تو اس محرم کی محبت جو کہ اس کا حق تھی، آپ نے جاگتے میں ادا نہ کی تو سوتے میں لاشعور نے غالب آ کر اس محبت کو سمبالک یعنی علامتی بنا دیا۔ اب لاشعور تو چونکہ اندھا ہے لہذا اس کے اظہار کے طریقے بھی اندھے ہوتے ہیں۔ پس اس کے اندھاپن (blindness) پر نہ جائیں، وہ مسئلہ تلاش کریں کہ جس کی طرف وہ توجہ دلانا چاہ رہا ہے۔

ایک اور دوست نے یہ پوچھا تھا کہ انہوں نے خواب دیکھا کہ وہ ایک ہجوم میں ہیں کہ جہاں یہ آواز ہے کہ آگے اللہ کے رسول ﷺ سجدے میں ہیں اور لوگ ان کے پیچھے سجدہ کر رہے ہیں۔ تو یہ صاحب بھی آپ کے پیچھے سجدے کی کوشش کرتے ہیں اور

وہاں پولیس بھی ہے جو اس ہجوم کو کنٹرول کر رہی ہے، کچھ اس طرح سے ہی خواب تھا۔
جواب: اس کی تعبیر یہ ہو سکتی ہے کہ یہ صاحب ریاض الجنۃ میں دو رکعت نفل نماز ادا کرنے کی سعادت حاصل کریں گے۔ واللہ اعلم بالصواب

دو خوابوں کی تعبیر

میں کوئی خوابوں کی تعبیر بتلانے میں ماہر تو نہیں ہوں لیکن اس موضوع سے دلچسپی ہے لہذا کبھی کبھار کچھ دوست کسی خواب کی تعبیر پوچھ لیں تو بتلا دیتا ہوں۔ ایک دوست نے پوچھا ہے کہ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ میں کسی جماعت کی نماز میں ہوں جو کہ غالب گمان کے مطابق عصر کی نماز ہے اور جگہ عرب ہے یعنی پورے خطہ عرب میں سے کوئی مقام ہے اور اس میں امام صاحب قراءت بالجہر کر رہے ہیں۔

مجھے اس خواب کی تعبیر یوں سمجھ آتی ہے کہ جس مقام پر انہوں نے عصر کی نماز پڑھی ہے، وہاں کا حکمران ریاکار، ظالم اور بدعتی ہے۔ نماز کے امام سے مراد اس جگہ کا حاکم ہے۔ اور عصر کی نماز میں بلند آواز سے قراءت کرنے سے مراد یہ ہے کہ جو کام چھپانے کا ہے تو اسے ظاہر کر رہا ہے لہذا یا تو یہ ریاکاری ہے، یا ظلم ہے کہ ظلم اسی کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کو اس کے مقام سے ہٹا دینا یا بدعت ہے کہ سنت کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ واللہ اعلم

دوسرا کسی دوست نے یہ خواب بیان کیا کہ انہوں نے خواب میں ایک نومولود کو دیکھا جو کہ باتیں کر رہا ہے۔ اور ان کے ذہن میں یہ خیال ہے کہ یہ ہمارا نبی ہے اور اس نومولود نے ان سے کوئی حدیث بھی بیان کی ہے جو کہ انہیں بھول گئی ہے۔

مجھے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ نبی یہاں لغوی معنی میں ہے یعنی خبر دینے والا اور نبی اس نسبت سے کہ اس کی بات، نبی کی خبر کی طرح سچ ثابت ہو گی۔ اور ہمارا نبی ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ امت کو کوئی خبر دے رہا ہے، مستقبل کی خبر۔ اور نومولود چونکہ خوشی کا سبب ہوتا ہے تو اس کی خبر یا تو کسی آزمائش کے خاتمہ کے بارے میں ہو گی یا پھر کسی نعمت کے حصول کے بارے میں۔ تو اس نومولود نے جو حدیث سنائی ہے تو وہ

امت کے مستقبل کے بارے کوئی اچھی خبر ہے جو آپ کو بھول گئی۔ واللہ اعلم

میں نے اپنے فہم کے مطابق تعبیر کر دی ہے، کسی دوسرے بھائی کو اس سے بہتر تعبیر معلوم ہو تو وہ کمنٹس میں اس کا اظہار کر سکتا ہے۔ باقی یہ بات علمی طور درست نہیں ہے کہ جس خواب کی پہلی تعبیر ہو جائے تو وہی نافذ العمل ہوتی ہے۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ خواب کی اچھی تعبیر ہی کرے، چاہے برا خواب ہی کیوں نہ ہو، ورنہ خاموش رہے۔ اور خواب دیکھنے والے کو صدقہ کرنے کا کہہ دے کہ اگر اس پر کوئی آزمائش آنے والی ہے تو اس کی برکت سے ٹل جائے یا کم ہو جائے۔

خواب میں چاند کا دیکھنا

سائل کا کہنا ہے کہ اس نے خواب میں دو چاند دیکھے جو آپس میں مل گئے۔ اسی طرح دوسری مرتبہ خواب میں دیکھا کہ چار چاند ہیں، بہت روشن، کالے بادلوں میں، جو آپس میں ضم ہو گئے ہیں۔

خواب میں چاند دیکھنے کے بارے تعبیر کرنے والوں کے ہاں بہت تفصیل ہے، یہاں تک کہ امام جعفر الصادق رحمہ اللہ نے خواب میں چاند دیکھنے کے سترہ معانی یا تعبیریں بیان کی ہیں۔ پھر خواب دیکھنے والے کے احوال کے اعتبار سے بھی اس کی تعبیر مختلف کی گئی ہے کہ اگر کسی حاملہ عورت نے خواب میں چاند دیکھا تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اولاد نرینہ کو جنم دے گی جو بادشاہ کی مقرب ہو گی۔

چاند کی جو تعبیر مجھے بہتر لگتی ہے، وہ یہ ہے کہ چاند سے مراد کوئی بڑا شخص ہے کہ جس سے ایک خلق خدا مستفید ہوتی ہو جیسا کہ چاند کی روشنی سے ایک دنیا فائدہ اٹھاتی ہے، چاہے یہ شخص حکمران ہو یا عالم دین ہو۔ پس چاند اگر بدر ہے یعنی چودھویں کا چاند تو اس سے مراد کوئی حکمران یا عالم دین ہے۔ اور اگر چاند ہلال ہے یعنی پہلی کا چاند تو اس سے مراد اولاد ہے۔ واللہ اعلم۔

چودھویں کے دو یا چار چاندوں کے آپس میں مل جانے کی یہ تعبیر ہو سکتی ہے کہ دو مسلمان حکمران یا معروف علماء یا مذہبی جماعتوں کے رہنماء، یا چار بڑے حکمران یا

معروف علماء یا مذہبی جماعتوں کے رہنماء، آپس میں اس طرح اتفاق کرلیں کہ جیسے ایک ہو جائیں۔ اور ان کے خوب روشن ہونے سے مراد ان کا خیر اور نیکی ہے۔ اور کالے بادلوں سے مراد ان کا ماحول ہے جو شرک اور بدعت کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے میں نے خواب میں دیکھا کہ چاند اپنے مدار سے نکل گیا ہے اور زمین پر ایک قیامت برپا ہے اور خواب میں ہی عجیب دہشت کی کیفیت دل پر طاری ہے لیکن یہ سب کچھ تھوڑی دیر کے لیے ہوا اور پھر جیسے فضا تھم گئی اور زمین سکون میں آگئی اور چاند اپنے مدار میں واپس لوٹ گیا۔ مجھے تو اس کی تعبیر یہی سمجھ آئی کہ کوئی مسلمان حکمران یا بڑا عالم دین اللہ کی حدود سے نکل گیا کہ جس سے معاشرے میں بہت عدم توازن پیدا ہوا اور پھر واپس صحیح رستے پر آگیا۔ واللہ اعلم بالصواب

جابر المغربی کا کہنا یہ ہے کہ اگر کسی نے خواب میں دیکھا کہ چاند اس کے پاس ہے یا اس کے ہاتھ میں ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ کسی حسب نسب والی خاتون کو نکاح کا پیغام دے گا۔ اور چاند کو اپنی گود میں دیکھنے کا جو معنی حدیث میں منقول ہے، اس سے مراد کسی بڑے شخص سے نکاح ہے جیسا کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی سے پہلے یہ خواب دیکھا تھا کہ چاند ان کی گود میں اترا ہے۔

اپنی حالیہ کتاب "مکالمہ" اور اس کے بعد "مکالمات" کی اشاعت کے بعد، ان شاء اللہ، خوابوں پر ایک مستقل تصنیف مرتب کرنے کا ارادہ ہے کہ جس میں کچھ اصول ایسے ڈیفائن کر دیے جائیں کہ جن کی روشنی میں خوابوں کی تعبیر ایک باقاعدہ سائنس کی صورت اختیار کر جائے۔ مثال کے طور مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اول رات کے خواب حوادث نفس ہیں، نصف رات کے خواب شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں، اور آخر رات کے خواب الہام ہوتے ہیں اور صرف انہی کی تعبیر تلاش کرنی چاہیے، باقیوں کو نظر انداز کر دے۔ اس کتاب میں بھی "لسانیات اور نفسیات" کے باب میں خوابوں پر بحث شامل کی گئی ہے کہ ان دونوں علوم سے خوابوں کا گہرا تعلق ہے کہ جس کا احساس ہر اس ریڈر کو ہو گا جو ہماری ان تحریروں میں اس تناظر میں غور کرے گا۔

میرے خواب

سوچ رہا ہوں کہ اپنے کچھ خواب بیان کر دوں کہ جس سے خوابوں کے بارے تحقیق و جستجو رکھنے والوں کو شاید کچھ فائدہ حاصل ہو جائے۔ اور یہ عام سے چھوٹے چھوٹے خواب ہیں۔ اور یہ بات اس لیے عرض کر دی کہ ہمارا مذہبی ذہن زیادہ بڑے خواب دیکھنا پسند نہیں کرتا، اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے۔ شاید اس خوف سے کہ دوسروں کے بڑے خواب دیکھ لینے سے ان کی ہم پر بڑائی ثابت نہ ہو جائے۔ بہر حال میں نے تو خیر کوئی بڑے خواب دیکھے بھی نہیں ہیں لیکن میرا تجزیہ یہ ہے کہ خواب سچے بھی کیوں نہ ہوں، ان میں عموماً مبالغہ ہوتا ہے یعنی حقیقت سے زیادہ کا بیان ہوتا ہے کیونکہ تخیل ہمیشہ حقیقت سے بڑا ہوتا ہے۔ اور اس قاعدے کلیے میں صرف ایک استثناء ہے اور وہ پروردگار کا ہے کہ وہاں حقیقت، تخیل سے بہت بلند ہے۔

والد صاحب کی وفات کے بعد بہت خواہش تھی کہ انہیں خواب میں دیکھوں تو یہ سوال پوچھوں کہ آپ نے تو مرنے کے بعد کی زندگی دیکھ لی، لہذا مجھے کیا وصیت کریں گے ؟ کیا کروں ؟ ایک دن دوپہر کو روزے کی حالت میں سویا تھا تو خواب میں تشریف لائے اور آٹھ دس وصیتیں فرمائیں کہ جن میں سے دو یاد رہیں؛ ایک یہ کہ شب بیداری کیا کرو اور دوسرا یہ کہ رشتہ داروں کو جوڑ کر رکھو۔ ایک مرتبہ تائی جان خواب میں تشریف لائیں تو کہنے لگی کہ تمہارے لیے ایک تحفہ لائی ہوں، میں نے کہا کہ وہ کیا ہے؟ کہنے لگی کہ یہ دعا کثرت سے پڑھا کرو: ﴿ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا﴾ ترجمہ: اے اللہ! میرے علم میں اضافہ فرما۔ اب کبھی کبھار یہ دعا پڑھ لیتا ہوں لیکن اہتمام نہیں کر سکا کہ میں عموماً خوابوں کے بارے یقین کی بجائے شک کے رویے کا زیادہ شکار رہتا ہوں۔ میں نے پوچھا کہ یہ بتلائیں کہ نیکی کون سی کیا کروں؟ کہنے لگیں کہ کوئی سی بھی۔ میں نے کہا کوئی سی بھی؟ انہوں نے کہا کہ ہاں، کوئی سی بھی کر لیا کرو۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جبکہ "وجود باری تعالیٰ" کے نام سے کتاب مرتب کر رہا تھا۔

ایک مرتبہ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ خواب میں آئے اور کہا جب درس قرآن کے لیے

جاؤ تو اپنے کپڑے اچھی طرح استری کر کے جایا کرو، تمہاری اچھی ڈریسنگ کا بھی تمہارے سامعین پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ اور پھر میرے کپڑے مجھ سے لیے اور خود سے استری کر کے دیے جبکہ میں منع کرتا ہی رہ گیا۔ یہ ان دنوں کا خواب ہے جبکہ میں رمضان میں دورہ ترجمہ قرآن مجید کروا رہا تھا۔

ایک دوسری مرتبہ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ خواب میں آئے اور احمد جاوید صاحب بھی پاس بیٹھے تھے۔ منظر یہ تھا کہ ہم تینوں ایک صحن میں موجود ہیں اور پاس میں ایک بیری کا درخت تھا اور سامنے حفظ قرآن والی چوکیاں پڑی ہیں جیسے کوئی حفظ کی کلاس ہو۔ ڈاکٹر اسرار صاحب نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ مجھے اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوا کہ جس میں تم پڑ رہے ہو اور ساتھ میں احمد جاوید صاحب کی طرف دیکھا لیکن احمد جاوید صاحب خاموش رہے۔ میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب لیکن مجھے بہت فائدہ ہو رہا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جبکہ میں نے احمد جاوید صاحب کی جمعہ کی مجلس میں نیا نیا جانا شروع کیا تھا۔ اور یہ خواب سحری اور فجر کی نماز کے درمیانی وقفے میں دیکھا گیا۔ اس خواب کے دو ہفتوں بعد ڈاکٹر صاحب پھر خواب میں تشریف لائے اور مجھ سے "قرآن اور جہاد" پر تقریر کروائی اور خود سنتے رہے۔ واضح رہے کہ یہ دونوں ڈاکٹر صاحب کے پسندیدہ موضوعات تھے۔

ایک مرتبہ خواب میں مولانا ابو الکلام آزاد رحمہ اللہ سے ملاقات ہوئی، اور میری ایک تحریر جو امام مہدی رحمہ اللہ کے بارے تھی اور اس کتاب میں بھی شامل اشاعت ہے، کی خوب تعریف کی کہ کیا خوب لکھا ہے! ایک مرتبہ بابائے اردو خواب میں تشریف لائے اور کہا کہ میری خواہش ہے کہ تم اردو زبان کے لیے کچھ کام کرو۔ ان دونوں خوابوں کا مجھے تو کوئی ربط اپنی زندگی سے نظر نہیں آیا کہ میں اردو زبان کی خدمت کے لیے کیا کر سکتا ہوں کہ میرا تو یہ میدان ہی نہیں ہے۔ ایک مرتبہ مولانا وحید الدین خان صاحب خواب میں تشریف لائے اور بڑی ہی محبت سے شکوہ کیا کہ میرے خلاف کتاب کیوں لکھ دی ہے؟ واضح رہے کہ میں نے مولانا کے نظریات کے بارے ایک تنقیدی

کتاب لکھی ہے لیکن اس میں ان کی بعض اچھی باتوں کی تحسین بھی فرمائی ہے۔ایک مرتبہ پیر مہر علی شاہ صاحب اپنے خاص مریدین کی جماعت کے ساتھ خواب میں تشریف لائے اوران کے خاص الخاص مرید نے وحدت الوجود کے مسئلے پر مکالمہ کیا۔ان دونوں پیر صاحب کی وحدت الوجود پر کتاب کا مطالعہ کر رہا تھااور اس کے تنقیدی نوٹس بھی لے رہا تھا۔

ایک مرتبہ ڈاکٹر ذاکر نائیک خواب میں تشریف لائے اور کہا کہ میری خواہش ہے کہ آپ میرے چینل کے لیے ریکارڈنگ کروائیں۔ابھی تو یاد نہیں لیکن شاید ان دنوں میں پیس ٹی وی میں آنے کا سوچا ہو تو یہ خواب دیکھ لیا ہو۔واللہ اعلم۔ایک مرتبہ خواب میں کسی نے جیسے کان میں آکر کہا کہ تم کثرت سے "درود رحیمی" پڑھا کرو۔میں نے کہا کہ وہ کیا ہے؟ تو اس نے کہا کہ ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَاعَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ﴾ [التوبة: 128]اور اگر یہ نہ پڑھ کو تو "درود رحمانی" پڑھ لیا کرو۔تو میں نے کہا کہ وہ کیا ہے؟تو اس نے کہا کہ «اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَعَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَجِيدٌ، اللَّهُمَّ بَارِكْ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَعَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَجِيدٌ»۔بہر حال ایسی تجاویز پر عموماً عمل نہیں کر پاتا کہ میرا احساس ہے کہ زیادہ تر خواب ہمارے نفس کی مختلف کیفیات ہی ہوتی ہیں کہ جنہیں لاشعور سوتے میں متشکل کر دیتا ہے۔زیادہ تر کا لفظ استعمال کیا ہے،سب کا نہیں۔

عاشقوں کی جنت

دوست کا کہنا ہے کہ اگر کسی لڑکے کو دوسرے لڑکے سے شدید محبت ہو جائے تو اس کا کیا علاج ہے؟جواب:ایک چیز اگر نارمل ہے تو اسے ابنارمیلٹی نہیں سمجھنا چاہیے۔اور ایسا صرف لڑکوں میں نہیں بلکہ لڑکیوں میں بھی ہو جاتا ہے۔اور یہ عموماً ہاسٹل لائف میں زیادہ ہوتا ہے کہ ایک روم میٹ کو دوسرے روم میٹ سے شدید محبت محسوس ہوتی ہے لیکن ہاسٹل لائف اس کی وجہ نہیں ہے کہ یہ بعض اوقات کلاس فیلوز میں بھی ہو جاتا

ہے اور یہ عام ہے۔

مجھے ہمیشہ ایسے مسائل کو حل کرنے سے دلچسپی رہتی ہے کہ جنہیں لوگ مشکل سمجھ کر چھوڑ دیتے ہوں۔ معلوم نہیں میرا مزاج ہی ایسا ہے۔ اور میں یہ بھی کوشش کرتا ہوں کہ کسی مسئلے کو ایک سوشل سائنٹسٹ اور سائیکالوجسٹ کے رویے سے حل کروں نہ کہ مفتی اور مولانا کے مزاج پر۔ میں رہنمائی تو مذہب ہی سے لیتا ہوں اور مذہب کا گہرا مطالعہ بھی کرتا ہوں اور تمام مسائل کا بہترین حل مذہب ہی کو سمجھتا ہوں لیکن مذہبی لوگوں کے سخت ایٹی چیوڈ کی وجہ سے لوگ اب ان سے مسئلہ پوچھتے بھی گھبراتے ہیں لیکن وہی لوگ سوشل سائنٹسٹ اور سائیکالوجسٹ کے سامنے اپنی پوری زندگی کھول کر رکھ دیتے ہیں۔

مجھے یہ ماننے میں عار نہیں ہے کہ ہم مذہبی لوگوں کے رویوں کی وجہ سے ہم میں اور معاشرے میں بہت گیپ پیدا ہو چکا ہے۔ لوگ آج بھی علماء پر اعتماد کرتے ہیں، انہی سے مسئلے کا حل چاہتے ہیں لیکن وہ ان سے خوف اور ڈر محسوس کرتے ہیں۔ مجھ سے جب بہت سے لوگ سوال کرنے سے پہلے پوچھتے ہیں کہ آپ ڈانٹیں گے تو نہیں یا ناراض تو نہیں ہوں گے تو میں شرمندہ ہو جاتا ہے کہ معلوم نہیں عام لوگوں کے ذہنوں میں علماء کا کیا تصور موجود ہے۔ اور اسے پیدا کرنے میں کچھ علماء کا بھی کردار ہے۔ پس میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر علماء کو اپنے معاشروں کو اسلام پر لانا ہے تو ہمیں اپنے رویے سوشل سائنٹسٹ اور سائیکالوجسٹ جیسے بنانے ہوں گے۔

مجھے تھوڑے بہت غور سے یہ بات سمجھ میں آئی ہے کہ انسانی شعور کی مختلف فیکلٹیز ہیں، جن میں ایک جمالیاتی (Aesthetics) شعور ہے۔ جب انسان بالغ ہو رہا ہوتا ہے تو اس وقت اس کے شعور کی بہت سی فیکلٹیز اپنی ورکنگ کا آغاز کر رہی ہوتی ہے اور اس آغاز میں وہ بہت کچھ غلطیاں کرتی ہیں اور سیکھتی بھی رہتی ہیں کہ جن میں سے ایک جمالیاتی شعور بھی ہے۔ جمالیاتی شعور کا ایک مقصد حسن کی تلاش، تعین اور اسے چاہنا بھی ہے تو چودہ سے پچیس سال کی عمر میں انسان عام طور حسن کے ایک ناقص، نامکمل

بلکہ نابالغ تصور کی وجہ سے کسی ہم جنس دوست کی شدید محبت محسوس کرنا شروع کر دیتا ہے، بے چین کر دینے والی محبت، لیکن یہ عارضی ہوتی ہے، کبھی ہمیشہ نہیں رہتی بلکہ جیسے جیسے انسان کا تصور حسن بالغ ہوتا جاتا ہے، یہ ختم ہوتی جاتی ہے۔

اب اگر کوئی شخص اس میں پھنس گیا ہو تو اس کے نکلنے کے دو رستے ہیں۔ایک تو امام ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "روضة المحبين" میں پیش کیا ہے کہ جس کا اردو ترجمہ عاشقوں کی جنت کے نام سے موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کی جلد از جلد شادی ہو جائے اور شادی سے یہ مسئلہ سو فی صد حل ہو جاتا ہے لیکن ننانوے فی صد کا، کہ ایک فی صد پھر ایسے ہو سکتے ہیں کہ جن کا جمالیاتی شعور کسی ذہنی الجھن (mental disorder) کی وجہ سے بالغ نہ ہو پائے۔اور اگر شادی ممکن نہ ہو تو اسکا بہترین علاج دوری ہے، دوری سے مراد ہجرت ہے، وہ شہر چھوڑ دیں، ہمیشہ کے لیے نہیں، صرف تین ماہ، اور یہ بھی میں زیادہ بتلا رہا ہوں، چالیس دن میں ایسا محبوب دل سے اتر جاتا ہے۔

خاندانی الجھاؤ (oedipus complex): فرائیڈ کی خدمت میں

کارل مارکس نے انسان کی تمام خواہشات اور جبلتوں کی بنیاد اس کی بھوک کی جبلت کو بنایا ہے کہ انسان سب کچھ اپنے پیٹ کی خواہش مٹانے کی خاطر کرتا ہے۔ایڈلر نے کہا کہ انسان کی تمام خواہشات اور جبلتوں کی جڑ دوسروں پر فوقیت اور بڑائی حاصل کرنے کا جذبہ ہے اور یہی ہر انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔فرائیڈ نے کہا کہ انسان کی تمام جبلتوں اور خواہشات کی اصل اس کی جنس کا جذبہ ہے اور انسان کے ہر عمل کا سبب اور محرک یہی جذبہ ہوتا ہے۔

ہر فلسفی کی یہ خواہش رہی ہے کہ وہ انسان کی کسی ایسی خواہش اور جبلت کو تلاش کر لے کہ جس کے گرد انسان کی تمام جبلتیں اور خواہشات گھومتی ہوں۔اور اس طرح وہ کوئی ایسا فلسفہ مرتب کر دے کہ جس کے مطابق انسان کے تمام اعمال اور افعال کا محرک اور سبب صرف اور صرف وہی جبلت اور خواہش قرار پائے۔انسان کی تمام خواہشوں میں اصل خواہش اور جبلت کون سی ہے، اس پر ہم پھر کبھی گفتگو کریں گے کہ آج ہمیں اس

بارے فرائیڈ کی حرکتوں پر کچھ گفتگو کرنی ہے۔

بلاشبہ فرائیڈ ایک ذہین انسان تھا، نسلی طور جرمن یہودی تھا لیکن بعد میں الحاد کی طرف مائل ہو گیا۔اس نے کہا کہ انسان اس دنیا میں جو کچھ کر رہا ہے، اپنے جنسی جذبے کو پورا کرنے کے لیے کر رہا ہے یہاں تک کہ ماں بیٹی کی نسبت اپنے بیٹے سے جو زیادہ محبت رکھتی ہے اور باپ اپنے بیٹوں کی نسبت اپنی بیٹی کی طرف جو زیادہ میلان رکھتا ہے، تو اس کی وجہ بھی جنسی محبت ہے۔

فرائیڈ اس میں تو درست ہے کہ خاندانی الجھاؤ ہوتا ہے لیکن اس کی وجہ مخالف جنس کی خواہش (oedipus complex) قرار دیتے ہوئے قطعی طور غلط تجزیہ کرتا ہے۔ خاندان میں ماں کا جھکاؤ عام طور بیٹے کی طرف اس لیے زیادہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے خاوند کو اپنا حریف سمجھنے کے سبب سے اس کے مقابلے میں گھر ہی سے اپنے لیے ایک سہارا تلاش کرتی ہے اور یہ سہارا اسے بیٹے کی صورت میں میسر آتا ہے لہذا ماں کی توجہ بیٹوں کی طرف زیادہ ہو جاتی ہے۔

اب بیٹی جب والدہ کے بیٹوں کی طرف زیادہ میلان کو واضح طور محسوس کرتی ہے تو اسے ماں کا یہ رویہ خلافِ عدل معلوم ہوتا ہے اور اس کے اور ماں کے مابین تعلقات میں ایک کھچاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔اس کھچاؤ کے نتیجے میں بیٹی کا رجحان منطقی طور باپ کی طرف ہو جاتا ہے۔اس طرح خاندان تقسیم ہو جاتا ہے اور باپ اپنے بیٹوں اور ان کی ماں کو ایک ایسی پارٹی سمجھنا شروع کر دیتا ہے جو خاندان میں اس کی حیثیت اور اختیار کو چیلنج کر رہی ہو۔ یہ سادہ سی کہانی ہے کہ جس کا محرک فرائیڈ نے دھکے سے جنسی جذبہ بنانے کی کوشش کی ہے۔اس طرح تو ایڈلر کے اصول کے مطابق یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حیوانی جنسی رویوں کی توجیہ یہ ہے کہ مرد، عورت پر غلبہ چاہتا ہے۔

چلڈرن سائیکالوجی

بہت ضروری ہو گیا ہے کہ مستقبل کی ماؤں کو چلڈرن سائیکالوجی کا مضمون پڑھایا جائے تا کہ وہ بچوں کی تربیت اور ان کی شخصیت اور کردار کی تعمیر (personality

development) میں کوئی اہم کردار ادا کر سکیں۔ ایک یونیورسٹی گریجویٹ کا مقدر ماں بننا ہے لیکن اس جدید نظام تعلیم کی برکت سے مستقبل کی وہ ماں جس چیز سے سب سے زیادہ محروم ہے، وہ ماں بننے کی صلاحیت ہے۔ اس پورے نظام تعلیم میں بچیوں کو اگر کسی چیز کی تعلیم نہیں دی جاتی تو وہ ماں بننے کی بنیادی تعلیم اور تربیت ہے۔

اس دومنٹ کی ملحق ویڈیو کو دیکھیں گے تو پھر ان الفاظ کی اہمیت ثابت ہو گی کہ ایک ماں اے-بی-سی صحیح طرح سے یاد نہ ہو سکنے پر بچی پر کس طرح نہ صرف برس رہی ہے بلکہ اس ڈانٹ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچی کے غیر معمولی رد عمل کو جانچنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہے۔ یونیورسٹی لیول پر بچیوں کو جن مضامین میں سے لازمی طور گزارنا چاہیے تو ان میں عورتوں کی سائیکالوجی، عورتوں کی صحت کے مسائل، چلڈرن سائیکالوجی، چلڈرن ایجوکیشن، فرسٹ ایڈ اور گھریلو ٹوٹکے، ہوم مینیجمنٹ، ہوم اکنامکس اور امور خانہ داری وغیرہ شامل ہیں۔ مطالعہ پاکستان لازمی یا انگریزی لازمی پڑھ کر ان کو کتنے نفلوں کا ثواب ملے گا؟

ہمارے تعلیمی مقاصد نہ ہونے کے برابر ہیں۔ جس تعلیم پر لاکھوں روپے خرچ کر دیے جاتے ہیں، راتیں جاگ کر گزاری جاتی ہیں، اس کا ہماری عملی اور حقیقی زندگی سے دور پرے کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے بہت ضروری ہے کہ میٹرک سے لے کر گریجویشن لیول تک کے تمام لازمی مضامین اور نصابِ تعلیم کو ریوائز کیا جائے۔ کمپیوٹر سائنس میں سافٹ ویئر انجینئرنگ یا انگریزی میں ماسٹرز کر لینے سے یہ تو سمجھ نہیں آئے گی کہ بچوں کی تربیت کیسے کرنی ہے؟

چلیں، پیمپر باندھنا تو پھر وقت کے ساتھ آ جائے گا کہ دو چار مرتبہ بچے کا پیشاب نکلے گا، بستر گندا ہو گا، تو سمجھ آ ہی جائے گی کہ کیسے باندھنا ہے۔ لیکن حمل سے لے کر ڈیلیوری تک کے مسائل اور پھر بچوں کی نگہداشت سے لے کر ان کی تعلیم و تربیت تک کے کتنے مراحل ایسے ہیں جو آج ہماری بچیوں کے لیے تیار کیے گئے تعلیمی نصاب یا نظام تعلیم کا حصہ ہیں حالانکہ اس بیچاری نے ملازمت کرنی ہو یا نہ کرنی ہو لیکن یہ کام اسے

ضرور کرنے ہیں۔

بھئی، بہت ضروری ہو گیا ہے کہ تعلیم کے نام پر اس بھیڑ چال سے نکلا جائے اور ایسی تعلیم کو حاصل کرنے کی طرف توجہ دی جائے کہ جس کا ہماری عملی زندگی سے کوئی تعلق ہو۔ ایک منٹ کی ویڈیو ہے، یہ ضرور دیکھ لیجیے گا کہ اگر اس مسئلے کی طرف توجہ نہیں دیں گے تو اپنی آئندہ آنے والی نسلوں کو تباہ کر دیں گے۔ ایبنارمل بچوں کی تعداد معاشرے میں بہت بڑھ جائے گی۔ ماں، بچے کی پہلی استاذ ہے اور اس استاذ کو آپ نے ٹریننگ، ویڈیو بنانے کی تو دے دی ہے لیکن بچہ سنبھالنے کی نہیں دی۔

اینگری برڈ

سائیکالوجسٹ انسانی رویوں کو عموماً پانچ صورتوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلا رویہ انفعالی (passive) ہے۔ جو لوگ اس رویے کے حامل ہوں تو وہ اپنے آپ کو حالات پر چھوڑ دیتے ہیں کہ حالات جدھر انہیں لے جائیں، وہ چل پڑیں گے۔ ان میں مزاحمت (resistance) کا مادہ بہت کم ہوتا ہے جبکہ قبولیت کا مادہ زیادہ ہے۔ یہ عموماً دوسروں پر اثر ڈالنے کی بجائے، ان سے اثر قبول کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جسے زیادہ تر "ناں" کرنا مشکل لگتا ہے، وہ اس مزاج کا حامل ہوتا ہے۔ ان کی نشانی یہ بھی ہے کہ لوگ ان کے ساتھ عموماً زیادتی کر جاتے ہیں۔

دوسرا رویہ جارحانہ (aggressive) ہے۔ یہ لوگ دوسروں کا اثر کم لیتے ہیں جبکہ ان پر اپنا اثر زیادہ ڈالتے ہیں۔ یہ ماحول اور حالات کے ساتھ نہیں ڈھلتے بلکہ ماحول اور حالات کو اپنے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ یہ ہر وقت سننے سے زیادہ سنانے کے موڈ میں ہوتے ہیں۔ ایسے رویے کے حاملین معاشرے میں لیڈر بن کر زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگوں کو اپنے پیچھے دیکھنا چاہتے ہیں نہ کہ خود کسی کے پیچھے لگتے ہیں۔ یہ لوگوں سے عموماً زیادتی کر جاتے ہیں۔

تیسرا رویہ انفعالی اور جارحانہ (passive-aggressive) ہے۔ یہ وہ رویہ ہے کہ جسے ہم اپنی زبان میں "پل میں تولہ، پل میں ماشہ" کہہ سکتے ہیں۔ یہ بہت خطرناک

رویہ ہے۔ مثلاً اس رویے کے حامل سے اگر آپ کا اختلاف ہو جائے، اور آپ ناراضگی کا اظہار کریں تو فوراً معذرت کرلے گا یعنی پیسو ہو جائے گا لیکن جیسے ہی آپ نے معذرت قبول کی، وہ آپ پر چڑھائی کر دے گا یعنی ایگریسو ہو جائے گا۔ یہ پہلے لمحے میں آپ سے معافی مانگے گا اور دوسرے لمحے میں آپ کا ناصح بن جائے گا۔

چوتھا رویہ تبدیل ہونے والا (alternating) کہلاتا ہے۔ اس رویے کے حامل کبھی پیسو ہوتے ہیں تو کبھی ایگریسو۔ لیکن یہ پل بھر میں نہیں ہوتے جیسا کہ اوپر والے کیس میں ہے۔ یہ لوگ دراصل اپنی اصلاح کرتے رہتے ہیں کہ یا تو اصل میں پیسو ہیں تو اس کے نقصانات سے بچنے کے لیے ایگریسو بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یا پھر ایگریسو ہیں تو اس کے وبال سے دور رہنے کے لیے پیسو بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہذا اسی کوشش میں کبھی ان کا رویہ پیسو ہوتا ہے اور کبھی ایگریسو ہوتا ہے۔ یہ دراصل اپنے رویوں کی اصلاح کر رہے ہوتے ہیں۔

پانچواں رویہ اظہاریہ اور جزمیہ (assertive) ہے۔ اس رویے کا حصول سب سے مشکل ہے۔ اس رویے کے حاملین دوسروں کے سامنے اپنی شخصیت اور پسند ناپسند کا اظہار کرتے رہتے ہیں تا کہ لوگ ان سے اس کے مطابق چلیں یعنی بی ہیو (behave) کریں۔ یہ لوگ جب یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے ہمارے ساتھ اس طرح بی ہیو (behave) کریں تو خود بھی اس کا لحاظ کرتے ہیں کہ ہمیں دوسروں کے ساتھ ویسے ہی بی ہیو (behave) کرنا ہے جیسا کہ وہ چاہتے ہیں۔

اور چھٹا رویہ، جو کہ سراسر اس ناچیز کی دریافت ہے، اینگری برڈ کا رویہ ہے۔ اس رویے کے حاملین چھوٹی بات پر بڑا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ اگر کوئی ان کا انڈہ چرا لے تو یوں سمجھتے ہیں کہ جیسے کوئی ان کا بچہ اٹھا لے گیا ہو۔ کچھ غصہ ان کا فطری ہوتا ہے جو کہ کسی کی زیادتی کے سبب ہوتا ہے لیکن کچھ غصہ یہ مصنوعی طور پیدا کرتے ہیں۔ یہ ردعمل میں خودکش حملہ آور بن جاتے ہیں کہ چاہے ان کا اپنا نقصان زیادہ ہونا یقینی بھی ہو، پھر بھی بدلہ لینے سے باز نہیں آتے۔ بس کچھ بھی بن جائیں، اینگری برڈ نہ بنیں، اس میں

آپ کا نقصان زیادہ ہے۔ کسی صاحب تحریر نے اگر آپ کے ساتھ کچھ زیادتی کی ہے تو اس کی وال پر خود کش حملہ نہ کریں، ورنہ بلاک ہو جائیں گے۔

اگر آپ روڈ پر گاڑی چلا رہے ہیں تو کسی نے آپ کو پیچھے سے ہارن پر ہارن دیا کہ جس سے آپ تنگ ہوئے تو اب اگر آپ اسے دس کلو میٹر تک اپنے پیچھے گھسیٹے چلے جائیں اور اسے رستہ نہ دیں تو یہ اینگری برڈ کا رویہ ہے۔ اینگری برڈ کا رویہ ضروری نہیں کہ مستقل رویہ ہو بلکہ مذکورہ بالا پانچ رویوں کے حاملین بھی کبھی کبھار اینگری برڈ بن جاتے ہیں لہذا یہ ایک عارضی رویہ بھی ہو سکتا ہے۔ بنیادی طور یہ رد عمل کا رویہ ہے اور رد عمل کی نفسیات میں انسان عموماً غیر متوازن ہوتا ہے۔ اگر استاذ نے اپنے طالب علم کو کچھ ڈانٹ پلا دی ہو تو اس کے رد عمل میں طالب علم اپنے استاذ کی شان میں پورا قصیدہ ہی لکھ مارے تو یہ اینگری برڈ کا رویہ ہے۔

پیسو رویے کے حاملین اگر روڈ پر ہوں گے تو کسی ناکے اور ٹول پلازے وغیرہ پر لگی لائن میں پیچھے رہ جائیں گے۔ اور ایگریسو رویے والے لائن میں دوسروں کو پیچھے چھوڑنے کی کوشش کریں گے۔ پس پہلوں سے زیادتی ہوتی ہے اور دوسرے والے زیادتی کرتے ہیں۔ پیسو رویے والا سیکھتا بہت زیادہ ہے جبکہ ایگریسو رویے والے ہر وقت سکھانے کی پوزیشن میں ہوتا ہے لہذا اس کی لرننگ بہت کم ہوتی ہے۔ اور پیسو ایگریسو رویے والا پہلے آپ کی گاڑی کو آگے بڑھ جانے کا اشارہ دے گا اور اچانک خود سے اپنی گاڑی آگے بڑھا لے گا۔ اور آلٹرنگ رویے والا گاڑیوں کی لائن میں کبھی دوسروں کو آگے بڑھ جانے دے گا اور کبھی خود آگے بڑھ جائے گا۔ اور ازرٹیو رویے والا رولز کو فالو کرے گا اور دوسروں سے بھی یہی امید لگائے گا۔ اور اینگری برڈ سے اگر آپ نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو دس میل تک آپ کو رستہ نہ دے گا۔

مرغیاں

ایک دفعہ ملحدوں کے ایک پیج پر جانا ہوا تو احساس ہوا کہ یہ میرے بارے یہ خیال رکھتے ہیں کہ جیسے ان کی مرغیاں چرا کر لے جاؤں گا۔ دیکھنے میں آیا کہ جب بھی کوئی نیا

ملحد کسی بحث میں کنارے لگنے لگتا ہے تو پرانے ملحد اس کے ارد گرد جمع ہونا شروع ہو جاتے ہیں اس ڈر سے کہ کہیں میں ان کی مرغی بھگانہ لے جاؤں۔

خوف کا یہ احساس ہر طبقے، جماعت اور مسلک کے لوگوں میں موجود ہوتا ہے کہ کوئی ان کے دڑبے کی مرغی اپنے دڑبے میں نہ لے جائے۔ جہاں چور اچکوں سے اپنی مرغیوں کی حفاظت بہت ضروری ہے وہاں اپنی مرغیوں کے بارے زیادہ غیرت کھانا بھی مناسب نہیں ہے کہ تھی تو ہماری تو فلاں کی وال پر کیوں چلی گئی؟

مرغیوں کے بارے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اگر تو آپ روایت پسند ہیں تو میں ہر گز آپ کی مرغی نہیں چرانے والا۔ اور اگر وہ غلطی سی میری وال پر آگئی اور آپ کو اندیشہ ہوا کہ یہ واپس آپ کے گھر نہیں جائے گی تو آپ مجھے ایک میسج کر یے گا، میں اسے آپ کی وال پر باعزت طریقے سے پہنچادوں گا۔

اور البتہ اگر آپ روایت پسند نہیں ہیں تو پھر آپ کی مرغی میری مرغی۔ پوری کوشش کروں گا کہ آپ کی وال سے بھاگے اور میری وال میں پناہ لے۔ اور پھر اسے خوب کھلا پلا کر موٹا تازہ کر کے آپ کی وال پر مرغا بنا کر واپس بھیجوں گا کہ تہجد اور اشراق کے وقت بھی باقاعدگی سے آپ کی وال پر بانگیں دے گا۔

میرے فیس بکی دڑبے میں ابھی پانچ سو مرغیوں کی گنجائش ہے، اور آپ اپنی مرغی مجھے ہبہ کرنا چاہیں تو میں آپ کا ممنون رہوں گا۔

۞۞۞۞۞۞۞

باب نہم

معاشرت اور معیشت

اس باب میں معاشرت اور معیشت کے بارے بنیادی سوالات پر بحث کی گئی ہے۔

محبت اور دعا

جس نے بھی کہا درست کہا ہے کہ جس کے لیے تم تنہائی میں دعا کرتے ہو، تمہیں اس سے محبت ہے، چاہے والدین ہوں، اولاد ہو، بہن بھائی ہوں، اساتذہ ہوں یا دوست ہوں۔ اور جتنے جذب سے کرتے ہو، اتنی ہی شدید ہے۔ اور اگر نہ بھی ہو تو اس عمل سے ضرور پیدا ہو جائے گی۔

قطع تعلقی اور ناراضگی

قطع تعلقی میں عجلت سے کام نہ لو، چاہے اس کے اسباب کچھ بھی ہوں، کہ توڑنے کے بعد احساس ہو گا کہ تعلق کتنا گہرا اور سچا تھا۔ رہی ناراضگی تو اس سے مت ڈرو کہ وہ سچے تعلق کو مزید مضبوط کر دیتی ہے، چاہے وہ اولاد اور والدین کا ہو، میاں بیوی کا ہو، استاذ شاگرد کا ہو یا دوست کا دوست سے ہو۔

فیس بک کا استعمال

فیس بک کا استعمال ایک فتنہ ہے اور اسے چھوڑ دینا دوسرا۔ اب تو اللہ ہی بچائے تو بچائے، انسان کے بس کی بات نہیں۔ لائکس اور شیئرز کی خواہش فتنہ ہی نہیں اخلاقی گراوٹ بھی ہے، فتنہ اور آزمائش تو نوٹیفکیشن دیکھنے کی عادت ہے۔

فیس بک ایڈکشن

اچھا ہے، اس خبیث کو فیش بک کی ایڈکشن ہے، اگر یہ نہ ہوتی تو کسی اور ایڈکشن میں مبتلا ہوتا، ایڈکشن تو اس کا مقدر ہے۔

کرکٹ اور مووی

مولوی صاحب! اسے کرکٹ دیکھنے سے روکنا حکمت کے منافی ہے۔ اگر جوان کرکٹ نہیں دیکھے گا تو اور بہت کچھ دیکھے گا۔ اس کی کرکٹ چھڑوا دینا آسان ہے لیکن اسے مسجد میں لانا بہت مشکل ہے۔

وقت کا ضیاع

وقت کا ضیاع ایک ایسا گناہ ہے جو آپ کے دل سے ایمان کا نور کھینچ لیتا ہے اور آپ کو اکتاہٹ، بیزاری اور بے سکونی کی زندگی کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ بھئی، بلا مقصد براؤزنگ وقت ضائع کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ بن چکا ہے۔

اکتاہٹ اور تھکاوٹ

خدا سے دوری زندگی سے ہی اکتاہٹ پیدا کر دیتی ہے اور دنیا کا پیچھا انسان کو تھکا دیتا ہے۔ جدید انسان کے یہی دو المیے ہیں؛ یا تو وہ اپنی زندگی سے اکتایا ہوا ہے یا بہت زیادہ تھکا ہوا۔ اور اس پر مزید المیہ یہ ہے کہ وہ اپنی اکتاہٹ کا علاج خدا سے مزید دوری اور تھکاوٹ کا علاج دنیا کا مزید پیچھا کر کے کرنا چاہ رہا ہے۔ اور غور کرنا کبھی کبھی یہ سب کچھ دین کے نام پر بھی ہو رہا ہوتا ہے۔

مشقت کی زندگی

مشقت کی زندگی انسان کی تقدیر ہے جبکہ انسان کی کل دھوپ دوڑ کا مقصد یہ ہے کہ کسی طرح اس کی مشقت ختم ہو جائے اور اسے مستقل راحت اور آرام مل جائے کہ جس کی جگہ یہ دنیا نہیں بلکہ جنت ہے۔ ایک کام ختم کر لو گے تو دوسرا تمہارے انتظار میں ہے یہاں تک کہ تم ختم ہو جاؤ۔ ارشاد باری تعالی ہے کہ اے انسان! تم نے مشقت پر مشقت جھیل کر زندگی گزارتے ہوئے اپنے رب سے ملاقات کرنی ہے۔ پس عقل مندی یہ ہے کہ اگر مشقت اور آزمائش ہی تقدیر ٹھہری تو یہ مشقت اور آزمائش دین کی خاطر اٹھالی جائے۔

گندگی کا ڈھیر

ہماری اور ہمارے سماج کی مثال گندگی کے ایک ڈھیر کی سی ہے، ہم میں سے ہر کسی نے اپنے حصے کا اچھا گند چن لیا ہے، کہیں مذہبی جماعتوں کے نام پر اور کہیں سیاسی پارٹیوں کی صورت میں۔

حجاب اور زینت

مرد کی زینت داڑھی میں ہے اور عورت کی حجاب میں۔ اور حجاب نہ صرف محبوب کے جمال کو بڑھا دیتا ہے بلکہ عاشق کی طلب کو بھی۔ شاید اللہ کے حجاب میں رہنے کی یہی حکمت ہے۔ کاش کوئی بے حجاب عورتوں کو بھی یہ سمجھا دے۔

ٹائٹس کا فتنہ

عورتوں کے ٹائٹس (tights) پہننے سے جو بے حیائی پھیلی ہے، وہ ان کی برہنگی (nudity) سے بھی نہیں پھیلی تھی۔ مرد کو ٹائٹس پہنی عورت میں، برہنہ عورت سے بڑھ کر جنسی کشش محسوس ہوتی ہے، اس پر بہت جلد ماہرین نفسیات کا اتفاق ہو جائے گا۔

ماں اور بیٹی

ماں اپنی بیٹی سے کیوں خار کھاتی ہے، ہمارے ادیبوں نے اس پر بہت تھیوریز لڑائی ہیں، مجھے ان سے اتفاق نہیں ہے۔ اور مجھے جو سمجھ آیا، میں نے اپنی اس کتاب میں بیان کر دیا ہے۔ ماں بیٹی کی یہ خار عموماً اس گھرانے میں پیدا ہوتی ہے جہاں بیٹی ایک ہو اور بیٹے زیادہ ہوں۔

باپ اور اولاد

ادیبوں نے معروف کر رکھا ہے کہ ماں کی محبت اولاد سے زیادہ ہوتی ہے لیکن میرا مشاہدہ یہ ہے کہ کبھی ماں کی زیادہ ہوتی ہے اور کبھی باپ کی، یہ حالات ہیں جو اس کا تعین کرتے ہیں۔ کبھی بچہ رات بھر بیمار رہتا ہے، ماں کی آنکھ لگ جاتی ہے، لیکن باپ کی نہیں، چاہنے اور حالات کے باوجود بھی نہیں۔

بیوی اور شوہر

ہمارے ناول نگاروں اور شاعروں نے محبوبہ کی محبت کو بہت آئیڈیلائز بھی کیا ہے اور فلوسوفائز بھی لیکن بیوی کی محبت کو نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انہیں اس کا تجربہ

نہیں ہوا، لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ یہ اس محبت کے راز جان نہ سکے۔ طلاق یا عارضی علیحدگی کے بعد کی ذہنی اور قلبی اذیت بتلا رہی ہے کہ محبت بہت شدید تھی۔

بیوی کی دینداری

جو اپنے آپ کو اپنی بیوی سے زیادہ دیندار سمجھتا ہو، وہ عموماً نیک ہونے کے وہم میں مبتلا رہتا ہے۔ اور جو مذہبی آدمی اپنی بیوی کو اپنے سے نیک سمجھتا ہو، اس میں تم عاجزی ہی پاؤ گے۔

جذبات کی زبان

عورت کے کمیونیکیشن ٹولز میں سے اہم ترین "جذبات" ہیں۔ اسی لیے آپ دیکھتے ہیں کہ وہ پل بھر میں کیا سے کیا ہو جاتی ہے اور آپ حیران ہی رہ جاتے ہیں کہ لمحوں میں ہو کیا گیا ہے؟ اگر اپنی بیوی سے اچھے طریقے سے چلنا ہے تو عورت کی کمیونیکیشن کے طریقے کو سمجھنا ہوگا۔ پس لفظ، لاجک، ریزن، نصیحت، مکالمہ وغیرہ کو ایک طرف رکھو اور جذبات کو ہینڈل اور ڈیل کرنا سیکھو تو یہ تمہیں ہمیشہ تمہاری ہی بیوی لگے گی۔ تو بیوی سے جب اختلاف ہو، اسے سمجھانے کی بے وقوفی نہ کرنا۔
تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے کون سے لفظ سے اس کا اچھا بھلا موڈ خراب ہو جائے لیکن کچھ الفاظ ہیں کہ جن سے تم اس کا موڈ ایک منٹ میں ٹھیک کر سکتے ہیں، ان الفاظ کو سیکھو۔ ان کا تعلق لاجک، ریزن اور نصیحت سے نہیں، اس کے جذبات سے ہے اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ "غلطی میری تھی۔"

میاں بیوی کا تعلق

دوست نے کہا کہ میاں بیوی کے مابین اختلاف یا لڑائی کہاں نہیں ہے لیکن کہیں یہ تعلق زندگی بھر قائم رہتا ہے اور کہیں مہینوں بلکہ دنوں میں ختم ہو جاتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟
جواب: میاں بیوی کے تعلق کو ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو وہ دھکے کا تعلق ہے۔

یہ دھکے سے چلتا ہے، یہ دھکا شوہر لگا لے یا بیوی۔ آپ کو سوسائٹی میں ایسے خاندان بھی مل جائیں گے کہ شادی کے شروع میں وہ لڑائی ہوئی کہ بیوی کے جہیز کا سامان ٹرک بھر کر واپس میکے پہنچ گیا لیکن آج نہ صرف ان میاں بیوی کی اولاد ہے بلکہ ان کے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں بھی ہیں۔

میاں بیوی کے تعلق میں یہ خواہش کرنا کہ اختلاف اور لڑائی نہ ہو، تو یہ بالکل غلط خواہش ہے۔ صحت مند زندگی کے لیے جتنا اختلاف ضروری ہے، اتنا ہی لڑائی بھی لیکن یہ دونوں چیزیں اس وقت آپ کے لیے عذاب بن جاتی ہیں جبکہ آپ کو لڑائی کرنا تو خوب آتی ہے لیکن صلح کا تجربہ نہیں ہے۔ قرآن مجید نے تو ازواج مطہرات تک کو طلاق کی دھمکی دی۔ یہ رشتہ ہی ایسا ہے کہ کاؤنسلنگ کرنے والے بیچارے خود بعض اوقات کاؤنسلنگ کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ تو اگر آپ اختلاف اور لڑائی نہیں کرتے تو آپ ذہنی طور بیمار ہیں لیکن اگر زندگی کو آپ نے متوازن بنانا ہے تو پھر کچھ چیزیں مزید سیکھیں۔ میاں بیوی کو چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کو منانا اور ماننا سیکھیں۔

اگر شوہر کو منانا آتا ہو اور بیوی جلد مان جانے والی نہ ہو تو لڑائی آزمائش میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اگر شوہر نے منانا سیکھ لیا ہے تو بیوی کو ماننا سیکھنا پڑے گا یا اس کے برعکس سمجھ لیں۔ میاں بیوی کا آئیڈیل تعلق وہ ہے کہ جس میں محبت موجود ہو کہ قرآن مجید نے کہا کہ اللہ عزوجل نے اس رشتے میں محبت اور الفت ڈال دی ہے۔ اب یہ محبت ہر جگہ موجود ہوتی ہے لیکن میاں بیوی دونوں اس کے اظہار سے ڈرتے ہیں کہ دوسرا سر چڑھ جائے گا۔

میاں بیوی کا رشتہ ایسا ہے کہ اگر کچھ عرصہ ایک ساتھ گزار لیں تو ان کے لیے ایک دوسرے سے علیحدہ رہنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن اس مشکل کو وہ محبت کا نام دینا تو کجا اسے محبت سمجھنے سے بھی کتراتے ہیں۔ اور اس کی وجوہات کئی ایک ہیں؛ کچھ معاشرتی ہیں اور کچھ نفسیاتی ہیں۔ پس جب تک اختلاف اور لڑائی میں دونوں ایک دوسرے کی طرف دل سے کھچاؤ (attraction) محسوس کرتے رہیں تو یہ محبت کی حالت میں ہیں، چاہے اس

کا اظہار نہ بھی کریں۔

لڑائی اور اختلاف میں ہلکی سی گرہ لگ جاتی ہے، بس تھوڑی سی توجہ، یا حوصلے، یا صبر، یا انانیت کو ترک کر دینے سے وہ گرہ کھل جاتی ہے اور بڑی سے بڑی لڑائی بھی یوں محسوس ہوتی ہے کہ جیسے کچھ تھا ہی نہیں۔ بس اس گرہ کو کھولنا سیکھیں، اور یہ سیکھنا تبھی آئے گا جبکہ انانیت کم ہو جائے۔ اور انانیت کو کم کرنے کا ایک نسخہ یہ ہے کہ اگر شوہر بیوی کو دیکھے کہ آج گھر کے کام کاج سے کافی تھک گئی ہے تو اس کے پاؤں دبا دے اور بیوی اگر شوہر کو دیکھے کہ باہر سے کافی تھکا ہارا آیا ہے تو اس کے پاؤں دبا دے۔ کچھ ہی عرصے میں انانیت جاتی رہے گی اور منانا، ماننا بھی سیکھ جائیں گے۔ اللہ جلد مان جانے والے پر رحم فرمائے اور منانے والے پر تو دو گنا رحم فرمائے کہ اس کی قربانی زیادہ ہے اور اسی کی وجہ سے گھر کا ادارہ قائم ہے۔

میاں بیوی کی کاؤنسلنگ

خاندان کسی بھی معاشرے کی بنیادی اکائی (basic unit) ہوتا ہے، اگر یہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے تو معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ جس طرح ایک عمارت اینٹوں سے مل کر بنتی ہے تو معاشرہ، خاندانوں سے مل کر بنتا ہے اور خاندان، میاں بیوی سے بنتا ہے۔ لہذا میاں بیوی کا رشتہ کسی بھی معاشرے کی اصلاح اور بگاڑ میں بنیادی خشت کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ شیطان کا سب سے پسندیدہ گناہ میاں بیوی میں لڑائی کروانا اور جدائی ڈلوانا ہے۔

ہر باشعور شخص اس بات کو شدت سے محسوس کر رہا ہے کہ طلاق، خلع اور علیحدگی کی شرح شادی اور نکاح سے بہت بڑھ گئی ہے۔ ایک سال کے عرصے میں اتنے خاندان آپس میں جڑتے نہیں ہیں جتنے ٹوٹ جاتے ہیں۔ بہر حال اس توڑ پھوڑ کے اسباب اور وجوہات ہوں گی کہ کوئی بھی کام کسی سبب اور وجہ کے بغیر نہیں ہوتا لیکن یہ کہ اس مسئلے کا حل کیا ہے کہ خاندان کو توڑ پھوڑ سے کیسے بچایا جائے؟ تو اس کا بہترین حل میاں بیوی کی کاؤنسلنگ ہے۔

کاؤنسلنگ یہ ہے کہ میاں بیوی دونوں اپنا مسئلہ کسی تیسرے آدمی کے سامنے رکھیں کہ جس پر ان کو اعتماد ہو اور وہ تیسرا شخص پوری دیانتداری کے ساتھ ان کے اختلافات میں دونوں کو نصیحت کرے کیونکہ شکایت دونوں طرف سے ہوتی ہے اور عموماً کوتاہی بھی دونوں طرف سے ہی ہوتی ہے لہذا نصیحت بھی دونوں ہی کو ہونی چاہیے۔ البتہ کسی کسی کیس میں کوتاہی کسی ایک ہی کی جانب سے بھی ہو سکتی ہے۔

میاں بیوی کے جھگڑے عموماً چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہوتے ہیں لیکن ذرہ سی انا پر طول پکڑ جاتے ہیں اور ذرہ سے جھک جانے پر ختم ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں شوہر کو زیادہ سمجھانا چاہیے کہ وہ گھر کا بڑا ہے لہذا سمجھداری کی توقع بھی اسی سے ہی ہے کہ عموماً عورتوں کا مسئلہ بس صرف تھوڑی سی توجہ کا ہوتا ہے، جب انہیں وہ توجہ مل جائے، تو ان کا جھگڑا بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اور شوہر اپنی انا اور ضد کی وجہ سے وہ تھوڑی سی توجہ دینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔

یہ بھی درست ہے کہ میاں بیوی کے بعض مسائل واقعتاً بڑے بھی ہوتے ہیں جیسا کہ شوہر کو بیوی یا بیوی کو شوہر کے کردار پر شک ہے۔ قرآن اکیڈمی میں ریسرچ سینٹر میں آٹھ سالہ ملازمت کے دوران بہت سے جوڑوں کی کاؤنسلنگ کا موقع ملا بلکہ اب بھی گاہے بگاہے جاری رہتی ہے تو اس حوالے سے ایک سوالنامہ ترتیب دیا جو کہ پوسٹ کے ساتھ ملحق امیج کی صورت میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

کافی عرصے سے یہ خواہش تھی کہ سائیکو اینالسس کی تھیوری کی روشنی میں کچھ علماء اور سائیکالوجسٹ مل کر کوئی ایسا فورم تشکیل دیں کہ جہاں مذہب اور سائیکالوجی کی روشنی میں میاں بیوی کی کاؤنسلنگ کی جاتی ہو۔ بہر حال وہ تو فی الحال ایک خواب ہی ہے لیکن جو علماء، سائیکالوجی سے دلچسپی رکھتے ہوں اور میاں بیوی میں صلح کروانے کی خواہش بھی ہو تو ملحق سوالنامہ کی رہنمائی میں کچھ نہ کچھ حصہ اس کار خیر میں ڈال سکتے ہیں۔ کاؤنسلنگ سے ضروری نہیں ہے کہ میاں بیوی کا مسئلہ حل ہو جائے لیکن انہیں کم از کم اتنا پتا ضرور چل جائے گا کہ ان کے مسئلے کا حل کیا ہے؟

بیوی پر بلاوجہ کی ٹینشن نہ نکالیں

یہ آپ کی اپنی بیوی ہے، اس پر بلاوجہ کی ٹینشن نہ نکالیں۔ آپ اپنے ارد گرد نظر دوڑائیں تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاشرے کا ہر فرد افراتفری کے عالم میں زندگی گزار رہا ہے۔ ہر شخص عجلت میں ہے، اگر کوئی دعوت ولیمہ پر جا رہا ہے تو گاڑی ایسے ڈرائیو کر رہا ہوتا ہے جیسے کسی کے جنازے پر پہنچنا ہو۔ یہ معاشرہ جلد بازوں اور عجلت پسندوں کا معاشرہ بن چکا ہے۔ اور جہاں عجلت اور جلد بازی ہوتی ہے، وہاں ٹینشن بڑھ جاتی ہے۔

ہماری معاشرتی زندگی کا دوسرا بڑا پہلو کاموں کا دباؤ ہے۔ ایک جان اور لاکھوں کام۔ معاشرت کے جدید اسٹائل نے ہمارے کاموں کو بہت بڑھا دیا ہے۔ خاص طور شہروں میں تو لوگوں کے پاس سوچنے کا بھی وقت نہیں ہے۔ گھر سے چھوٹا سا کام کرنے نکلتے ہیں تو ٹریفک کے ہجوم کی وجہ سے گھنٹوں لگ جاتے ہیں۔ بے برکتی اتنی ہے کہ کوئی کام وقت پر نہیں ہو پاتا اور ہر کام میں سے دو کام نکل آتے ہیں۔ اور جب کام ہاتھ میں نہیں آ پا رہے ہوتے تو ٹینشن بڑھتی ہے۔ یہ میاں بیوی دونوں کے ساتھ ہوتا ہے، خاص طور جبکہ بیوی ملازمت کرتی ہو۔

مردوں کی ٹینشن بڑھنے کی اور بھی وجوہات ہوتی ہیں، لیکن فہرست لمبی ہو جائے گی۔ کام کی بات یہ ہے کہ ٹینشن بڑھنے سے انسان کی برداشت کم ہو جاتی ہے اور اسے جلدی غصہ آنے لگتا ہے کہ جسے ہم کہتے ہیں کہ وہ "شارٹ ٹمپرڈ" ہو گیا ہے۔ اور جب انسان کو غصہ جلدی آنے لگے تو وہ نکلتا بھی جلدی ہے۔ اور جب غصہ جلدی نکلتا ہے تو ظاہری بات ہے کہ غلط ہی نکلتا ہے، وہ صحیح جگہ نہیں نکلتا۔ اور غصہ اگر غلط جگہ کیا گیا ہے تو اس کا حساب تو دینا ہو گا۔

عموماً ایسا ہوتا ہے کہ کاموں کے دباؤ یا تاخیر کی وجہ سے انسان ٹینشن کی کیفیت میں ہوتا ہے اور لاشعوری طور پر یہ ٹینشن اپنے بیوی بچوں پر نکالتا رہتا ہے۔ اور ظاہری بات ہے کہ ٹینشن، ٹینشن ہی پیدا کرتی ہے۔ بیوی بھی اس سے ٹینس ہو جاتی ہے۔ اور اگر بیوی شریف النفس ہو تو دبی رہتی ہے اور سن لیتی ہے لیکن اس کے اندرونی نفسیاتی مسائل بڑھ

جاتے ہیں۔اور اگر دبنگ ہو تو جواب میں وہ بھی ٹینشن نکالتی ہے اور بعض اوقات تو سیر کو سوا سیر کا جواب مل جاتا ہے۔اور آہستہ آہستہ ایسا وقت بھی آ جاتا ہے کہ ایسے میاں بیوی عوامی مقامات (public places) پر آپ کو ایک دوسرے پر چیختے چلاتے اور شاؤٹ کرتے بھی مل جائیں گے۔

کبھی کبھی تو دل کرتا ہے کہ میاں بیوی کی کاؤنسلنگ کا کوئی ادارہ ہی کھول لوں۔ نفسیات تو ساری اب سائیکٹری (Psychiatry) بن چکی ہے کہ ڈاکٹر کے پاس آسان علاج ہے کہ نینداور سکون کی دوائیاں دے کر جان چھڑوالواور میاں بیوی کو ڈرگ ایڈکشن میں مبتلا کر دو۔ بھئی، نینداور سکون سے ان کا مسئلہ تو حل نہیں ہونا۔ میاں بیوی کو پہلے ان کا مسئلہ بتاؤ، معاشرت پر غور کرو، دماغ لڑاؤ، پھر ذہن کے کام کرنے کے اسالیب پر غور کرو، پھر ان کی کاؤنسلنگ کروتو مسئلہ حل ہو گا۔

جدید معاشرتی لائف اسٹائل، کام کے دباؤ کی وجہ ہے۔کام کا دباؤ یا کوئی کام وقت پر نہ ہو سکنا، غصے کی وجہ ہے۔ غصہ کرنا، لڑائی کی وجہ ہے۔اور لڑائی، دماغی مسائل کی وجہ ہے۔ سکون آور گولیاں کھانے کی بجائے اپنے لائف اسٹائل اور کاموں کی فہرست کو ریوائز کرو۔ شوہر اپنے کام کم کر لے اور بیوی اپنے کام کم کر لے۔ شوہر، بیوی کو وقت دے اور بیوی، شوہر کو وقت دے۔اور دونوں اسمارٹ فون اور لیپ ٹاپ کا وقت بچوں کو دیں۔ہم بھی کتنے سادہ ہیں کہ دن بھر کی تھکاوٹ کے بعد ریلیکس ہونے کے لیے واٹس ایپ اور فیس بک پر بیٹھتے ہیں اور اپنے آپ کو مزید تھکا لیتے ہیں کہ یہ بھی ایک ذہنی کام ہی ہے۔

بیوی کے ساتھ زبردستی کرنا

بیوی کے ساتھ زبردستی تعلق قائم کرنے کے (marital rap) بارے سوالات بہت تیزی سے بڑھتے چلے جارہے ہیں، میاں بیوی دونوں کی طرف سے۔اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے فی الحال تین بڑے پہلو ہیں؛ مذہبی، نفسیاتی اور قانونی۔ مذہبی اعتبار سے بیوی اس بات کی پابند ہے کہ جب اس کا شوہر اسے اپنے بستر پر بلائے تو وہ انکار نہ

کرے اور اگر وہ انکار کرے تو اس پر ساری رات فرشتوں کی لعنت رہتی ہے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ یہ بات عورت کو سمجھ نہیں آسکتی کیونکہ وہ مرد نہیں ہے اور مرد کی سائیکالوجی کو نہیں سمجھ سکتی، البتہ فرائیڈ اگر یہ بات کرتا تو اس پر ہزاروں نہ سہی تو سینکڑوں کتابیں ضرور لکھی جا چکی ہوتیں۔

پس اگر بیوی اپنے شوہر کو انکار کر دے تو شوہر اپنی بیوی سے زبردستی کر سکتا ہے یا نہیں؟ تو اس بارے فقہاء کا کہنا یہ ہے کہ بیوی کا یہ انکار کرنا "نشوز" یعنی سرکشی ہے اور نشوز کے بارے قرآن مجید نے یہ ہدایت دی ہے کہ پہلے اپنی بیوی کو وعظ کرے، اگر اس سے مسئلہ حل نہ ہو تو بستر علیحدہ کر لے، اگر اس سے مسئلہ حل نہ ہو تو اس پر سختی کرے۔ اگر تو اس کے باوجود بیوی انکار پر اصرار کرے تو وہ نان نفقے کی مستحق نہیں رہتی۔ لیکن یہاں یہ فرق ملحوظ رہے کہ فقہاء کے نزدیک اس انکار سے مراد بیوی کا بلاوجہ انکار کرنا ہے اور اگر انکار کی کوئی وجہ ہے جیسے بیوی بیمار ہے تو اس کا یہ حکم نہیں ہے۔

اس مسئلے کا دوسرا پہلو نفسیاتی ہے کہ عورت کی نفسیات یہ ہے کہ اس کے لیے یہ برداشت کرنا مشکل ہے کہ اس کے ساتھ زبردستی کا کوئی تعلق قائم کیا جائے۔ وہ یہ چاہتی ہے کہ جب وہ خود اپنے آپ کو مرد کے سپرد کرنے کے لیے دلی طور تیار ہو جائے تو اس وقت اس سے ایسا تعلق قائم کیا جائے، ورنہ تو اس کے لیے شدید ذہنی اور نفسیاتی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں، ان میں سے ایک اس فعل سے ہی نفرت کرنا یا خود خاوند سے نفرت کرنا بھی شامل ہے۔ اکثر بیویوں کے اپنے خاوندوں سے بھاگنے کی وجہ یہی ہے کہ ان سے ان کی رضامندی کے بغیر تعلق قائم کر لیا جاتا ہے جو ان کے ذہنی مسائل کا باعث بن جاتا ہے۔

میرے خیال میں اعلی اخلاق یہی ہیں کہ اگر خاوند کے ہاتھ لگانے پر بیوی اس کے ہاتھ کو جھڑک دے تو اس کو ہاتھ لگانے کا خیال بھی دل سے نکال دے۔ اور یہی رویہ اللہ کے رسول ﷺ کے حوالے سے ہمیں ملتا ہے کہ جب آپ کے ہاتھ لگانے پر آپ کی ایک منکوحہ نے غلط فہمی میں اعوذ باللہ پڑھ دی تو طبیعت کی نفاست کی وجہ سے رسول اللہ

ﷺ نے اتنی بات پر اس سے علیحدگی اختیار کر لی کہ شاید اسے میرا ہاتھ لگانا پسند نہیں آیا لہذا اس لیے اس نے اعوذ باللہ پڑھی ہے جبکہ اس منکوحہ کو کسی اور زوجہ محترمہ نے یہ کہا تھا اور جان بوجھ کر کہا تھا کہ وہ آپ ﷺ کے مزاج کو جانتی تھیں اور پسند نہیں کرتی تھیں کہ آپ کی زوجیت میں کسی اور خاتون کا اضافہ ہو۔

ہمارے ہاں عموماً جو شادیاں ہوتی ہیں تو لڑکے اور لڑکی میں پہلے سے کوئی مانوسیت اور الفت نہیں ہوتی لہذا ایسی صورت میں پہلے دن ہی ایسا تعلق قائم کرنا عموماً لڑکی کے لیے ایک ذہنی اذیت کا سبب بن جاتا ہے اور اس فعل سے نفرت ساری زندگی کے لیے اس کے لاشعور کا حصہ بن جاتی ہے۔ آپ کی بیوی اگر پہلے دن آپ کو ہاتھ لگانے سے روکتی ہے تو میرے خیال میں یہ فطری چیز ہے، اسے وقت لینے دیں۔ دو تین دن میں بات چیت سے مانوسیت پیدا کریں اور پھر کوئی ایسا تعلق قائم کریں ورنہ آپ اسے ذہنی مریض بھی بنا سکتے ہیں، خاص طور اس تعلق کے حوالے سے۔ نکاح کے دو بول سے اگرچہ حقیقت تو تبدیل ہو گئی ہے کہ وہ آپ کی منکوحہ بن گئی ہے لیکن ایک پردہ دار خاتون کے لیے اسے ذہناً قبول کرنے میں کچھ وقت لگتا ہے کہ کوئی اس کے پورے جسم کا مالک بن چکا ہے، اور وہ بھی چند لمحوں میں۔

اس مسئلے کا تیسرا پہلو قانونی ہے تو بعض ممالک میں بیوی کے ساتھ زبردستی کو ایک جرم سمجھا جاتا ہے کہ جس کی سزا بھی ہے جیسا کہ امریکہ، برطانیہ، روس، جاپان اور ترکی وغیرہ میں یہ ایک جرم ہے کہ شوہر یا بیوی میں سے کوئی بھی اپنے پارٹنر کے ساتھ زبردستی تعلق قائم کرے اور اکثر یورپین ممالک میں یہ ایک جرم ہی ہے۔ جبکہ دوسری طرف اکثر مسلم اور مشرقی ممالک مثلاً انڈونیشیا، ملائیشیا، سعودی عرب، ایران، چین، انڈیا وغیرہ میں یہ جرم تصور نہیں ہوتا اور یہی بات درست ہے۔

ٹھیک ہے کہ بیوی لونڈی نہیں ہے، بیوی اور لونڈی میں یہی فرق ہوتا ہے کہ بیوی سے زبردستی نہیں کی جاتی لیکن ایسی صورت میں بیوی اگر اتنی ہی تنگ ہے تو اس کے پاس خلع کا آپشن تو موجود ہے۔ اب یہ کیا بات ہوئی کہ اس نے رہنا بھی اسی شوہر کے

ساتھ ہے،اور شوہر سے نان نفقہ بھی پورا لینا ہے اور اس کے حق کی بات آئے تو اب بیوی کہے کہ میرے نفسیاتی مسائل ہیں، ذہنی ہم آہنگی کے بغیر میں اپنا آپ اس کے حوالے کیسے کر سکتی ہوں؟ تو بی بی پھر ایسے شوہر سے علیحدگی لے لو یا پھر کم از کم اس سے نان نفقے کا مطالبہ ہی بند کر دو کہ اسے تو اس پر لگایا ہوا ہے کہ وہ تمہارے مسائل سمجھے لیکن یہ کہ تم اس کے مسائل کو کنسڈر کرو تو یہ بات تمہیں سمجھ نہیں آتی۔ اور اس کے اصرار پر وہ تمہیں "جنسی حیوان" لگنے لگتا ہے لیکن وہ تو نان نفقے کے مطالبے پر تمہیں "معاشی حیوان" نہیں کہہ رہا۔

خلاصہ کلام یہی ہے کہ مزاج کی نفاست اور اعلی اخلاق کا تقاضا یہی ہے کہ شوہر اس معاملے میں بیوی کے ساتھ زبردستی نہ کرے بلکہ افہام و تفہیم سے اس مسئلے کو حل کرے، اور اگر اس سے مسئلہ حل نہ ہو تو اگر زیادہ تنگ ہے تو بیوی کا نان نفقہ بند کر دے۔ لیکن اگر شوہر ایسا کر لے تو یہ کوئی گناہ یا جرم نہیں ہے کہ جس کے لیے شوہر پر کوئی اخروی یا دنیاوی سزا لاگو ہو اور ایسی صورت میں اگر بیوی کے لیے نفسیاتی مسائل پیدا ہوں تو اس کے لیے خلع کا رستہ کھلا ہے۔ اگر ذہنی ہم آہنگی نہیں ہے اور شوہر سے واقعی میں کچھ فائدہ بھی حاصل نہیں ہو رہا تو پھر بہتر یہی ہے کہ شوہر کو صبر کی تلقین کرنے کی بجائے اس سے علیحدگی اختیار کر لی جائے۔ واللہ اعلم بالصواب

میاں بیوی میں اورل سیکس

کچھ دوست میاں بیوی میں اورل سیکس کے بارے سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ جائز ہے؟ جواب: اورل سیکس مشرقی عورت کے لیے تو ایک ذہنی اذیت ہے ہی کہ بچوں کو پالنے کے ساتھ گھر بار کو سنبھالنا، خاوند کے خاندان کو سنبھالنا یا ملازمت کرنے وغیرہ جیسی ذمہ داریوں کے ساتھ ستر فی صد کو تو سیکس میں ہی ذرہ برابر دلچسپی محسوس نہیں ہوتی چہ جائیکہ انہیں اورل سیکس میں رغبت ہو لہذا ان کی اکثریت کے لیے یہ ایک ذہنی عذاب ہی ہے۔

جہاں تک شوہروں کی بات ہے تو ان کا یہ مسئلہ ہے بلکہ بڑا مسئلہ ہے کہ وہ یہ سب

کچھ اپنی بیوی سے چاہتے ہیں جو طوائفوں سے کیا جاتا ہے۔اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب سے انٹرنیٹ آیا ہے تو یہ بیماری بڑھ گئی ہے۔اکثر شادی شدہ نوجوان بلکہ جن کی بیٹیاں بھی جوان ہیں،وہ بھی لیپ ٹاپ، کمپیوٹر وغیرہ پر بیٹھ کر فحش ویب سائیٹس وزٹ کرتے ہیں اور اپنی سیکس کی خواہش کی تسکین کے لیے اپنے ذہن میں ایک آئیڈیل بنا لیتے ہیں کہ ہمیں بھی اپنی بیوی سے ایسے ایسے لذت حاصل کرنی ہے۔

یہ بات پورے دعوے سے کی جاسکتی ہے کہ سو میں سے نوے شوہر کہ جنہیں اورل سیکس کا خیال آتا ہے،انہوں نے فحش ویب سائیٹ وزٹ کر رکھی ہوتی ہیں۔تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اورل سیکس کا خیال بھی فطری نہیں ہے بلکہ کسی سبب سے ہے اور وہ سبب فحش ویڈیوز ہیں۔آپ سبب ختم کر دیں،آپ کو اس کا خیال آنا بند ہو جائے گا۔یہ انسان کی فطرت میں ہے ہی نہیں۔مرد میں اورل سیکس کی خواہش اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ سیکس اس کے ذہن میں گھس جائے۔اگر کسی نے ذہن میں بٹھا ہی لیا ہے کہ اسے اپنے پالتو کتے سے مزہ آنا ہے تو اسے آنا ہی ہے لیکن یہ صرف ذہنی تسکین ہے نہ کہ جسمانی۔اس لیے اصل لذت اور مزہ تو وہاں ہی ہے جہاں قرآن مجید نے حکم دیا ہے یا جو انسانی فطرت میں شامل ہے،اور رہی غیر فطری مقامات سے لذت حاصل کرنے کی بات تو یہ ذہن میں حاصل ہوتی ہے کہ یہ پیدا بھی وہیں ہوئی تھی۔

اور سیکس جب ذہن میں گھس جائے تو پھر اس خواہش کی تسکین ممکن نہیں ہے۔یہ بے چارہ ہر وقت پریشان رہے گا اور اس کی توجیہ یہ کرے گا کہ میرے اندر اللہ نے عام انسانوں سے زیادہ جنسی خواہش رکھی ہے،بے وقوف نہ ہو تو۔بس سیکس ایک ضرورت ہے،اسے ضرورت سمجھیں اور قرآن مجید نے تو اس کے بیان کے وقت کہا کہ اولاد کے حصول کی نیت سے بیوی کے پاس جاؤ،یعنی ایک تو اس کو بامقصد بنا دیا کہ تمہاری جنسی خواہش کی تکمیل بھی اللہ کے گرینڈ پلان کا حصہ بن جائے اور دوسرا یہ کہ اولاد کی نیت سے بیوی کے پاس جاؤ گے تو یہ ضرورت تو رہے گا لیکن ذہن پر سوار نہیں ہو گا۔ارشاد باری تعالی ہے: ﴿نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ وَقَدِّمُوا

لِأَنْفُسِكُمْ﴾ [البقرۃ: 223] ترجمہ: تمہاری بیویاں تمہارے لیے کھیتی ہیں۔ پس تم اپنی کھیتی کے پاس آؤ جیسے تم چاہو اور اپنے آگے کے لیے کچھ کرتے رہو۔ لیکن اس بات کے بیان کا یہ مقصد نہیں ہے کہ اولاد کے حصول کی نیت کے علاوہ نفس کی تسکین کے مقصد سے بیوی کے پاس جانے سے منع کیا گیا ہے۔ ہم نے صرف اتنی بات کی ہے کہ بیوی کے پاس جانے کے جو مقاصد ہیں، ان میں سے اعلی ترین مقصد اولاد کا حصول ہے جبکہ نفس کی تسکین ایک ادنی مقصد ہے۔ اور نفس کی تسکین بھی اس جذبے کے ساتھ ہو کہ نفس خوش ہو گا تو اللہ کا شکر اچھی طرح سے ادا کرے گا۔

شرعی مسئلے کے طور مجھے یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اورل سیکس سے اجتناب کرنا چاہیے کہ قرآن مجید نے عورتوں کو کھیتی سے تشبیہ دی ہے اور کہا ہے کہ تم کھیتی میں آؤ۔ اور کھیتی وہ مقام ہے جہاں بیج بویا جا سکے اور فصل حاصل ہوتی ہو اور یہ عورت میں مادر رحم کا مقام ہے کہ جہاں سے انسان کو اولاد حاصل ہوتی ہے۔ انسان کا نطفہ ایک طرح سے بیج ہے تو اس سے حاصل ہونے والی اولاد فصل ہے۔ جب زندگی بے مقصد ہو، ذہن خالی ہو تو سیکس برائے سیکس کا خیال آئے گا لیکن اگر زندگی بامقصد ہے تو انسان سیکس کو ایک ضرورت سے زیادہ کی حیثیت نہیں دے سکتا، یہ طے ہے۔

اگر قانونی بات کریں تو مذی سب فقہاء کے نزدیک نجس ہے اور مذی سے مراد وہ سفید رنگ کا مادہ ہے کہ جس کا شرم گاہ سے اخراج شہوت کے وقت منی سے پہلے ہوتا ہے۔ مذی کے اخراج پر غسل فرض نہیں ہے بلکہ صرف وضو ہے جبکہ منی کے اخراج پر غسل فرض ہو جاتا ہے۔ اور مذی اور منی میں فرق یہ ہے کہ منی اچھل کر باہر نکلتی ہے اور اس کے اخراج سے انسان کی خواہش پوری ہو جاتی ہے اور وہ سکون میں آ جاتا ہے۔ لیکن مذی نہ تو جھٹکے سے خارج ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے اخراج سے خواہش پوری ہوتی ہے۔ تو اورل سیکس کی صورت میں مذی کی نجاست سے منہ کا ملوث ہونا لازمی امر ہے اور اہل ایمان کو ہر قسم کی نجاست سے دور رہنے کا حکم دیا گیا ہے بلکہ اہل ایمان کے بارے تو یہ کہا گیا ہے کہ وہ جو کہ پاک صاف رہنے میں مبالغہ کرنے والے ہوتے ہیں، اللہ عزوجل ان

سے محبت رکھتے ہیں۔

اب ہو سکتا ہے کہ کچھ شرمیلے مولوی دوست یہ کہیں کہ حافظ صاحب کیا موضوع لے بیٹھے ہیں؟ بھئی، مجھے تو یہ پتہ ہے کہ اگر ابا جان اپنے بیٹے کو جو کہ بالغ ہونے کے قریب ہے، نہیں بتلائیں گے کہ بلوغت کیا ہوتی ہے، کیسے ہوتی ہے، اور اس کے کیا مسائل ہیں؟ تو اس نے سیکھ تو لینا ہی ہے جیسے آپ نے سیکھ لیا لیکن پھر باہر سے سیکھے گا۔ اور باہر سے جو اس کو سکھلائے گا تو وہ صرف یہ نہیں بلکہ اور کچھ بھی سکھلا دے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ علماء ایسے موضوعات پر بات کریں اور لوگوں میں آگاہی پیدا کریں ورنہ تو وہ یہ سب کچھ سیکھ ہی رہے ہیں۔ آپ شرم شرم کرتے خاموش رہیں گے اور معاشرے میں سیکس سیکس ہوتا رہے گا۔ واللہ اعلم

کنواروں اور کنواریوں کی خدمت میں

غیر شادی شدہ بچوں اور بچیوں کی باتیں سنو تو یقین مانیں خوف آتا ہے کہ کس تخیلاتی دنیا میں رہتے ہیں اور اس تخیل کی دنیا کے پیدا کرنے میں سارا کردار میڈیا یعنی فلم انڈسٹری کا ہے۔ لڑکا ہے تو اس کا خیال یہ ہے کہ شادی کے بعد بس ایک خادمہ ہاتھ آ جائے گی کہ جو صبح سے شام تک اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہے گی، مزے مزے کے کھانے کھانے کو ملیں گے، خوب عیاشی ہو گی وغیرہ وغیرہ

اور لڑکی ہے تو وہ یہ خواب دیکھ رہی ہے کہ شادی کے بعد ایک ایسا خزانچی ہاتھ آ جائے گا جو صبح سے شام اس کی خواہشات کی تکمیل کے لیے روپیہ پیسہ خرچ کرنے کو اپنے لیے فخر جانے گا۔ شوہر کی صورت میں ایک اے۔ٹی۔ایم (ATM) کارڈ مل جائے گا اور ڈھیر شاپنگ ہو گی، دل کھول کر، وغیرہ وغیرہ

اللہ کے بندو! اس تخیل (fantasy) سے نکلو۔ شادی ایک ذمہ داری کا بندھن ہے، مرد کے لیے بھی اور عورت کے لیے بھی۔ اس ذمہ داری کو ادا کیے بغیر یہ ایک مہینہ بھی نہیں چل سکتا۔ شادی کی صورت میں عیاشی کا تصور صرف فلموں میں ہوتا ہے جبکہ حقیقی زندگی میں تلخ حقائق کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان میں سے یہ بھی ہے کہ شوہر کو ناشتہ

خود سے بھی بنانا پڑتا ہے اور بیوی کو میک اپ کا سامان خریدنے کے لیے خود کے پیسے بھی لگانے پڑتے ہیں۔

شادی ایجاب و قبول کا نام ہے اور ایجاب عربی زبان کا لفظ ہے کہ جس کا معنی واجب کرنا ہے۔ ہمارے ہاں مرد حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ قبول کا معنی ہے کہ ہم نے لڑکی قبولی ہے۔ بلکہ قبول وہ کیا ہے کہ جس کا ایجاب ہوا ہے یعنی جو تم پر واجب کیا گیا ہے۔ اور واجب کیا گیا ہے؟ وہ لڑکی کی ذمہ داری ہے۔ لڑکی کا والد یا سرپرست یہ کہتا ہے کہ یہ لڑکی اب تک میری ذمہ داری میں تھی یعنی اس کا نان نفقہ، اس کی حفاظت وغیرہ۔ اب میں اس لڑکی کی ذمہ داری تم پر واجب کرتا ہوں، کیا تمہیں یہ ذمہ داری قبول ہے؟ تو وہ اسے قبول کر لیتا ہے۔

اب ذمہ داری کا ذکر تو نہ نکاح کروانے والے مولوی صاحب کے علم میں ہے اور نہ ہی دولہا کی معلومات میں اور قبول قبول کرنے کا شوق چڑھا ہوا ہے۔ اور جب ذمہ داری کندھوں پر آن پڑھتی ہے تو پھر پوچھتے ہیں کہ اسے شادی کہتے ہیں؟ اس سے تو کنوارے ہی بھلے تھے۔ تم نے صرف بیوی نہیں قبولی، اس کا خاندان بھی قبولا ہے لہذا ان کی خدمت کرو۔ اور لڑکی نے بھی صرف لڑکا نہیں قبولا، اس کا خاندان بھی قبولا ہے لہذا ان کے کام آؤ۔ نہیں مانتے تو نہ مانو، سسرالی خود ہی منوا لیں گے۔

شادی کس سے کریں؟

اکثر دوست مشورہ لیتے ہیں کہ ان کا کہیں رشتہ چل رہا ہے اور یہ یہ مسائل ہیں تو کیا انھیں شادی کر لینی چاہیے یا نہیں؟ تو میں نے سوچا اس بارے بھی ایک عمومی پوسٹ لگا دوں۔ اکثر لڑکوں کا سوال ہوتا ہے کہ انھیں لڑکی پسند نہیں آئی تو کیا انھیں شادی کر لینی چاہیے، اسی طرح لڑکیوں کا بھی یہ مسئلہ ہو سکتا ہے کہ انھیں لڑکا پسند نہ آیا ہو۔

دیکھیں، دنیا میں شادی کرتے وقت عموماً چھ چیزوں کو دیکھا جاتا ہے؛ دین، خاندان، شکل و صورت، مال و دولت، ملازمت اور تعلیم۔ لوگوں کی اپنی اپنی ترجیحات ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ سب چیزیں آپ کو ایک ساتھ نہیں ملتی، کہیں نہ کہیں آپ کو کمپرومائز

کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں زیادہ تر یہ دیکھا جاتا ہے کہ لڑکے کی ملازمت اچھی ہو اور لڑکی کی شکل وصورت۔ ملازمت اچھی ہو تو لڑکی والے خاندان بلکہ شکل وصورت پر بھی کمپرومائز کر لیتے ہیں۔ اور کسی حد تک بات سمجھ میں بھی آتی ہے کہ گھر کا خرچہ چلانا مرد کی ذمہ داری ہے لہذا اگر وہ اسی کا اہل نہیں ہو گا تو گھر کیسے چلے گا؟

اور پسند دو قسم کی ہوتی ہے؛ ایک آئیڈیل، جو کبھی نہیں ملتی، صرف ذہن میں ہوتی ہے، اس کے چکر سے نکل جانا چاہیے۔ آپ کو زندگی میں آئیڈیل ضرور مل جائے گا لیکن آپ اس کے آئیڈیل نہیں ہوں گے۔ دوسری یہ کہ لڑکا یا لڑکی بس اچھی ہو، چاہے اتنی نہ ہو کہ جتنا آپ کے ذہن میں ہے، اسی پسند کی کوشش کرنی چاہیے۔ البتہ تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ لڑکے یا لڑکی کی شکل وصورت ایسی ہے کہ جو انسان کو بری لگے، تو ایسی صورت میں شادی نہ کریں۔ اچھا نہ لگنا اور برا لگنا یہ دو علیحدہ باتیں ہیں، ذرہ سے لفظ کے اختلاف سے معنی بدل جاتا ہے، اس کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ لسانیات اور نفسیات کا بہت گہرا تعلق ہے۔

تو یہاں دو باتیں ہوئیں؛ اگر تو لڑکا یا لڑکی وہ بری لگی تو شادی نہ کریں اور اگر اچھا یا اچھی نہیں لگی تو ایسی صورت میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کو اچھے نہیں لگتے لیکن ساتھ رہنے سے مانوسیت اور الفت پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ دوستوں میں ایک ساتھ رہنے سے مانوسیت اور الفت پیدا ہو جاتی ہے۔ پس اس صورت میں استخارہ کر لیں، ایک دن، دو دن، سات دن کر لیں، پھر دل کا میلان اور ذہن کا رجحان دیکھیں، جس طرف ہو وہ کام کر لیں۔ شادی میں مال کو اہمیت دینا تو بے کار سمجھتا ہوں لیکن خاندان کو ضرور اہمیت دینی چاہیے، خاندانی صفات ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اولاد کے DNA میں نصف انفارمیشن باپ سے آتی ہے اور نصف ماں سے۔

دوسری وجہ کہ جس کو سب سے زیادہ شادی میں بنیاد بنایا جاتا ہے، دینداری ہے۔ دینداری میں زیادہ اہم میرے خیال میں عبادات یعنی پردہ اور داڑھی وغیرہ کی نسبت اخلاق یعنی رویے ہیں۔ بس اگر اخلاق اچھے ہوں تو رشتہ طے کرنے میں بالکل دیر نہ

لگائیں۔ گھر کا سسٹم اخلاق سے چلتا ہے نہ کہ عبادات سے۔ عبادات، اللہ سے تعلق کی بنیاد ہے اور اخلاق بندوں سے تعلق ہے۔ گھر کا نظام چلانے کے لیے میاں بیوی کا آپس کا تعلق اچھا ہونا زیادہ ضروری ہے، باقی اللہ سے بھی تعلق بہت اچھا ہو تو یہ آئیڈیل ہے ورنہ فرض کی پابندی اور حرام سے اجتناب کی کم از کم کوشش تو ہو۔ اور احادیث میں جہاں رشتوں میں دینداری کو ترجیح دینے کا حکم ہے، وہاں بعض طرق (chains) میں بھی اخلاق کا ذکر ہے۔

دیندار لڑکے سے شادی کا شوق کرنے والی لڑکیوں کی خدمت میں

دو دن پہلے برادر مغیرہ لقمان نے ایک مختصر سی پوسٹ لگائی لیکن موضوع بہت اہم تھا لہذا میں ان کی مختصر پوسٹ کے بعد کچھ اپنا تبصرہ بھی شیئر کر رہا ہوں۔ مغیرہ لقمان کا کہنا تھا:

“Sisters looking for a 'family guy' husband, my recommendation is not to marry a missionary or an active Da'ee. It's a sacrifice!”

اپنے دوستوں اور ارد گرد بہت دیکھنے میں آیا ہے کہ مذہبی ذہن رکھنے والی لڑکیاں، ایسے دیندار لڑکوں سے شادی کو پسند کرتی ہیں کہ جو دین کے لیے کچھ کر رہے ہوں یا کرنا چاہتے ہوں جو کہ خود سے اچھی بات ہے لیکن عموماً شادی کے بعد خود اس کی دینی ایکٹوٹی میں سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ شادی سے پہلے دین کے بارے ان کے جذبات اس مجاہد کے سے ہوتے ہیں جو گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر میدان جنگ کا نظارہ کر رہا ہو اور شادی کے بعد ان کی حالت میدان جنگ سے بھاگے ہوئے ایک سپاہی کی سی ہوتی ہے۔ براہ مہربانی غیر شادی خواتین اس پوسٹ پر کمنٹ نہ کریں کہ وہ شادی سے پہلے اس مسئلے کو سمجھ ہی نہیں سکتیں۔

بردار مغیرہ کا مشورہ سو فی صد درست ہے، یہ مشورہ بھی ہے اور نصیحت بھی۔ دیکھیں، دنیا میں کوئی بھی بڑا کام قربانی اور ایثار کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اور قربانی اور ایثار ہو

سکتی ہے یا نہیں، اس کا پتہ تب چلتا ہے جبکہ قربانی بالفعل دینی پڑ جائے۔ اگر آپ نے کسی ایسے لڑکے سے شادی کرنی ہے کہ جسے مولانا مودودی، ڈاکٹر اسرار، ڈاکٹر ذاکر نائیک، مولانا طارق جمیل یا نعمان علی خان وغیرہ بننا ہو تو ایسی شخصیات عموماً غیر متوازن گھریلو زندگی کے بغیر نہیں بنتیں۔ اس قاعدے میں استثناء (exception) صرف رسول اللہ ﷺ کا ہے یا دوسرا اس شخص کا جو اس کا دعوی کرے اور اس کے اہل خانہ سب کے سب اس کے دعوی سے متفق ہوں۔

آپ مذہب کی بجائے دیگر علوم میں چلے جائیں، آئن اسٹائن کو لے لیں۔ آئن اسٹائن کی پہلی بیوی خود ماہر فزکس تھی لیکن شادی اور بچوں کے بعد فزکس کے بارے اس کے جذبات ٹھنڈے پڑ چکے تھے اور یہ اس کے بچوں کی گواہی ہے۔ یہ شادی 1903ء میں ہوئی اور 1914ء میں دونوں کے مابین علیحدگی ہو گئی۔ جب آئن اسٹائن کی علمی حرکتوں کی وجہ سے میاں بیوی کے تعلقات ٹوٹنے کے قریب پہنچے تو دونوں نے اپنے بچوں کی خاطر نباہ کا سوچا اور اس نباہ کے لیے جو معاہدہ ہوا، وہ بڑا عجیب تھا۔

ان شرائط میں سے جو آئن اسٹائن نے بیوی سے نباہ کے لیے متعین کیں، ایک شرط یہ بھی تھی کہ میری بیوی مجھ سے کسی قسم کے قربت کے تعلق کی توقع نہیں کرے گی اور اگر اسے قربت کا تعلق مجھ سے میسر نہ آئے تو اس پر تنقید بھی نہ کرے گی۔ میرے تین وقت کے کھانے، میرے کپڑوں کی دھلائی اور استری اور میرے کمرے اور میز کی صفائی کا دھیان کرے گی۔ اور جواب میں میری طرف سے اس کو یہ ملے گا کہ اگر میری تحقیق پر مجھے کچھ ریوارڈ ملا تو وہ میری بیوی کا ہو گا۔ اور پھر اسی معاہدے کے تحت 1921ء میں اپنے نوبل پرائز کی رقم آئن اسٹائن نے اپنی بیوی کو بھجوا دی۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ خواہش رکھنا اور باتیں کرنا آسان ہے لیکن قربانی دینا بہت مشکل ہے۔ میں کئی ایک ایسے دوستوں کو جانتا ہوں کہ جن کی بیویوں نے دین کے نام پر ان سے شادیاں کیں لیکن شادی کے بعد ایسے پھر گئیں جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہوں اور ان کا یہ پھر نا بنتا بھی ہے کہ آدرش کی محبت، یہ عورت کے سانچے سے باہر کی چیز ہے کہ دنیا

کے تمام نامور فلسفی، سائنسدان، ادیب، حکمران وغیرہ سب مرد تھے۔ عورت کی عظمت یہی ہے کہ وہ اس مرد کو پیدا کرنے کے لیے پیدا کی گئی ہے اور وہ صرف یہی کام اچھے طور کر سکتی ہے، اس سے بڑھ کر شاید اس کے مقدر میں نہیں ہے۔ عورت اور مرد کے بارے یہ بات نوعِ عورت اور نوعِ مرد کے اعتبار سے کی گئی ہے جبکہ ان دونوں انواع کے بعض افراد اس عمومی قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ ہو سکتے ہیں کہ کسی عورت میں آدرش کی محبت ہو اور کوئی مرد اس سے خالی ہو۔

دوسری شادی: خیال یا وسوسہ

دوست نے کہا کہ دوسری شادی کا خیال بہت آتا ہے۔ میں نے کہا کہ خیال نہ کہو وسوسہ کہو۔ اس نے کہا کہ کیا مطلب؟ میں نے کہا کہ مطلب واضح ہے کہ یہ شیطان کی طرف سے ہے لہذا فرق رکھو۔ اس نے کہا کہ کیا دین میں دوسری شادی کی اجازت نہیں ہے؟ میں نے کہا بالکل ہے۔ اس نے کہا کہ پھر کیسا وسوسہ؟

میں نے کہا کہ میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ دوسری شادی کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں؛ جرات اور پیسہ۔ اور بدقسمتی سے ہمارے پاکستانی مرد میں یہ دونوں مفقود ہیں۔ نہ ہی وہ دلیر ہے اور اوپر سے کنگلا بھی ہے یا کنگلا نہیں ہے تو بخیل اور کنجوس ہے تو یہ کبھی دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ یہ صرف خواب میں اس کے مزے لے سکتا ہے۔ اور جاگتے میں دوسری شادی کے خواب دیکھنا تو یہ شیطان کا وسوسہ ہی ہوا۔

میں نے دوست سے پوچھا ویسے تمہیں دوسری شادی کا اتنا چاہ کیوں ہے؟ کہنے گا کہ زیرو میٹر گاڑی کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ میں نے کہا تمہیں پتہ ہے کہ زیرو میٹر گاڑی کو اسکریچ لگ جائے تو اس کی ٹینشن بھی اپنی ہی ہوتی ہے۔ کہنے لگا تو پھر کیا کریں زیرو میٹر کے خواب دیکھنا بند کر دیں۔ میں نے کہا اس کا حل یہ ہے کہ اپنی پرانی گاڑی کی ڈینٹنگ پینٹنگ کروائیں اور اسے زیرو میٹر جیسا بنوا لیں، پیسوں کی بچت اور دو دو گاڑیوں کے خرچے سے بھی بچت۔ واضح رہے کہ مسند احمد کی ایک روایت میں عورت کو بہترین متاع کہا گیا ہے۔

دوست نے کہا کہ آئیڈیا تو ویسے برا نہیں ہے لیکن پرانی بیوی کو نیا بنانے کا طریقہ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ طریقہ جاننے سے پہلے یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ عورتیں ساری ایک جیسی ہوتی ہیں، عورتوں کی نفسیات پر پھر کسی دن تمہیں لیکچر دوں گا، انیس بیس کا فرق ہوتا ہے، لہذا دوسری جو لے کر آؤ گے، وہ بھی ایسی ہی نکلے گی جیسا کہ پہلی بھگت رہے ہو، باقی استثناءات (exceptions) کی میں بات نہیں کرتا، وہ تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔

ہمارے گھروں کا بنیادی جھگڑا یہی ہے کہ بیوی کا دل ہے کہ خاوند پہلے اسے خوش کرے، پھر وہ اسے خوش رکھے گی۔ اور خاوند کا دل ہوتا ہے کہ نہیں خوش رکھنے کا کام پہلے بیوی کو کرنا چاہیے اور اسی چکر میں حقوق وفرائض کی جنگ چھڑ جاتی ہے۔ آپ کی بیوی کو آپ سے محبت، عزت اور دھیان چاہیے، یہی اس کی اصل خوشی ہے۔ آپ کی بیوی زیرو میٹر ہو جائے گی کہ نہ ہی وہ کوئی خرچہ کرائے گی اور نہ ہی تنگ کرے گی۔

کبھی عورتوں پر کیے جانے والے ایسے سروے کا مطالعہ کریں کہ جس میں ان سے ان کے پسندیدہ خاوند کی صفات پوچھی گئی ہوں تو اکثر کا ان تین پر اتفاق ہو گا کہ لونگ یعنی محبت کا اظہار کرنے والا ہو، آنر یعنی عزت دیتا ہو اور کیئرنگ یعنی خیال رکھنے والا ہو۔ بس بیوی سے محبت کو دل میں بسا کر نہ رکھیں، زبان پر رکھیں یعنی اس کا اظہار کرتے رہیں بلکہ محبت نہیں بھی ہے تو بھی اظہار کرتے رہیں، ان شاءاللہ! پیدا ہو جائے گی۔

بیوی کو، خاص طور اس کے گھر والوں کو عزت دیں بلکہ پروٹوکول دیں۔ بیوی کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولنے میں عار محسوس نہ کریں اور اس کی چھوٹی چھوٹی ضرورتیں خود سے پورا کریں، جو کہ وہ خود بھی پوری کر سکتی ہو، وہ بھی! اگر وہ میکے اکیلے جا سکتی ہے تو اسے اکیلے نہ جانے دیں بلکہ خود چھوڑ کر آئیں۔ مشکل کام ہے کیا؟ تو دس سالہ پرانی گاڑی کو زیرو میٹر بنانا آسان کام ہے کیا؟

کورٹ میرج کے بارے ایک غلط فہمی

جہاں تک میرے علم میں ہے تو کورٹ میرج ایک غلط اصطلاح ہے۔ کورٹ میں

کوئی میرج نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی ہمارے جج حضرات اتنے فارغ ہیں کہ شادیاں کرواتے پھریں۔ ہوتا اصل میں یہ ہے کہ لڑکا اور لڑکی جج کے سامنے حاضر ہو کر یہ بیان حلفی دیتے ہیں کہ ہم نے اپنی آزاد مرضی سے نکاح کر لیا ہوا ہے۔

پس کورٹ میرج میں وہ جج کے سامنے نکاح پڑھواتے نہیں ہیں۔ یہ نکاح وہ کسی امام مسجد سے، دوست کے گھر میں، تھانے میں، یا وکیل کے آفس میں کروا چکے ہوتے ہیں اور جج کو صرف اس کی رپورٹ کرتے ہیں۔ اور اس رپورٹ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لڑکی کے گھر والے لڑکے پر اغوا کا مقدمہ نہ درج کروا دیں۔

اب جو نکاح تھانے، وکیل کے آفس یا کسی دوست کے گھر میں ہوتا ہے، تو مختلف کیسز میں مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ اکثر وکیل تو ماشاءاللہ سے امام مسجد اور گواہوں کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے البتہ نکاح کی رجسٹریشن کے لیے فارم وغیرہ مکمل کروا لیتے ہیں۔

اور اب بعض وکیلوں نے آن لائن نکاح کروانے کی سہولت بھی میسر کر رکھی ہے کہ جس کی باقاعدہ ویب سائیٹس بنی ہوئی ہیں کہ بس آپ وکیل کی فیس ادا کریں اور وکیل لڑکا اور لڑکی کے نکاح کے رجسٹریشن فارم مکمل کروا دے گا اور جج کے سامنے بیان حلفی دلوا دے گا اور یہی کورٹ میرج ہے بس۔ اور گواہان میں لڑکے کے دوستوں یا وکیل کے منشیوں کے نام ڈال دیے جاتے ہیں۔

یہ نقطہ بھی واضح کرتا چلوں کہ نکاح میں ایجاب وقبول کسے کہتے ہیں۔ ایجاب کا معنی واجب کرنا ہے اور قبول کا معنی قبول کرنا ہے۔ اب لوگ عام طور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم لڑکی قبول کرتے ہیں، اہم سوال یہ ہے کہ قبول کیا کرتے ہیں؟ لڑکا وہ قبول کرتا ہے، جو واجب کیا جاتا ہے۔ اور واجب جو کیا جاتا ہے، وہ لڑکی کی ذمہ داری اور نان نفقہ ہے۔

اور لڑکی کی ذمہ داری اور نان نفقہ ولی کی ذمہ داری ہے نہ کہ خود لڑکی کی۔ ولی ایجاب کرتے وقت یہ ذمہ داری لڑکے پر ڈالتا ہے اور لڑکا قبول کرتا ہے۔ اسلامی معاشرت میں لڑکی ساری زندگی مرد کی کفالت میں ہوتی ہے۔ شادی سے پہلے باپ اور شادی کے بعد

شوہر کی کفالت میں۔ تو ایجاب و قبول کے ذریعے یہ کفالت منتقل ہو رہی ہے۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کو بیٹیوں کے حقوق کے بارے حدیثیں سنا سنا کر باپوں کا بیٹیوں سے اتنا تعلق پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ اپنا سب کچھ ان کے لیے قربان کر دیتے ہیں اور جب بیٹی گھر سے بھاگ جاتی ہے تو ہمیں اس کے حقوق یاد آ جاتے ہیں۔ بھئی، اگر آپ لوگوں نے اسے گھر سے بھاگنے کا حق دینا ہی ہے تو باپ کو اس کے حقوق سنا سنا کر اس کی محبت میں پاگل مت بنائیں۔ اور باپوں کو تعلیم دیں کہ بیٹیوں سے ضرورت کی محبت رکھیں یعنی اتنی ہی جتنی کہ چرند پرند رکھتے ہیں تاکہ بعد میں نفسیاتی مریض نہ بن جائیں۔

نکاح مسیار

نکاح مسیار کے بارے وضاحت رہے کہ اس نکاح میں نکاح کے چاروں ارکان اور شرائط پوری ہوتی ہیں۔ ا- نکاح مسیار میں لڑکی کے ولی کا ہونا ضروری ہے جیسا کہ اس کے جواز کا فتوی دینے والے کہتے ہیں۔ ۲۔ دوسرا گواہان موجود ہوتے ہیں اور اس نکاح کا باقاعدہ اعلان کیا جاتا ہے۔ ۳۔ تیسرا نکاح میں لڑکی کے لیے باقاعدہ حق مہر موجود ہوتا ہے۔ ۴۔ اور چوتھی چیز یہ کہ ایجاب و قبول بھی ہوتا ہے اور یہ موقت نہیں ہوتا یعنی ہمیشہ کے لیے نکاح ہوتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ پھر نکاح مسیار اور عام نکاح میں کیا فرق ہے کہ اس بارے اتنا اختلاف ہو گیا۔ فرق یہ ہے کہ عام نکاح میں مرد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی بیوی کو رہائش، خرچہ اور وقت دے جبکہ نکاح مسیار میں مرد شادی کے وقت یہ شرط لگاتا ہے کہ وہ بیوی کو رہائش نہیں دے گا، یا خرچہ نہیں دے گا، یا وقت نہیں دے گا، یا ان میں سے دو یا تین چیزوں کی ہی شرط لگا لے کہ وہ یہ نہ دے گا۔

علماء کے مابین اس پر تو اتفاق ہے کہ رہائش، خرچہ اور وقت عورت کے شرعی حقوق ہیں لیکن اس میں اختلاف ہو گیا کہ کیا عورت اپنے ان حقوق کو معاف کر سکتی ہے؟ یعنی مرد اگر عورت سے شادی کے موقع پر یہ کہے کہ میں ان حقوق کو ادا کرنے کی اہلیت

نہیں رکھتا لہذا تم مجھے یہ حقوق معاف کر دو اور شادی کے موقع پر اس کا معاہدہ ہو جائے تو کیا اس طرح سے یہ حقوق معاف ہو جاتے ہیں یا پھر بھی باقی رہتے ہیں؟

نکاح مسیار کے بارے علماء اہل سنت کی تین رائے ہیں؛ بعض اس کے جواز کے قائل ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ مکروہ ہے لیکن ہو جاتا ہے۔اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ جائز ہی نہیں ہے۔اس کی ایک صورت ہمارے معاشروں میں گھر جوائی کی بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً شادی کے بعد لڑکی کا خرچہ اس کے والدین اٹھائیں، یا لڑکی کو گھر اس کے والدین بنا کر دیں وغیرہ۔ایک تو یہ ہے کہ یہ عملاً ہمارے معاشروں میں ہو رہا ہے، اور ایک یہ ہے کہ کیا نکاح کے موقع پر مرد کی طرف سے اس کی شرط لگائی جا سکتی ہے؟

جن علماء نے اس کی اجازت دی ہے، ان میں سابق مفتی سعودی عرب شیخ بن باز، شیخ عبد العزیز آل الشیخ اور سابق مفتی مصر شیخ نصر فرید واصل رحمہم اللہ وغیرہ ہیں۔ان کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شرائط کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے کہ جو نکاح کے موقع پر لگائی جائیں۔اور یہ بھی کہ حضرت سودۃ رضی اللہ عنہا نے اپنی باری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حق میں چھوڑ دی تھی وغیرہ۔

جو علماء نکاح مسیار کو مکروہ کہتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ ہو جاتا ہے تو ان میں ڈاکٹر وہبہ الزحیلی، ڈاکٹر یوسف القرضاوی اور شیخ عبد اللہ بن منیع وغیرہ شامل ہیں۔ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ اس نکاح میں شادی کی جو مصالح ہیں، وہ پوری نہیں ہوتیں لہذا مکروہ ہے۔اور حرام اس لیے نہیں کہتے ہیں کہ اس میں کچھ ایسا مفقود نہیں ہے جو نکاح کے ارکان اور شروط میں شامل ہو۔

اور جن علماء نے نکاح مسیار کو ناجائز کہا ہے تو ان میں علامہ البانی، ڈاکٹر علی قرۃ داغی اور ڈاکٹر سلیمان الاشقر وغیرہ شامل ہیں کہ ان کے نزدیک یہ وہ نکاح نہیں ہے کہ جسے اسلام نے متعارف کروایا یا رواج دیا ہے۔

نکاح متعہ اور نکاح مسیار میں فرق یہ ہے کہ متعہ ایک وقتی نکاح ہے جبکہ نکاح مسیار دائمی نکاح ہوتا ہے۔ نکاح متعہ میں وراثت جاری نہیں ہوتی جبکہ نکاح مسیار میں وارثت

جاری ہوتی ہے۔ متعہ میں طلاق نہیں ہوتی کہ وقت ختم ہوتے ہی نکاح ختم ہو جاتا ہے جبکہ نکاح مسیار میں طلاق ہوتی ہے۔ نکاح متعہ میں تعداد مقرر نہیں ہے یعنی ستر سے بھی ہو سکتا ہے جبکہ نکاح مسیار چار سے زائد سے نہیں ہو سکتا۔ متعہ میں لڑکی کے ولی اور گواہان کا ہونا ضروری نہیں ہے جبکہ نکاح مسیار میں ولی اور گواہاں کا ہونا ضروری ہے۔

نوٹ: بہر حال یہ علماء کا اختلاف ہے جو ہم نے اس بارے نقل کر دیا ہے، البتہ نکاح مسیار کو کسی طور بھی پسندیدہ امر نہیں کہا جا سکتا کہ رہائش، خرچہ اور وقت عورت کے حقوق ہیں کہ جنہیں مرد کو ادا کرنا ہی چاہیے، چاہے عورت انہیں چھوڑنے پر راضی ہی کیوں نہ ہو۔ واللہ اعلم۔

عورت کی عدت کی حکمت

ایک دوست نے سوال کیا ہے کہ کیا عورت طلاق اور خاوند کے فوت ہو جانے کی صورت میں جو عدت گزارتی ہے تو اس کی حکمت یہ ہے کہ اس خاوند سے اس عورت کی اولاد کا علم ہو جائے تا کہ نسل میں اشتباہ نہ ہو؟ اگر یہی حکمت ہے تو کیا اگر الٹرا ساؤنڈ وغیرہ سے یہ معلوم ہو جائے کہ عورت کی اس خاوند سے اولاد نہیں ہے کہ جس نے اس کو طلاق دی ہے یا جو فوت ہو چکا ہے تو کیا عورت کی عدت معاف ہو جائے گی؟

جواب: ہمارے ہاں بہت سی دینی آراء ایسی ہوتی ہیں کہ جب پیش کی جاتی ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ بہت لاجیکل بات ہے کہ آگے سننے والا بھی واہ واہ کرنے کا مزاج رکھنے والا سطحی ذہن ہے کہ جس کے پاس نہ تو تجزیہ کرنے کی اہلیت ہوتی ہے اور نہ ہی علم کی صلاحیت۔ اور یوں ایک بے کار بات، سطحی ذہن رکھنے والے فالورز کی برکت سے، ایک مستند دینی رائے کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔

عورت کی عدت کی کل حکمت استبرائے رحم (establishing of no pregnancy) نہیں ہے، اگرچہ یہ بھی ہے۔ اگر عورت کی عدت کی حکمت صرف یہ معلوم کرنا ہوتا کہ سابقہ خاوند سے اس کے کوئی اولاد ہے یا نہیں تو یہ ایک حیض ہوتی۔ جب عورت کو حمل ٹھہر جاتا ہے تو حیض آنا بند ہو جاتا ہے لہذا ایک حیض سے قطعی طور

معلوم ہو جاتا ہے کہ عورت کی پچھلے خاوند سے اولاد ہے یا نہیں۔ لیکن اس کے باوجود شریعت نے طلاق یافتہ عورت کی عدت، تین حیض اور جس کا خاوند فوت ہو جائے، اس کی عدت چار ماہ دس دن مقرر کی ہے۔

اب چار ماہ دس دن تو بالکل واضح ہے کہ اس گنتی کا استبرائے رحم سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے، متوفی عنہا کی عدت چار ماہ دس دن ہی کیوں، چار ماہ کیوں نہیں؟ یا جس کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت تین حیض کیوں نہیں؟ پس عدت میں اصل حکمت نہیں، اللہ کا حکم ہے کہ جس پر ہر صورت اور ہر حال میں عمل ہو گا۔

اور اگر اس کی کوئی حکمت تلاش کرنی ہی ہو لیکن وہ حکمت اس حکم کی مناط، علت اور وجہ نہیں ہو سکتی کہ وہ غائب تو حکم بھی غائب، تو وہ مرکب علت ہے کہ پچھلے تعلق کے ٹوٹ جانے پر سوگ کا اظہار ہے اور استبرائے رحم کا علم ہے وغیرہ۔ اصلاً یہ پچھلے تعلق کے ٹوٹنے پر سوگ کا اظہار ہے۔ اب بے شک حقوق نسواں والے لگیں رہیں لیکن حقیقت یہی ہے۔

لڑکیوں کے مدارس میں ہوسٹل کی شرعی حیثیت

مجھے الیاس گھمن صاحب کے کردار کے بارے گردش کرتی خبروں پر اس وقت کوئی تبصرہ تو نہیں کرنا لیکن مذہبی طبقات سے دو اصولی سوال کرنے ہیں کہ اگر الیاس گھمن صاحب لڑکیوں کا کوئی مدرسہ چلا رہے ہیں اور یہاں ہر مسلک میں کچھ علماء ایسے ہیں کہ جو لڑکیوں کا مدرسہ چلا رہے ہیں اور اس مدرسہ کے ہاسٹل میں دوسرے شہروں سے لڑکیاں آکر رہائش پذیر بھی ہوتی ہیں۔

تو پہلا سوال یہ ہے کہ علماء کالجوں، یونیورسٹیوں پر اتنا بولتے ہیں، محرم کے بغیر سفر کرنے کو حرام کہتے ہیں، حجاب اور نقاب کے بارے اتنے سخت فتوے جاری کرتے ہیں، مخلوط معاشرت کو حرام بتلاتے ہیں۔ پس عورت کے حجاب واختلاط کے حوالے سے جو بیانیہ ہمارے برصغیر پاک وہند اور عرب کے علماء کا ہے، اس کی روشنی میں کیا دوسرے شہروں سے لڑکیاں لا کر اپنے شہر کے مدرسہ کے ہاسٹلوں میں رکھنے کا جواز نکلتا ہے کیا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں لڑکیوں کے ان ہاسٹلز کا کیا جواز ہے جبکہ ان کے مہتم و منتظم مرد حضرات ہیں؟ چاہے وہ علماء ہی کیوں نہ ہوں۔ یہی تو ساری خرابی کی جڑ ہے کہ آپ مولوی کے لیے دین کی تعلیم پر وہ ساری رخصتیں نکال رہے ہیں، کہ جو آپ دنیاوی تعلیم میں دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ کیا آپ علماء کی جماعت کالجوں اور یونیورسٹیوں میں موجود لڑکیوں کے ہاسٹلوں پر تنقید نہیں کرتے؟ اگر کرتے ہیں تو کیوں؟ کس بنیاد پر؟ کیا دلیل ہے؟ اور وہی دلیل کیا مدرسہ کے ہاسٹل پر منطبق (appply) نہیں ہوتی؟

میری رائے میں، جیسا کہ بعض دوستوں نے بھی اس رائے کا اظہار کیا ہے، ہمیں یعنی دینی طبقات اور مذہبی جماعتوں کو اس پر اتفاق کر لینا چاہیے کہ لڑکیاں دینی تعلیم کے لیے دوسرے شہروں میں جا کر مدارس کے ہاسٹلز میں نہیں رہیں گے۔ اگر کسی نے تعلیم حاصل کرنی ہی ہے تو اپنے شہر کے مدرسہ میں حاصل کرے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ کسی شہر کے مدرسہ میں جو لڑکیوں کے مدارس ہیں، ان کا مکمل انتظام و انصرام خواتین کے پاس ہونا چاہیے۔ اگر آپ کے پاس ایسی قابل خواتین نہیں ہیں تو مدرسے بند کر دیں اور اسلامک اسکولز کھول لیں، آپ کو وہاں دیندار اور قابل پرنسپلز ضرور مل جائیں گی، ان شاء اللہ العزیز۔

استخارہ

بہت سے دوست استخارہ کے بارے پوچھتے ہیں کہ یہ کیا ہے، کیسے کیا جاتا ہے، کسی اور سے بھی کروا سکتے ہیں یا خود ہی کرنا ہے، اس کا نتیجہ کیسے معلوم ہو گا، کوئی خواب آئے گا، کیا ہو گا، قرآن، تسبیح، اعداد سے بھی استخارہ ہو جاتا ہے یا نہیں، اور آن لائن استخارہ کروانے کا کیا حکم ہے؟

استخارہ کرنا سنت ہے اور صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو استخارہ کرنا یوں سکھاتے تھے کہ جیسے قرآن مجید کی کوئی سورت سکھلا رہے ہوں۔ استخارہ کا معنی اللہ سے خیر طلب کرنا ہے یعنی کوئی بھی کام کرنے سے

پہلے بندہ نماز اور دعائے استخارہ کے ذریعے اس میں اللہ سے خیر طلب کر لے۔ اگرچہ استخارے کی دعا میں ایسے الفاظ شامل ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دعا میں بندہ اپنے پروردگار سے مشورہ لے رہا ہے لیکن اس کا مطلب صرف مشورہ ہی نہیں ہے بلکہ خیر طلب کرنا بھی ہے یعنی اے پروردگار! بس یہ کام کرنے کو میرا دل ہے، آپ اس میں خیر ڈال دیں اور اس میں اگر کوئی شر ہے تو اسے دور کر دیں۔

تو استخارے کے دو معانی ہوئے؛ ایک یہ کہ کوئی کام کرنے سے پہلے اللہ سے خیر طلب کرنا اور دوسرا یہ کہ اللہ سے مشورہ مانگنا۔ پہلی صورت میں اللہ پر مان ہے کہ اے اللہ! مجھے یہ چاہیے، جیسا بھی ہے، بس مجھے اس کا شر نکال کر اس کی خیر دے دے۔ اور دوسری صورت میں اللہ سے مشاورت ہے اور استخارے کی دعاء میں غالب پہلو مشاورت کا ہی ہے۔ استخارے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ کسی بھی وقت میں دو رکعت نفل نماز پڑھے، اس کے بعد اللہ کی حمد وثناء کے کلمات کہے، رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجے، اور پھر استخارہ کی دعا پڑھے۔ اگر نہیں آتی تو اس کا متن (text) سامنے رکھ کر پڑھ لے۔ اور بہتر ہے کہ اس کا ترجمہ بھی سامنے رکھے تاکہ معلوم تو ہو کہ اللہ سے کیا بات کر رہا ہے۔ استخارے کے بعد سونا ضروری نہیں ہے، اور نہ ہی استخارے کا مطلب یہ ہے کہ خواب میں کوئی بابا جی آکر آپ کی رہنمائی فرمائیں گے۔

اگر آپ استخارہ کی دعاء میں غور کریں، تو اس میں یہ الفاظ ہیں کہ اے اللہ! اگر یہ کام میرے حق میں، میری دنیا، میری آخرت، میرے معاش، میرے ایمان کے لیے بہتر ہے تو آپ اس کو میرے لیے آسان فرما دیں، اس میں برکت ڈال دیں۔ اور اگر یہ کام میری دنیا اور آخرت، معاش اور ایمان کے لیے بہتر نہیں ہے تو اس کام کو مجھ سے دور کر دیں، اور مجھے اس سے دور کر دیں، اور پھر اس کے بدلے میں اپنی جناب سے مجھے اس سے بہتر عطا فرمائیں۔ تو یہ استخارہ کی دعاء کا مفہوم ہے۔ تو استخارے کا نتیجہ خواب میں معلوم کرنے کی بجائے یہ دیکھیں کہ استخارہ کرنے کے بعد آپ کے ذہن کا رجحان اور دل کا میلان اس کام کی طرف ہے یا نہیں، اور یہی استخارے کا نتیجہ ہے۔

ہم میں سے ہر شخص خواب دیکھتا ہے اور روزانہ دیکھتا ہے، ہم یہ کرتے ہیں کہ استخارہ کرنے کے بعد جو الٹا سیدھا خواب آئے، اسے استخارے کا نتیجہ سمجھ کر اس سے تعبیر نکالنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور یہ بھی اہم ہے کہ اگر ہم کسی بارے سوچ رہے ہیں تو اس بارے رات خواب آنا تو معمول کی بات ہے کہ انسان جو دن میں سوچتا ہے، رات خواب میں دیکھتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ استخارہ کے لیے صرف اپنے خواب کو بنیاد نہ بنائیں بلکہ ذہنی رجحان اور قلبی میلان کو دیکھیں۔ رہا قرآن مجید، تسبیح، اعداد و حروف اور آن لائن استخارہ وغیرہ تو یہ استخارے کی بدعات ہیں، ان سے بچنا چاہیے۔

ساس، سسر کی خدمت کرنا

کچھ عرصہ پہلے کراچی جانا ہوا تو بعض مذہبی ذہن رکھنے والے نوجوانوں نے اپنی ایک پریشانی سامنے رکھی کہ ہم کسی مذہبی لڑکی یعنی کسی عالمہ فاضلہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن گھر والے راضی نہیں ہوتے۔ میں نے کہا کہ گھر والوں کا کیا اعتراض ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ گھر والے کہتے ہیں کہ عالمہ فاضلہ کو گھر لانے کا مطلب گھر میں ایک بوجھ (burdon) کا اضافہ کرنا ہے کہ کام تو اس نے کوئی کرنا نہیں ہے، البتہ آرام سارے وصول کرنے ہیں۔

میں نے کہا کہ بات سمجھ نہیں آ رہی کہ عالمہ فاضلہ کے کام کاج نہ کرنے یا نکمے ہونے سے کیا تعلق ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہاں کراچی میں بعض مفتی حضرات نے فتوی دیا ہے کہ عورت پر اپنے خاوند کے علاوہ اس کے گھر والوں بشمول ساس، سسر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہے، یہاں تک کہ عورت پر یہ بھی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ خاوند کے لیے کھانا بنائے، کپڑے دھوئے، برتن صاف کرے وغیرہ۔ میں نے کہا ایسے فتووں کا تو ایسا ہی نتیجہ نکلنا تھا اور یہ فطری نتیجہ ہے۔ جب آپ نے دیندار عورت کی ذمہ داریاں ساری معاف کر دی ہیں اور ساتھ میں حقوق اسے سارے دے دیے ہیں تو اب لوگوں نے بیٹوں کی شادی کے معاملے میں دنیادار عورتوں کو ہی ترجیح دینی ہے کہ کم از کم گھر کے کام کاج میں تو ہاتھ بٹائے گی۔

انہوں نے کہا کہ آپ یہ بتلائیں کہ ساس سسر کی خدمت عورت کی دینی ذمہ داری ہے یا نہیں؟ میں نے کہا کہ آپ یہ بتلائیں کہ عورت کو ملازمہ رکھ کر دینا اس کا دینی حق ہے یا نہیں؟ انہوں نے کہا کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا کہ اگر آپ شریعت اور فقہ ہی سے مسئلہ حل کرنا چاہتے ہیں تو عورت کو جس طرح شریعت اور فقہ کی روشنی میں ذمہ داریوں سے آزاد کیا ہے، اسی طرح اس کے حقوق بھی ختم کریں، تو توازن پیدا ہو گا۔ یہ تو ممکن نہیں ہے کہ جب عورت کے کام کرنے کی باری آئے تو پھر اس کی دینی ذمہ داری اور جب اس کے لینے کی باری آئے تو اب عرف اور رواج کیا ہے؟ اس طرح تو کام نہیں چلے گا۔

اور حقیقی بات یہی ہے کہ میاں بیوی کے حقوق وفرائض کا تعین عرف اور رواج سے ہی ہوتا ہے جیسا کہ قرآن مجید نے بھی یہی کہا ہے کہ جیسے بیویوں کے حقوق ہیں، ویسے ہی ان کے فرائض بھی ہے، عرف کے مطابق۔ کیا یہ کوئی شرعی یا فقہی ذمہ داری ہے کہ مرد اپنی بیوی کو سپلٹ اے سی لگوا کر دے، ڈبل بیڈ اور صوفہ سیٹ خرید کر دے، گیزر اور ہیٹر کی سہولت مہیا کرے، بجلی اور گیس کا کنکشن لگوا کر دے لیکن اس کے باوجود اگر مرد ایسا کر رہے ہیں اور مفتی صاحب کوئی ایسی تحریک چلا دیتے ہیں کہ جس میں مردوں کو یہ بتلایا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ ان پر واجب نہیں ہے تو فریق مخالف کی چیخیں نہیں نکلیں گی تو کیا ہو گا؟ اور یہی کام ہمارے ممدوح مفتی صاحب کر رہے ہیں کہ عورتوں کے حقوق بیان کر کے مردوں کی چیخیں نکلوانا چاہتے ہیں۔

ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ بہو گھر میں لانے کا مطلب خادمہ اور نوکرانی لانا ہے، یہ تصور بھی بالکل غلط ہے، لیکن یہ کون سا دین ہے کہ گھر میں ساس، سسر بھوکے ہوں اور بیوی یہ کہے کہ میں انہیں کھانا اس لیے بنا کر نہیں دے سکتی کہ یہ میری دینی ذمہ داری نہیں ہے اور اللہ کے رسول ﷺ یہ فرمائیں کہ جس کا پڑوسی بھوکا سو جائے، وہ مومن نہیں ہے، وہ مومن نہیں ہے، اللہ کی قسم، وہ مومن نہیں ہے۔ تو اللہ کے رسول ﷺ تو پڑوسی کے بھوکا سو جانے پر ایمان کی نفی کر دیں اور گھر میں ساس، سسر بھوکے

ہوں تو وہ مومنہ بلکہ عالمہ فاضلہ ہے؟ آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ یہ دین، دین فطرت ہے، فتوی کے نام پر اتنی بڑی غلطی نہ کریں کہ فطرت چیخ چیخ کر بتلائے کہ آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ اگر اسی طرح مذہبی عورتوں کے حقوق کے لیے بے معنی فتاوی جاری ہوتے رہے تو وہ وقت بھی قریب آ جائے گا جبکہ سسر گھر میں بیماری سے تڑپ رہا ہوگا اور بیوی اپنے شوہر کو فون کر کے کہے گی کہ جانو! ذرا گھر آ کر اپنے ابا جان کو دوائی پلا دینا، اسے دوائی پلانا میری دینی ذمہ داری نہیں ہے۔

کیا ساس، سسر کی خدمت واجب ہے؟

ساس، سسر کی خدمت کے حوالے سے ایک پوسٹ شیئر کی تھی کہ جس پر بعض دوستوں نے یہ سوال کیا کہ کیا ساس، سسر کی خدمت واجب ہے یا یہ احسان میں شامل ہے؟

قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَى حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ﴾ [الإسراء: 26]۔ ترجمہ: رشتہ دار کو اس کا حق دو، مسکین کو اس کا حق دو، مسافر کو اس کا حق دو۔ مسند احمد کی ایک روایت کے مطابق تو اللہ کے رسول ﷺ نے تو یہاں تک فرما دیا کہ تمہارے نفس کا تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا تم پر حق ہے، تمہارے ملاقاتی کا تم پر حق ہے۔ اور المؤطا کی ایک روایت کے مطابق اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام نے مجھے پڑوسی کے حق کی اتنی وصیت کی کہ مجھے لگا کہ اسے وراثت میں حصہ دار بنا دیا جائے گا تو کیا ہمارا دین ساس، سسر کو پڑوسی جتنا حق بھی نہ دے گا؟ جبکہ ساس، سسر آیت کریمہ ﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ﴾ [النساء: 36] ترجمہ: اور والدین کے ساتھ احسان کرو، اور رشتہ داروں کے ساتھ، اور یتیموں کے ساتھ، اور مساکین کے ساتھ، اور ان پڑوسیوں کے ساتھ جو رشتہ دار بھی ہوں، اور ان پڑوسیوں کے ساتھ جو اجنبی ہوں اور ان پڑوسیوں کے ساتھ جو پہلو میں ہوں، کی روشنی میں ذی القربی، والجار ذی القربی اور الصاحب بالجنب میں داخل ہوں۔

اب اگر مہمان گھر میں آجائے تو اسے کھانا کھلانا اخلاقی حق ہے یا ایسا قانونی [شرعی] حق کہ جس کو ادا نہ کرنے سے وہ گناہ گار ہو گا؟ اگر مہمان کو کھانا کھلانا قانونی حق ہے تو ساس، سسر کو کھانا کھلانا محض ان کا اخلاقی حق ہے کیا؟ اسی طرح معلوم نہیں لوگوں نے احسان کا معنی کیا سمجھ رکھا ہے؟ جب قرآن مجید والدین سے احسان کا حکم دیتا ہے تو کیا اس سے مراد ارد وزبان والا احسان ہوتا ہے؟

پھر الموطا کی روایت کے مطابق اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے تو وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔ اور مستدرک حاکم کی صحیح روایت کے مطابق آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ شخص مومن نہیں ہے کہ جس نے رات پیٹ بھر کر گزاری اور اس کا پڑوسی بھوکا سویا رہا اور اسے یہ معلوم بھی تھا۔ کیا یہ پڑوسی کا محض اخلاقی حق ہے کہ وہ بھوکا ہو تو اسے کھانا کھلایا جائے؟ اگر اخلاقی حق ہی تھا تو پھر ایمان کی نفی کرنے کا کیا معنی؟

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پڑوسی کے کچھ اخلاقی حقوق ہیں لیکن اس کے کچھ قانونی حقوق بھی ہیں، اسی طرح مہمان کے اخلاقی حقوق ہیں لیکن ان کے کچھ قانونی حقوق بھی ہیں، اسی طرح ملاقاتی کے کچھ اخلاقی حقوق ہیں لیکن اس کے کچھ قانونی حقوق بھی ہیں، اسی طرح سسرال، چاہے وہ مرد کا ہو یا عورت کا، کے کچھ اخلاقی حقوق ہیں لیکن ان کے کچھ قانونی حقوق بھی ہیں۔

اور اخلاقی حق بعض صورتوں میں قانونی حق بن جاتا ہے، فرض کفایہ کا تصور یہی ہے۔ اپنے محلے دار کا جنازہ پڑھنا اس کا اخلاقی حق ہے، لیکن اگر محلے میں کوئی نہیں پڑھ رہا تو اب آپ کے لیے پڑھنا واجب ہے۔ اسی طرح اگر ساس، سسر کی خدمت کے لیے ان کی اولاد نہیں ہے یا اگر اولاد تو ہے لیکن نہیں کر رہی، تو یہ ذمہ داری دوسرے قریبی رشتہ داروں کی طرف منتقل ہو گی، یہ حکم صرف عورتوں کے لیے نہیں ہے، مردوں کے لیے بھی ہے۔ اگر کسی مرد کے ساس، سسر کی خدمت ان کی اولاد نہیں کر رہی، یا ان کی اولاد ہے ہی نہیں تو یہ مرد کے ذمہ واجب ہو گا کہ وہ ان کی خدمت کرے۔

تو یہاں ہم نے تین باتیں کی ہیں، ایک یہ کہ سسرال، مرد کا ہو یا عورت کا، ان کے کچھ اخلاقی حقوق ہیں اور کچھ قانونی جیسا کہ پڑوسی، مہمان، ملاقاتی، دوست، ساتھی، رشتہ دار، پارٹنر وغیرہ کے کچھ قانونی حقوق ہیں اور کچھ اخلاقی ہیں۔ اور قانونی حقوق وہ ہوتے ہیں جو بنیادی ضرورت سے متعلق ہوں کہ بھوکے کو کھانا کھلانا اس کا اخلاقی حق ہے لیکن اگر وہ بھوکا آپ کے سامنے بھوک کی اذیت میں مبتلا ہو تو اب اس کا قانونی حق ہے کہ آپ اس پر خرچ کریں۔

اور دوسری یہ کہ اخلاقی حق بعض صورتوں میں قانونی حق بن جاتا ہے جبکہ وہ لوگ کہ جن پر اس فرد کے حوالے سے وہ قانونی حق عائد ہوتا ہے، وہ اسے ادا نہ کر رہے ہوں۔ اور تیسری اور آخری بات یہ کہ قرابت داروں میں سسرالی رشتہ دار بھی شامل ہیں اور قرآن مجید جب والدین اور رشتہ داروں سے احسان کا حکم دیتا ہے تو اس احسان سے مراد اردو والا احسان نہیں ہوتا بلکہ یہ مراد ہوتا ہے کہ ان کے حقوق کو حسن اور خوبصورتی سے ادا کرو، سر سے نہ اتارو۔ پس مطلقاً یہ بات کہنا کہ داماد یا بہو پر ساس، سسر کا کوئی قانونی حق نہیں ہے، دین اسلام کی تعلیمات اور مقاصد سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ یہ بات درست ہے کہ حق، حق میں فرق ہوتا ہے کہ والدین کی خدمت کا جیسا حق اولاد پر لازم ہوتا ہے، ویسا ہی داماد یا بہو پر عائد نہیں ہوتا ہے۔

منہ بولی بہن

دوست کا سوال ہے کہ یونیورسٹی میں عموماً طلباء کسی نہ کسی لڑکی کو منہ بولی بہن بنا لیتے ہیں جبکہ بعض اوقات لڑکیاں کسی کو منہ بولا بھائی بنا لیتی ہیں تو کیا یہ جائز ہے؟ یہ کلچر اب بہت تیزی سے معاشرے میں پھیل رہا ہے، اب تو لڑکا لڑکی ایک دوسرے کے ساتھ چپک کر بیٹھے ہوں گے یا ایک نے دوسرے کی گود میں سر رکھا ہو گا یا اس کی گردن میں بانہیں ڈالی ہوں گی اور کوئی ٹیچر پوچھ لے کہ یہ کیا حرکت ہے تو وہ بڑی معصومیت سے جواب دیتے ہیں کہ ہم بہن بھائی ہیں۔

حقیقت یہی ہے کہ کسی کو منہ سے بہن کہہ دینے سے نہ تو وہ بہن بن جاتی ہے اور نہ

ہی منہ سے بھائی کہہ دینے سے وہ بھائی بن جاتا ہے۔ وہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کے لیے غیر محرم ہی ہیں اور ان کا ایک دوسرے کو ٹچ کرنا اور تنہاء بیٹھنا حرام ہے۔ کچھ طلباء کا کہنا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو ٹچ نہیں کرتے، بس ایک دوسرے کے مسائل سنتے اور حل کرتے ہیں اور اس طرح ایک لڑکی نے کئی کئی بھائی اور ایک لڑکے نے کئی کئی بہنیں بنائی ہوتی ہیں۔

بندہ کبھی ان سے پوچھے کہ وہ جو تمہارے ابا جان سے تمہاری بہن یا بھائی ہے، تم نے کبھی اس کے مسائل سنے اور حل کیے ہیں جو یہاں تمہیں اتنی خیر خواہی چڑھی ہوئی ہے۔ تو یہ کچھ بھی نہیں، صرف شیطان کا دھوکا ہے اور یہی چیز زندگی کے کسی موڑ پر کسی خرابی کا باعث بن جاتی ہے۔ شریعت میں بہن بھائی وہی ہیں کہ جن کے ماں باپ ایک ہوں اور سائنس کی زبان میں بہن بھائی وہ ہیں کہ جن کا جینیٹک کوڈ ملتا ہو۔ تو حقیقی بہن بھائی تو یہی ہیں، باقی تو ہم نے سوچ سے بنا رکھے ہیں۔ جس طرح صرف سوچنے سے میاں بیوی نہیں بن سکتے، تو بہن بھائی کیسے بن جاتے ہیں؟

پس جنہیں ہم نے اپنی سوچ میں بہن بھائی بنا رکھا ہے تو یہ دھکے کے بہن بھائی ہیں۔ ہم جانتے بوجھتے اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں اور معاشرے کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح کسی کو منہ بولی بیٹی یا بیٹا بنا لینا، منہ بولی بھانجی یا بھتیجی بنا لینا یا منہ بولا ماموں یا چچا بنا لینا بھی درست نہیں ہے۔ لیکن یہاں ایک بات واضح کر دوں کہ ایک ہے کہ کسی کو ضرورت پڑنے پر انکل، چچا، ماموں، بھتیجے، بچے کہہ دینا تو اس میں حرج نہیں ہے، ظاہری بات کہ آپ کو اگر کسی بڑے کو مخاطب کرنا ہے تو اوئے کر کے تو مخاطب نہیں کریں گے۔

لیکن ایک یہ ہے کہ اگر کسی سے مستقل واسطہ پڑتا ہو تو پھر کسی کو منہ بولا رشتہ دار بنانے کی ضرورت نہیں ہے، بس یہ شعور اور احساس ہر دم زندہ رہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے غیر محرم ہیں۔ اب یہاں ایک سوچ یہ بھی ہے کہ چونکہ زندگی میں بعض اوقات نامحرم رشتوں میں ایسا واسطہ یا ضرورت پڑ جاتی ہے تو ایسے میں کمیونیکیشن

کے لیے بہتر ہے کہ اسے کچھ منہ بولا رشتہ دار بنا لیا جائے تاکہ ایک دوسرے کے ذہن میں ایک دوسرے کے بارے کچھ برا خیال یا وسوسہ نہ آئے۔

تو یہ صرف ایک سوچ ہے جو حقیقت حال کے خلاف ہے۔اور حقیقت کے خلاف آپ اپنی سوچ کو زیادہ دیر چلا نہیں سکیں گے۔ پس جہاں کوئی حقیقی رشتہ نہیں ہے تو وہاں اصل حقیقت یہی ہے کہ آپ نا محرم ہے،اور اسی حقیقت کا شعور آپ کو کسی خرابی سے بچا سکتا ہے نہ کہ اس کے برعکس سوچ۔قرآن مجید نے رشتوں میں حقیقت کا اعتبار کیا ہے لہذا سورۃ الاحزاب اور سورۃ المجادلۃ کے آغاز میں کہا ہے کہ کسی کو بیٹا کہہ دینے سے وہ تمہارا بیٹا نہیں بن جاتا اور بیوی کو ماں کہہ دینے سے وہ تمہاری ماں نہیں بن جاتی۔

غیر محرم عورت سے مصافحہ کرنا

صحیح الجامع کے مطابق اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ تم میں کسی شخص کے سر میں لوہے کی کیل ٹھونک دی جائے، یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی غیر محرم عورت کو ٹچ کرے۔اس روایت کو علامہ البانی رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ صحیح بخاری کی ایک روایت کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہے کہ اللہ کی قسم، بیعت لیتے وقت بھی اللہ کے رسول ﷺ کا ہاتھ کسی مسلمان عورت کے ہاتھ سے مس نہ ہوتا تھا۔

سنن النسائی میں حضرت امیمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے کہا کہ میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا ہوں۔مذاہب اربعہ اور محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مرد کا کسی غیر محرم عورت سے مصافحہ کرنا شریعت میں جائز نہیں ہے۔

اور مسند احمد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جو یہ روایت منسوب ہے کہ انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے بیعت لیتے وقت عورتوں سے مصافحہ کیا تو اولاً تو وہ روایت اہل علم کے نزدیک ثابت (authentic) نہیں ہے۔اور دوسرا اس روایت میں بھی مصافحہ کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ یہ الفاظ ہیں ان عورتوں نے گھر کے اندر سے اپنے ہاتھ آگے بڑھائے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باہر سے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔اس روایت میں مصافحہ کا ذکر بالکل بھی نہیں ہے بلکہ یہ علامتی بیعت تھی۔

باقی یہ کہنا کہ اگر شہوت محسوس نہ ہو تو اجنبی عورت سے مصافحہ کرنا جائز ہے تو پھر تو عورت سے معانقہ کرنا یعنی گلے ملنا بھی جائز ہوگا، اگر شہوت محسوس نہ ہو تو؟ شہوت کا ہونا تو حکم کی علت بن ہی نہیں سکتا کہ اس میں انضباط (regularity) کی شرط پوری نہیں ہوتی اور علت کے لیے ضروری ہے کہ وہ منضبط ہو اور ظاہر ہو یعنی اس کے مطابق ضابطہ بندی ہو سکے اور حواس خمسہ سے اس کا ادراک ممکن ہو۔ اب شہوت تو ہر حال میں ظاہر ہو ہی نہیں سکتی کہ ہے ہی دل میں تو کیسے معلوم ہوگا کہ ہے یا نہیں۔

پس شہوت کا ہونا یا نہ ہونا یہ حکمت ہے اور حکم کا مدار علت ہر ہوتا ہے نہ کہ حکمت ہے جبکہ حکمت تو علت کی شرائط میں سے ایک شرط ہے کہ وہ وصف مناسب ملائم ہے یعنی اسے حکم شرعی کے ساتھ کچھ عقلی اور منطقی مناسبت ہو۔

اجنبی عورت سے مصافحہ پر علامہ قرضاوی صاحب کا ایک فتوی

علامہ قرضاوی صاحب کا ایک فتوی جو کہ فیس بک پر کافی گردش کر رہا ہے، کے مطابق عورت سے مصافحہ کرنے کے حرام ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ ان کے بقول جن روایات میں عورت کو مس کرنے سے منع کیا گیا ہے، تو اس مس کرنے سے مراد مباشرت اور جماع کرنا ہے۔ قرضاوی صاحب کے فتاوی کے منہج اور اسلوب پر ہم ایک مستقل مضمون میں بحث کر چکے ہیں کہ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ فتوی دیتے وقت تمام متعلقہ روایات کو سامنے نہیں رکھتے ہیں کہ جس وجہ سے بعض اوقات نصوص کے خلاف فتاوی ان سے صادر ہو جاتے ہیں۔

کمال ہے، صحیح بخاری کی روایت کے مطابق اللہ کے رسول ﷺ فرمائیں: «وَالْيَدُ زِنَاهَا اللَّمْسُ» کہ ہاتھ بھی زنا کرتا ہے اور ہاتھ کا زنا، اس کا مس کرنا یعنی چھونا ہے۔ اور قرضاوی صاحب کہیں کہ مس سے مراد مباشرت ہوتی ہے۔ یہ فقاہت نہیں، بلکہ تحریف ہو گی کہ ہاتھ کے چھونا کا معنی مباشرت بنا دیا جائے، لیکن شاید قرضاوی صاحب کے ذہن میں فتوی دیتے وقت یہ روایت موجود نہ تھی، اور یہی اس کی بہترین توجیح معلوم ہوتی ہے۔

اور قرضاوی صاحب کا غیر محرم عورت سے مصافحہ کے لیے سنن ابن ماجہ کی یہ دلیل بیان کرنا کہ مدینہ کی لونڈی آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑ کر جہاں چاہتی لے جاتی، تو اس بارے شارحین حدیث علامہ ابن حجر، علامہ عینی، علامہ قسطلانی رحمہم اللہ کا کہنا ہے کہ یہاں مراد نرمی، عاجزی اور اعلی اخلاق ہیں کیونکہ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق اللہ کے رسول ﷺ کا ہاتھ کبھی بھی کسی اجنبی عورت کے ہاتھ سے مس نہ ہوا۔

اور اس روایت کے تمام طرق جمع کریں تو جو واقعہ سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک لونڈی کے جس کی عقل بھی کم ہے، آپ ﷺ سے کچھ کہنا چاہتی ہے اور آپ اس کی بات سنتے ہیں اور اس کی حاجت پوری کر دیتے ہیں۔ یہ صحیح ابن حبان کی روایت میں ہے۔ جن روایات میں ہاتھ پکڑنے کا ذکر ہے، وہاں عمومی بات بیان ہوئی ہے لیکن بعض لوگوں نے غلط ترجمے سے اسے ایک واقعہ بنا دیا۔ اور جن روایات میں یہ بطور واقعہ بیان ہوا ہے، وہاں ہاتھ پکڑنے کا ذکر نہیں ہے جیسا کہ اوپر روایت نقل ہو چکی۔ اور زیادہ صحیح روایت وہی ہے کہ جس میں واقعہ بیان ہوا ہے جبکہ ابن ماجہ کی روایت کو تو بعض محققین نے ضعیف بھی کہا ہے۔

اور یہ کہنا کہ یہ مسئلہ سد الذرائع کے باب سے ہے کہ اگر شہوت نہ ہو تو جس عورت سے بھی مصافحہ کر لو، کوئی حرج نہیں ہے۔ عرض یہ ہے کہ شہوت کیا مصافحہ سے پہلے ہی ہونی ہے؟ یہ تو کسی عورت سے مصافحہ کرنے کے بعد ہی معلوم ہو گا کہ چھونے سے شہوت ہوئی یا نہ ہوئی۔ البتہ کسی اسی نوے سال کی بوڑھی خاتون سے بعض فقہاء کے نزدیک مصافحہ کی اجازت نکل سکتی ہے کہ یہاں انضباط موجود ہے اور وہ اس خاتون کا عجائز میں سے ہونا ہے۔ بڑھاپا تو ایک منضبط وصف ہے کہ اس کی بنیاد پر ضابطہ بندی ہو سکتی ہے لیکن شہوت منضبط وصف نہیں ہے کہ یہ ضابطے میں نہیں آ سکتی کہ ظاہر وصف نہیں ہے۔

اور سد الذرائع والے اگر یہ بھی بتلا دیں کہ عورت کو بوس و کنار کرنا، اس سے گلے ملنا کن روایات کے تحت ممنوع ہے کیونکہ مس کا ترجمہ تو آپ نے مباشرت اور جماع کر

دیا۔اب باقی فقہاء تو مس یعنی عورت کو چھونے اور ٹچ کرنے والی روایات ہی سے زنا کے تمام مقدمات کی حرمت ثابت کرتے ہیں۔ تو آپ کے نزدیک اگر شہوت محسوس نہ ہوتی ہو تو عورت کو بوس و کنار کرنا یا اس سے گلے ملنا یا اس کا سر اپنی گود میں رکھ لینا، کس دلیل کے تحت حرام ہو گا، یا یہ سب بھی جائز ہے؟

یہ بات سچ ہے کہ میرا باپ کم نہیں ہے میری ماں سے!

معلوم نہیں کیا وجہ ہے کہ ہمارے ہاں شاعروں نے ماں کو تو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے لیکن باپ پر شاعری ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ بس ایک نا معلوم شاعر کی نظم ملتی ہے جو پہلے بھی شیئر کی تھی، اب دوبارہ کر رہا ہوں کہ اولاد کو بھی احساس ہو کہ یہ صرف ماں نہیں ہے جو اولاد کا کرتی ہے بلکہ باپ بھی ان کے لیے بہت کچھ کرتا ہے۔ معاشرے اور شاعروں نے یہ تو بتلا دیا کہ ماں، اولاد کے لیے بہتقر بانیاں دیتی ہے لیکن باپ کے ایثار کا کسی نے احساس تک نہ کیا اور باپ کی عظمت کے لیے کیا یہ کم ہے کہ اسے اس کی بھی پروا نہیں ہے کہ شاعروں نے اسے کوئی تمغہ محبت دیا بھی ہے یا نہیں۔

فیس بک کے نوجوان شاعر ساتھیوں سے گزارش ہے کہ وہ باپ کے موضوع پر بھی کچھ کہیں۔ اور خاص طور آج کل کے باپ تو اپنی اولاد کا بہت کچھ کرتے ہیں۔ جو آفس میں بہت مدبر اور مفکر ہے، وہ گھر میں اپنے بچوں کو تھوڑی دیر ہنسانے کے لیے گھوڑا اور جو کر بنا ہوتا ہے۔ دفتر میں لوگ جس کا انتظار کرتے ہیں، وہ اسکول کے باہر اپنے بچوں کا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ میں تو یہ بھی کہتا ہوں باپ اپنے بچے کی پیدائش کی تکلیف میں بھی ماں کے ساتھ شریک ہوتا ہے کہ حمل ایک بیماری سے کم نہیں ہے اور نو ماہ کسی بیمار کے ساتھ رہنا اور ساتھ میں اس کا دھیان بھی کرنا تو یہ شراکت ہی تو ہے۔ اب کے تو باپ بچوں کے پیمپرز بھی تبدیل کر دیتے ہیں۔ بہر حال اس بارے ایک گم نام شاعر کی ایک نظم ملاحظہ فرمائیں:

عزیز تر مجھے رکھتا ہے وہ رگ و جان سے
یہ بات سچ ہے کہ میرا باپ کم نہیں ہے میری ماں سے!

وہ ماں کے کہنے پہ کچھ رعب مجھ پر رکھتا ہے
یہ ہی وجہ ہے کہ وہ مجھے چومتے ہوئے جھجکتا ہے!
وہ آشنا میرے ہر کرب سے رہا ہر دم
جو کھل کے رو نہیں پایا مگر سسکتا ہے!
جڑی ہے اس کی ہر اک ہاں میری ہاں سے
یہ بات سچ ھے کہ میرا باپ کم نہیں ہے میری ماں سے!
ہر اک درد وہ چپ چاپ خود پہ سہتا ہے
تمام عمر سوائے میرے وہ اپنوں سے کٹ کے رہتا ہے!
وہ لوٹتا ہے کہیں رات کو دیر گئے، دن بھر
وجود اس کا پسینہ میں ڈھل کر بہتا ہے!
گلے رہتے ہیں پھر بھی مجھے ایسے چاک گریبان سے
یہ بات سچ ھے کہ میرا باپ کم نہیں ہے میری ماں سے!
پرانا سوٹ پہنتا ہے کم وہ کھاتا ہے
مگر کھلونے میرے سب وہ خرید کے لاتا ہے!
وہ مجھے سوئے ہوئے دیکھتا رہتا ہے. جی بھر کے
نجانے کیا کیا سوچ کر وہ مسکراتا رہتا ہے!
میرے بغیر تھے سب خواب اس کے ویران سے
یہ بات سچ ھے کہ میرا باپ کم نہیں ہے میری ماں سے!

والدین کی زیادتی

دوست کا کہنا ہے کہ وہ اپنی والدہ کے حقوق پورے کرتا ہے لیکن اس کی والدہ اس کا حق ادا نہیں کرتیں، اس کی والدہ اس کے بھائی کو اس پر ترجیح دیتی ہیں، وہ صحیح بھی ہو تو اس کو ڈانٹ ہی پڑتی رہتی ہے اور اس کا بھائی غلط بھی ہو تو اسے پیار ہی ملتا ہے، حالانکہ وہ گھر کا خرچہ بھی اٹھاتا ہے لیکن پھر بھی زیر عتاب رہتا ہے جبکہ اس کا بھائی فارغ رہ کر بھی چہیتا ہے وغیرہ وغیرہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ فی زمانہ والدین سے اولاد کی شکایات بڑھتی چلی جارہی ہیں اور اس کی وجہ سے اولاد اور والدین میں فاصلہ زیادہ ہو رہا ہے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ ہمارے ہاں منبر و محراب سے والدین کے حقوق جس شد و مد سے بیان کیے جاتے ہیں، وہاں اولاد کے حقوق کا موضوع ہی اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں تسلیم ہے کہ والدین کے بہت حقوق ہے لیکن شریعت میں اولاد کے بھی حقوق ہیں۔ اولاد کے جقوق میں سے ایک بڑا حق یہ ہے کہ والدین اولاد کے ساتھ حسن سلوک میں عدل اور برابری کریں۔

رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے جب اپنے ایک بچے کو اپنا ایک باغ ہبہ کرنا چاہا تو اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ آپ اس پر گواہ بن جائیں کہ میں اپنا یہ باغ اپنے اس بچے کو ہبہ کر رہا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے پوچھا کہ آپ کی اور بھی اولاد ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ ہاں ہے۔ تو اس پر آپ ﷺ نے کہا کہ میں ظلم پر گواہ نہیں بن سکتا یعنی جب تم ایک کو دے رہے ہوں اور دوسروں کو محروم کر رہے ہوں تو یہ ظلم اور زیادتی ہے۔

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں کہ آپ نے ان سے کہا کہ کیا تم چاہتے کہ تمہاری ساری اولاد تمہارے ساتھ حسن سلوک کرے؟ تو انہوں نے کہا کہ کیوں نہیں؟ تو آپ نے کہا کہ پھر ایسے نہ کرو، کیونکہ جس اولاد کو تم محروم کر رہے ہو تو اسے تو تم خود اس بات پر آمادہ کر رہے ہو کہ تمہارے ساتھ حسن سلوک نہ کرے۔ اور یہ حدیث والدین کو نہ صرف مال میں عدل کرنے کی نصیحت کرتی ہے بلکہ رویوں میں بھی برابری کا حکم دیتی ہے۔

اسی طرح والدین کی زیادتی کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ شادی شدہ بچے کو اس کی بیوی اور بچوں کے سامنے ذلیل کریں، یا اس کی بیوی بچوں کو اس کے سامنے ذلیل کریں۔ اور بعض اوقات چھوٹی چھوٹی بات اور اختلاف پر اولاد کو بددعائیں دینے لگ جانا بھی والدین میں عام ہے۔ یہ سب ظلم ہی کی صورتیں ہیں، ایسے میں اولاد کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ انہیں ہر حال میں اپنے والدین سے حسن سلوک ہی کرنے کا حکم

ہے، وہ قاضی نہیں ہیں کہ اپنے والدین کے بارے فیصلہ کرنا شروع کر دیں۔
لیکن اتنا وہ کر سکتے ہیں کہ والدین کی بد دعاؤں کی وجہ سے ڈیپریشن میں نہ چلے جائیں، زندگی سے مایوس نہ ہو جائیں، یہ ذہن میں رکھیں کہ یہ میرے لیے تو والدین ہیں لیکن ہیں عام انسان ہی لہذا ان سے غلطی ہو سکتی ہے۔ پس اپنے حصے کا حسن سلوک کرتے رہیں اور ان کے حصے کی زیادتی پر صبر کریں اور کسی ڈیپریشن یا گلٹ میں مبتلا نہ ہوں جب تک کہ اپنے فرائض احسن طریقے سرانجام دے رہے ہوں۔

دوست بنانے کا معیار

دوست نے سوال کیا ہے کہ کیا ہمارے دین نے دوست بنانے کا کوئی معیار مقرر کیا ہے یا اس بارے کوئی ہدایت جاری فرمائی ہے کہ کن کو دوست بنانا چاہیے اور کن کو نہیں؟

جواب: یہ ہمارے دین کے بنیادی موضوعات میں سے ہے کہ دوستی کی بنیاد دینداری ہونی چاہیے۔ قرآن مجید میں سورہ التوبۃ میں اہل ایمان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ سچے لوگوں کی صحبت میں رہو۔ پس ﴿وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ [التوبة: 119] ترجمہ: اور سچے لوگوں کی صحبت میں رہو، میں دوستی کا ایک معیار بیان کر دیا گیا اور وہ سچائی ہے۔ جو شخص جس قدر سچا ہے، وہ آپ کا اتنا ہی قریبی دوست ہونا چاہیے۔ اور سچ صرف زبان کا نہیں ہے بلکہ سچ تو ایک "حال" ہے کہ جس میں بندہ مومن ہر حال میں رہتا ہے۔ جھوٹے کو دوست بنانا دین کا نقصان تو ہے ہی جبکہ پرلے درجے کی بے وقوفی بھی ہے کہ اس میں دنیا کا بھی نقصان ہے۔

اسی طرح سورۃ الکہف میں حکم دیا گیا ہے کہ ان لوگوں کی صحبت میں رہیں کہ جو صبح وشام اللہ سے دعائیں کرتے ہیں اور ہر وقت اس کو راضی کرنے میں لگے ہیں۔ بلکہ رہنے کی بجائے الفاظ ہیں ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ﴾ [الكهف: 28] کہ اپنے نفس کو ان کے ساتھ روکے رکھیں۔ یہاں صبر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کہ اگر ایسا ہو کہ ایسے لوگوں کی صحبت یا دوستی پر انسان کا دل آمادہ نہ ہوتا ہو تو صبر کے ساتھ بھی ان کی صحبت اور دوستی اختیار کرنی

پڑے تو لازماً کرے۔ اس آیت مبارکہ میں صبح وشام دعا کا اہتمام کرنے والوں اور ہر حال میں اللہ کو خوش رکھنے کے لیے مجاہدہ کرنے والوں کی صحبت اور دوستی اختیار کرنے کا حکم دیا گیا۔

اسی طرح سنن الترمذی کی ایک روایت کے الفاظ ہیں: «الْمَرْءُ عَلَى دِينِ خَلِيلِهِ، فَلْيَنْظُرْ أَحَدُكُمْ مَنْ يُخَالِلْ» کہ انسان اپنے جگری دوست کے دین پر ہوتا ہے، پس تم یہ غور کر لیا کرو کہ کسے تم اپنا گہرا دوست بنا رہے ہو۔ صحیح مسلم کی ایک روایت کا مفہوم ہے کہ صالحین کو دوست بناؤ کہ ان کی مثال مشک کی سی ہے۔ مسند احمد کی ایک روایت کا مفہوم ہے کہ اللہ عزوجل کہتے ہیں کہ میری محبت ان لوگوں کے لیے واجب ہو گئی جو میری محبت میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں، ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور ایک دوسرے پر خرچ کرتے ہیں۔ اب اللہ کی محبت میں یہ سب کچھ کرنے سے مراد یہ ہے کہ ایک دوسرے کے تقویٰ اور پرہیز گاری کی وجہ سے یہ کرتے ہیں۔

ایک فالوور نے یہ بھی سوال کیا ہے کہ کچھ لڑکیاں اور خواتین، میسنجر، فون اور واٹس ایپ وغیرہ پر علماء، مفتیان کرام، داعیان دین وغیرہ سے مستقل رابطے میں رہتی ہیں تاکہ دین کا علم حاصل کر سکیں یا موٹیویشن لے سکیں، کیا یہ درست ہے؟ جواب: اگر تو کبھی کبھار کسی عالم دین یا اسکالر سے مسئلہ پوچھ لیا تو اس میں تو کوئی حرج نہیں ہے، ان شاء اللہ۔ لیکن اگر مستقل رابطہ ہے، چاہے دین کے نام پر ہو، تو یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا، اس سے بچنے کی کوشش کرے۔ میسنجر، واٹس ایپ اور موبائل میں اگرچہ ورچوئل خلوت ہے لیکن بہر حال اس کے مسلسل ہونے سے بھی اجتناب کرنا چاہیے کہ یہ تسلسل اس خلوت کا ذریعہ بن سکتا ہے کہ جس کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ جہاں مرد اور عورت تنہاء ہوتے ہیں، وہاں تیسرا شیطان ہوتا ہے جیسا کہ سنن الترمذی میں یہ روایت موجود ہے۔ البتہ خواتین اگر محرم کے ساتھ یا گروپس کی صورت میں مرد اساتذہ سے استفادہ کریں تو وہ درست ہے کہ یہاں خلوت نہیں ہے۔

عورت کی مسجد کی نماز افضل ہے یا گھر میں؟

دوست کا سوال ہے کہ عورت کی مسجد میں نماز افضل ہے یا گھر میں؟ تو اس بارے فقہاء کا اختلاف ہے۔ جمہور فقہاء امام مالک، امام شافعی، امام احمد رحمہم اللہ کے نزدیک عورت کا مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا جائز (allowed) ہے جبکہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک مکروہ (discouraged) ہے۔ اور تیسرا موقف امام ابن حزم رحمہ اللہ کا ہے کہ عورتوں کا مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا افضل اور مستحب (preferred) ہے۔ ہماری رائے میں یہی تیسرا موقف احادیث کی روشنی میں صحیح ترین موقف ہے کہ جس کا خلاصہ ہم ذیل میں نقل کر رہے ہیں۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ تمام احادیث کہ جن میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کو اکیلے نماز پڑھنے سے پچیس یا ستائیس گناہ افضل کہا گیا ہے تو اس حکم میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی شامل ہیں کیونکہ شریعت کا عمومی اصول یہی ہے کہ مردوں کو خطاب میں عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں الا یہ کہ عورتوں کے استثناء (exception) کی کوئی دلیل موجود ہو تو وہ یہاں ہے نہیں۔ سنن ابو داود کی ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ جماعت کی نماز پچیس گناہ افضل ہے تو یہ مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے ہے۔

امام ابن حزم رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ یہ عجیب فتوی ہے کہ عورت کی نماز گھر میں افضل ہے لیکن مسجد میں جا سکتی ہے؟ اگر مسجد میں اس نے مشقت اور سفر کے ساتھ جانا ہے اور اپنا اجر بھی کم کرنا ہے تو اسے یہ اجازت ہی کیوں دی گئی ہے؟ مطلب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کو مسجد میں جانے کی اجازت دے کر ان کا اجر ضائع کرنا چاہ رہے ہیں؟ اور یہ دعوے کہ خلفائے راشدین کے دور میں عورتوں کے مساجد میں جانے پر پابندی لگا دی گئی تھی تو یہ بالکل غلط ہے، اس کی کوئی صحیح روایت میں دلیل موجود نہیں ہے بلکہ دلائل تو اس کے خلاف موجود ہیں۔

صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیوی کو کہا گیا کہ عمر رضی اللہ عنہ آپ کا مسجد میں نماز کے لیے آنا پسند نہیں کرتے، تو انہوں نے جواب دیا کہ عمر رضی اللہ عنہ مجھ سے

خود کیوں نہیں بات کر لیتے؟ تو اس شخص نے کہا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی اس روایت کی وجہ سے عمر رضی اللہ عنہ آپ کو خود سے منع نہیں کر رہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کی بندیوں کو مسجد میں آنے سے مت روکو۔ تو امیر المومنین تو خواہش کے باوجود اپنی اہلیہ کو روک نہیں پائے کہ ان کے دلوں میں قول رسول ﷺ کا واقعی احترام موجود تھا۔

صحیح مسلم کی روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے جب ایک مرتبہ یہ حدیث بیان کی کہ اللہ کی بندیوں کو مسجد میں جانے سے مت روکو تو ان کے بیٹے بلال رحمہ اللہ نے ان سے کہا کہ ہم تو روکیں گے تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو وہ برا بھلا کہا کہ شاید ہی زندگی میں کسی کو اتنا برا بھلا کہا ہو اور ساتھ میں یہ بھی کہا کہ میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کا حکم سنا رہا ہوں اور تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں اپنی بیوی کو مسجد میں جانے سے روکوں گا۔ بعض روایات میں ہے کہ ایک عرصے تک انہوں نے اپنے بیٹے سے کلام نہیں کیا۔ اسی وجہ سے امام ابن حزم رحمہ اللہ کا موقف یہ ہے کہ اگر خاوند اپنی بیوی کو مسجد جانے سے روکے گا تو گناہ گار ہو گا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی ہے۔

رہی وہ روایات کہ جن میں عورت کی گھر کی نماز کو مسجد کی نماز سے افضل قرار دیا گیا ہے تو ان میں سے کوئی بھی روایت صحیح نہیں ہے۔ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے ایسی تمام روایات کی صحت میں شک کا اظہار کیا ہے۔ سنن ابوداود میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ اللہ کی بندیوں کو مسجدوں سے مت روکو اور ان کے گھر ان کے لیے بہتر ہیں۔ لیکن اس روایت کے آخری الفاظ شاذ ہیں کہ ثقات کی مخالف ہو رہی ہے۔ نافع، سالم اور مجاہد نے جب یہی روایت عبداللہ بن عمر سے نقل کی ہے تو آخری الفاظ کو نقل نہیں کیا، یہ آخری الفاظ صرف حبیب بن ابی ثابت کی روایت میں ہیں۔ اس بارے ام حمید کی روایت کو ابن حزم رحمہ اللہ نے موضوع کہا ہے، ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت موقوف ہے اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت بھی ثابت نہیں ہے۔

رہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کہ جس میں انہوں نے یہ کہا کہ اگر اللہ کے رسول ﷺ اس زمانے کو پا لیتے تو عورتوں کو مسجدوں میں جانے سے منع کر دیتے جیسا

کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کے لیے منع تھا تو امام ابن حزم رحمہ اللہ نے اس روایت کے بارے آٹھ جواب دیے ہیں کہ جن میں ایک یہ ہے کہ حضرت عائشہ نے منع نہیں کیا، انہوں نے صرف اپنی ایک سوچ کا اظہار کیا ہے تو ان کی اس سوچ کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے احکامات قیامت تک کے احوال کو پیش نظر رکھ کر ہی صادر فرمائے ہیں۔

بھئی، اہل حدیث اور حنفی مفتی اس پوسٹ سے دور رہیں، اپنا سودا اپنی وال پر بیچیں، ہمیں بھی کچھ کام کرنے دیں، ہماری ایک آدھ پوسٹ کی مخالفت سے نہ تو حنفیت ختم ہو جائے گی اور نہ ہی اہلحدیثیت کو کوئی خطرہ لاحق ہے۔ آپ کے سارے دلائل ہمارے علم میں ہیں، بس آپ اپنا موقف اپنی وال پر پیش کر رہے ہیں تو دوسروں کے موقف کے لیے بھی صبر پیدا کریں۔ اگر عورتوں کو گھر بٹھانے کا شوق ہی ہے تو ان کو ہائی اسکول، کالج، یونیورسٹی میں تعلیم کے لیے جانے پر کوئی فتوے دیں کیونکہ اصل فتنہ تو وہاں ہے، اللہ کے گھر میں نہیں۔

بلکہ اپنے خواتین کے مدرسوں کو غیر شرعی ڈیکلیئر کر دیں کہ مسجد میں جانے کی اجازت نہیں ہے تو مدرسہ میں جانے کے لیے کیا فتنہ ختم ہو گیا ہے؟ اور ہاں اپنی عورتوں کے بازار، پارک، شاپنگ مال اور سیر وسیاحت کے لیے نکلنے پر بھی کوئی فتوی دیں، اصل فتنہ تو جہاں ہے، وہاں تو سب مفتی اپنی بیویوں کو لے کر پہنچے ہوتے ہیں، بس فتوی صرف اس وقت یاد آتا ہے جب کسی عورت کی مسجد میں جانے کی بات کی جائے۔ اور اس کی وجہ صرف اتنی ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ سے مسجد میں جانے کے بارے کراہت کا فتوی منقول ہے۔

مسجد اور کلچر

اگر ہم مسجد کو اپنے کلچر کا حصہ بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کے ڈیزائن کو حالات کے تقاضوں کے مطابق کچھ ریوائز کرنا ہو گا اور اسلامک آرکیٹیکچر کا ذہن رکھنے والوں کو اس طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ مثال کے طور پر سیر وسیاحت، پکنک، پارکوں میں

تفریح کے لیے نکل جانااور ہوٹلنگ وغیرہ ہمارے کلچر کا حصہ ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے پارک اور ہوٹلز ہماری فیملیز کو سامنے رکھ کر ڈیزائن کیے گیے ہیں نہ کہ صرف مردوں کو۔

بہت سے ایسے ایونٹ کمپلیکس اور شادی ہالز دیکھنے کو ملتے ہیں کہ جہاں کوئی دینی پروگرام یاایکٹوٹی ہو تو ساتھ میں عورتوں اور بچوں کا بھی علیحدہ سے انتظام ہوتا ہے تو لوگ وہاں اکیلے نہیں بلکہ فیملیز کے ساتھ شرکت کرتے ہیں تو ایسے میں دین ان کے لیے بوجھ نہیں رہتا بلکہ انجوائے منٹ بھی بن جاتا ہے۔ جہاں میں اس مرتبہ رمضان میں دورہ ترجمہ قرآن کروارہاہوں تو وہ ایک شادی ہال ہے، جہاں عورتوں کا الگ سے انتظام ہے اور ساتھ بچوں کے لیے بھی چھوٹا سا پلے ایریا(play area) مختص کر دیا گیا ہے۔ لہذا اب مردوں کے لیے اس پروگرام میں شرکت کرنا زیادہ آسان ہے اور ان کی شرکت کی نسبت بھی بڑھ جاتی ہے۔

یہ سب کچھ ہم کیا مسجد کے ساتھ نہیں کر سکتے ہیں کہ مثلاً بعض مساجد میں کچھ جگہ عورتوں کے لیے تو مختص ہوتی ہی ہے، اگر تھوڑی جگہ جو مسجد میں شامل نہ ہو لیکن اس سے ملحق ہو، چاہے ایک کمرہ ہی کیوں نہ ہو، اسے بچوں کے پلے ایریا کے طور پر مختص کر دیا جائے تو رمضان اور غیر رمضان میں نہ صرف مسجد میں آنے والے مرد و خواتین کی تعداد میں اضافہ ہو گا بلکہ بچوں کی ایک اچھی خاصی تعداد بھی اسلامی ماحول میں پلے بڑھے گی اور وہ عبادت تو کچھ نہ کچھ کر ہی لیں گے۔ اور اگر نہ بھی کر سکیں تو کم از کم ان کی دوستیوں کی بنیاد دین بن جائے گا اور اس کا ان کی فیوچر لائف پر بہت اثر پڑے گا۔

اگرچہ اسلامک سینٹرز ڈیزائن کرتے وقت ان باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے لیکن مساجد کے لیے اس کا اہتمام نہ ہونے کے برابر ہے حالانکہ صحیح احادیث کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں عورتوں اور بچوں کا مساجد میں آنا عام تھا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ مسجد اور مسجد میں ہونے والی ایکٹوٹیز میں شرکت کی نسبت کی کمی کی وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ خواتین اور بچے، مردوں سے اپنے حصے کا وقت

مانگتے ہیں اور کوئی ایسی ایکٹوٹی چاہتے ہیں کہ جس میں پوری فیملی شریک ہو۔

ہمارے معاشرے اتنے بھی دین بیزار نہیں ہیں جتنا کہ ہم نے انہیں سمجھ لیا ہے، بس ہم نے اپنے دین کو اپنے کلچر میں رچنے بسنے کا موقع بہت کم دیا ہے۔ آپ اسلامی معاشرے میں مسجد کو اس طرح سے ڈیزائن کر دیں کہ وہاں خواتین ہال بھی ہو، بچوں کے لیے پلے ایریا بھی ہو، آڈیٹوریم بھی ہو، فیملیز مل کر ایک دن کی ورکشاپ بھی اٹینڈ کریں اور مل جل کر کھانا بھی کھائیں، تو ایسی صورت میں یہی مسجدیں ہمارے کلچر کا حصہ بن سکتی ہیں۔

اگرچہ اس میں یہ خدشہ ہے کہ ایسی صورت میں یہ مساجد کہیں پکنک کی جگہیں نہ بن جائیں لیکن ہمارے ہاں اسلامی تحریکوں کے تحت جس طرح اسلامک سینٹرز، کمیونٹی سینٹرز اور شادی ہالز میں بھی دینی ایکٹوٹی میں پوری پوری فیملیز شرکت کرتی ہیں بلکہ ایک ایسا ماحول پیدا ہو جاتا ہے جو مسجد کے ماحول سے کسی طرح کم نہیں ہوتا تو ہمارے معاشرے میں مساجد بھی اسی طرح سے آباد ہو سکتی ہیں جیسے ہوٹلز، پارک اور بازار آباد ہیں۔ اگرچہ یہ بات واضح ہے کہ مسجد کو بازار یا ہوٹل نہیں بنانا ہے لیکن کم از کم کچھ ایسا تو کیا جا سکتا ہے کہ جس کی روایات کی روشنی میں اجازت نکلتی ہو اور یورپ کی مساجد میں یہ کام بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔

قبلہ رخ تھوکنا

دوست کا سوال ہے کہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں قبلہ رخ تھوکنے سے منع کیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ تمہارا رب تمہارے سامنے ہوتا ہے۔ تو سلف کا جو عقیدہ تھا کہ اللہ عزوجل عرش پر ہے تو یہ حدیث تو اس عقیدے کے خلاف جا رہی ہے۔ سلف کے ہاں اس کا مفہوم کیا ہے؟

صحیح بخاری کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے مسجد میں قبلہ رخ دیوار پر تھوک دیکھی تو اسے کھرچ ڈالا اور ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ جب تم نماز میں ہوتے ہو تو اپنے رب سے سرگوشی کرتے ہو جبکہ وہ تمہارے اور قبلے کے

درمیان ہوتا ہے۔ ایک اور روایت کے الفاظ ہیں کہ اللہ عزوجل نماز میں نمازی کے چہرے کے سامنے ہوتے ہیں۔ امام بیہقی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ اللہ عزوجل نمازی اور قبلے کے درمیان ہوتے ہیں تو یہ الفاظ حدیث کے راوی حمید کا اضافہ ہے کہ حمید نے یہ الفاظ "أو" یعنی لفظ شک کے ساتھ بیان کیے ہیں جبکہ دوسری روایات سے ثابت شدہ الفاظ یہ ہیں کہ اللہ عزوجل نماز کی حالت میں نمازی کے چہرے کے سامنے ہوتے ہیں۔

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ اگر کسی کو نماز کی حالت میں تھوکنا ہی ہے تو اپنے دائیں طرف بھی نہ تھوکے بلکہ بائیں طرف پاؤں کے نیچے تھوک لے۔ تو نمازی کو سامنے اور دائیں طرف تھوکنے سے منع کیا گیا ہے جبکہ بائیں طرف کی اجازت دی گئی ہے لہذا نماز کی حالت میں قبلہ رخ تھوکنا منع ہے۔ لیکن نماز کے علاوہ میں کیا قبلہ رخ تھوکا جا سکتا ہے تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے اور راقم کی رائے اس بارے یہی ہے کہ ممانعت صرف نماز میں ہے جبکہ غیر نماز میں جواز ہے کہ ارشاد باری تعالی ہے کہ ﴿فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ﴾ [البقرة: 115] ترجمہ: تم جس طرف بھی رخ کرو تو اسی طرف اللہ عزوجل ہے۔ لہذا ممانعت کی وجہ مسجد اور نماز ہے۔

رہی یہ بات کہ اللہ عزوجل عرش پر ہے تو یہ بات قرآن مجید میں سات مقامات پر بیان ہوئی ہے لہذا اس کا انکار یا تاویل، قرآن مجید میں تحریف کے قائمقام ہے اور اس کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب "وجود باری تعالی" کے تیسرے باب میں بیان کر دی ہے۔ اور جو اس روایت میں کہا گیا ہے کہ اللہ عزوجل نمازی کے سامنے ہوتا ہے تو اس میں اور قرآن مجید کے بیان میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ دونوں میں جمع ممکن ہے۔ سورج ہمارے سامنے بھی ہوتا ہے اور ہم سے اوپر بھی یعنی جہت علو میں۔ لہذا اللہ عزوجل کا عرش پر ہونا اور سامنے ہونا ایک دوسرے کے منافی نہیں ہے۔

دوسرا یہ کہ اگر اس حدیث کو اللہ عزوجل کے ہر جگہ موجود ہونے کی دلیل بنایا جائے تو یہ درست نہیں ہے کہ حدیث خود کہہ رہی ہے کہ وہ سامنے ہوتا ہے یعنی تمہارے بائیں طرف یا پاؤں کے نیچے نہیں ہوتا، اسی لیے تو بائیں طرف اور پاؤں کے نیچے

تھوکنے کی اجازت دی ہے لہذا یہ اعتراض باقی نہیں رہتا کہ عرش پر اللہ کو ماننے سے اللہ عزوجل محدود ہو جاتا ہے۔ جو عرش پر اللہ عزوجل کو اس شبہے سے نہیں مانتے، کیا وہ یہ مانتے ہیں کہ اللہ عزوجل ان کے پاؤں کے نیچے ہے؟ اگر نہیں تو انہوں نے بھی اللہ عزوجل کے لیے مکان مان لیا ہے۔ اور حق اس مسئلے میں وہی ہے کہ جو قرآن مجید نے بیان کیا ہے کہ وہ عرش کے اوپر ہے جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے۔ اور "پر ہونے" اور "اوپر ہونے" میں بھی بہت فرق ہے۔

امتحان، کھیل کود اور شاپنگ کی وجہ سے روزہ ترک کرنا

دوست کا سوال ہے کہ اگر رمضان میں طالب عالم کو روزہ رکھنے کی وجہ سے امتحانات کی تیاری میں مشکل پیش آئے، یا وہ پیشہ ور کھلاڑی ہو اور اسے کسی قومی میچ میں شرکت کرنی ہو، یا خواتین نے رمضان میں دن میں عید کی شاپنگ کرنی ہو اور ان کے لیے روزہ رکھنا مشکل ہو تو ایسی صورتوں میں روزہ ترک کیا جا سکتا ہے؟

اللہ عزوجل نے ہر عاقل اور بالغ مسلمان پر روزہ رکھنا فرض قرار دیا ہے اور قرآن مجید میں حکم ہے: ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ [البقرة: 185] ترجمہ: کہ جو بھی تم میں سے رمضان کا مہینہ پالے تو وہ روزہ رکھے۔ اب "جو بھی" میں سب مکلف داخل ہیں، البتہ قرآن مجید نے "جو بھی" سے دو کا استثناء کیا ہے؛ ایک مریض اور دوسرا مسافر کہ یہ اگر دوسرے دنوں میں روزہ رکھ لیں تو ان کو یہ اجازت حاصل ہے۔

پس ایک تو مسافر کو روزہ دوسرے دنوں میں پورا کرنے کی اجازت ہے اور دوسرا مریض کو۔ ایک حدیث کے مطابق اللہ کے رسول ﷺ نے حاملہ (pregnant) اور مرضعہ یعنی دودھ پلانے والی ماں کو بھی مریض میں شمار کیا ہے۔ اب اگر اس میں غور کیا جائے کہ اللہ عزوجل نے مریض اور مسافر کو یہ رخصت کیوں دی ہے تو یہ بات واضح ہے کہ اس کی حکمت مشقت ہے کہ شریعت میں جہاں شرعی احکام کو پورا کرنے میں حد سے زیادہ مشقت پیدا ہوتی ہے تو وہاں رخصت نازل کر دی جاتی ہے۔

اب یہاں اہم بحث یہ ہے کہ شریعت کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے کہ جس میں مشقت نہ

ہو، وضو کرنے میں مشقت ہے، نماز پڑھنے میں بھی مشقت ہے، روزہ رکھنا خود سے مشقت کا کام ہے، حج میں کتنی زیادہ مشقت ہے، اور جہاد بھی مشقت ہے، تو شریعت کا ایسا کام ہے کون سا کہ جس میں مشقت نہ ہو۔ لہذا اگر کوئی شخص یہ کہے کہ جہاں مشقت ہو، وہاں لوگوں کو روزہ چھوڑنے کی رخصت دے دی جائے تو ایسا شخص پوری شریعت کو معطل کر کے رکھ دے گا۔

اس میں صحیح اپروچ یہ ہے کہ جب کسی شرعی حکم پر عمل کرنے میں مشقت ایسی ہو جو انسان کی برداشت سے باہر ہو تو اللہ عزوجل اس صورت میں رخصت جاری فرما دیتے ہیں جیسا کہ مریض اور مسافر کو روزہ چھوڑنے کی اجازت دی ہے اور اسے تکلیف مالا یطاق کہتے ہیں کہ ایسی تکلیف کہ جس کے برداشت کی انسان میں طاقت نہ ہو۔ اب ہر ملازم یا تاجر روزہ مشقت کے ساتھ رکھتا ہے کہ ملازمت اور تجارت ایک مشقت ہے اور روزہ اس پر دوسری مشقت ہے لیکن یہ مشقت قابل برداشت ہے لہذا ان میں روزہ رکھنا فرض ہے۔

دوسری اور اہم بات یہ ہے کہ روزہ چھوڑنے کے لیے جن چیزوں کو عذر مانا گیا ہے، وہ ایسی ہیں کہ جن کے آگے انسان مجبور ہوتا ہے جیسا مرض، سفر، حمل وغیرہ۔ مرض پر انسان کا اختیار نہیں ہے، سفر اور حمل انسان کی مجبوری ہے لہذا وہ عذر جو انسان پر جبر نہ ہو، انہیں عذر بنانا کیسے درست ہو سکتا ہے؟ پس ایک تو عذر ایسا ہو کہ وہ انسان پر جبر ہو اور دوسرا اس میں مشقت ایسی ہو جو کہ برداشت سے باہر ہو تو ایسی صورت میں روزہ ترک کیا جا سکتا ہے جیسا کہ سفر، مرض، حمل وغیرہ۔

دین کی دعوت و تبلیغ میں زکوۃ کی رقم خرچ کرنا

دوست کا سوال ہے کہ کیا دین کی دعوت و تبلیغ کے کام میں زکوۃ کی رقم خرچ کی جا سکتی ہے مثلاً وہ زکوۃ کی رقم سے قرآن مجید کے مختلف زبانوں میں تراجم شائع کروا کے غیر مسلموں میں تقسیم کروا دے۔ یا زکوۃ کی رقم سے کوئی مدرسہ یا فہم قرآن کا انسٹی ٹیوٹ بنوا دے کہ جہاں دین کی مفت تعلیم دی جائے۔ یا تبلیغی جماعت میں چار ماہ چلے

میں چلنے والوں کا خرچہ اٹھالے۔ یا دعوت و تبلیغ کے کام کا کوئی مرکز قائم کر لے وغیرہ

جواب: اس مسئلے میں علماء کا اختلاف ہے کہ ایسے مقامات میں زکوۃ کی رقم خرچ کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اور اس اختلاف کی وجہ "فی سبیل اللہ" کے معنی و مفہوم میں اختلاف ہے۔ قرآن مجید میں زکوۃ کے آٹھ مصارف بیان ہوئے ہیں یعنی آٹھ مقامات پر زکوۃ کی رقم خرچ کی جاسکتی ہے: فقیر پر، مسکین پر، زکوۃ کے محکمے میں کام کرنے والوں پر، نو مسلم یا وہ غیر مسلم جو اسلام قبول کرنے کے قریب ہو، اس کی دلجوئی کے لیے، غلاموں کی آزادی کے لیے، مقروض کے قرض کی ادائیگی کے لیے، فی سبیل اللہ کے لیے اور مسافر کے لیے۔

اب "فی سبیل اللہ" کے مفہوم میں فقہاء کا اختلاف ہو گیا کہ اس سے کیا مراد ہے؟ اس کا سادہ سا معنی تو یہ ہے کہ اللہ کے رستے میں زکوۃ لگائی جاسکتی ہے۔ تو اللہ کے رستے سے کیا مراد ہے؟ جمہور (majority) فقہاء کا کہنا یہ ہے کہ اس سے مراد جہاد اور قتال فی سبیل اللہ ہے یعنی مجاہد کے سامان جہاد وغیرہ کے لیے زکوۃ کی رقم خرچ کی جاسکتی ہے۔ بعض فقہاء نے اس مفہوم میں مزید وسعت پیدا کی ہے کہ اس میں مجاہد کے علاوہ حج اور عمرہ کرنے والا بھی شامل ہے کیونکہ وہ بھی اللہ کے رستے میں ہی ہے۔ یہ امام محمد رحمۃ اللہ اور حنابلہ کی ایک جماعت کا موقف ہے۔

بعض فقہاء نے "فی سبیل اللہ" کے مفہوم کو مزید وسعت دیتے ہوئے دین کے طالب علم کو بھی اس میں شامل کر لیا ہے، یہ بعض حنفی فقہاء کا موقف ہے۔ اور بعض فقہاء نے اس کا مفہوم بہت ہی وسیع کر دیا ہے اور کہا ہے کہ ہر نیکی اور خیر کا کام "فی سبیل اللہ" میں شامل ہے، یہ زیادہ تر معاصر فقہاء کا موقف ہے۔ اس موقف کے مطابق زکوۃ کی رقم فی سبیل اللہ کنواں کھدوانے میں بھی لگائی جاسکتی ہے کہ پیاسے کو پانی پلایا جا سکے اور گلی میں کھلے گٹر کو بند کروانے کے لیے بھی تا کہ اہل ایمان کو اذیت اور نجاست سے بچایا جا سکے۔

ہماری رائے میں "فی سبیل اللہ" سے مراد ہر کار خیر یا نیکی کا کام نہیں ہے بلکہ اس

سے مراد "جہاد" ہی ہے لیکن جہاد سے مراد صرف قتال یا جنگ نہیں ہے بلکہ جہاد سے مراد، دین کے غلبہ کے لیے کی جانے والی کسی بھی قسم کی جدوجہد اور کاوش ہے۔ پس دعوت و تبلیغ، تحریر و کتابت، تعلیم و تربیت اور درس و تدریس کی ہر وہ ایکٹوٹی کہ جس کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں دین پھیل جائے، عام ہو جائے، غالب ہو جائے، تو اس کے لیے زکوۃ کی رقم خرچ کی جا سکتی ہے۔ یہی معاصر علماء میں سے ڈاکٹر یوسف القرضاوی، ڈاکٹر سلمان العودہ وغیرہ کی رائے ہے۔

باقی تملیک یعنی زکوۃ کی رقم کا مالک بنانا وغیرہ جیسے فقہی ضابطوں پر بہت مغز ماری ہو چکی ہے، اب ہمیں اس سے آگے نکل آنا چاہیے۔ مدرسہ میں زکوۃ کی رقم لگانے کے لیے خواہ مخواہ حیلہ کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ پہلے طالب علم کو مالک بناؤ۔ مدارس اسلام کے قلعے ہیں، ان میں زکوۃ کی رقم لگ سکتی ہے، آسان سی بات ہے کہ ہم غزو فکری (intellectual war) کے دور میں سانس لے رہے ہیں۔ حکمت قرآن کا ایک خصوصی شمارہ اس موضوع پر شائع ہوا تھا کہ جس میں تملیک کے بارے دونوں طرف کے دلائل کا تذکرہ کیا گیا تھا۔

ویلنٹائن ڈے: ایک حیاسوز تہوار

ویلنٹائن ڈے کے آغاز کے بارے میں بہت سی باتیں کہی گئی ہیں کہ اس کی تاریخ یہ ہے، یا یہ اس وجہ سے شروع ہوا، تو اس کا پس منظر جو بھی ہو یہ بات البتہ طے ہے کہ اسے "عاشقوں کا تہوار" کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے، یہ لوورز فیسٹیول ہے، یہ اظہار محبت کا دن ہے۔

ہمارے ہاں کے لبرل طبقے کا کہنا یہ ہے کہ محبت کے اظہار میں برائی ہی کیا ہے؟ ان کا کہنا یہ ہے کہ مولوی کا تو کام ہی ہماری خوشیوں کو قتل کرنا ہے، ہماری مسرتوں کو روندنا ہے، ویلنٹائن ڈے، بسنت اور نیو ایئر نائٹ جیسے تہواروں کے بغیر ہماری روز مرہ کی زندگیاں پھیکی اور بدمزہ ہیں۔ یہ تہوار نکال دیں تو زندگی میں تو جیسے کوئی خوشی رہی ہی نہیں، بس بوجھ ہی بوجھ ہیں۔

انہیں یہ نہیں معلوم کہ رب کی نافرمانی کر کے حاصل ہونے والی خوشی کا انجام، مایوسی ہوتا ہے۔ اور انسان اس مایوسی کو ختم کرنے کے لیے گناہ میں مزید بڑھتا ہے کہ جس سے اسے وقتی خوشی ملتی ہے لیکن انجام کار میں مزید مایوسی بڑھ جاتی ہے، اندر کی مایوسی۔ اور ان کے پاس اس کا آخری حل ڈرگز ہیں، شراب ہے یا خودکشی۔ اور ہمارا نوجوان بھی اظہار محبت سے شروع ہوتا ہے، اور ڈرگ ایڈکشن پر ختم ہو جاتا ہے۔

ہاں، مغرب نے بھی اپنی زندگی کو رنگین بنانے کے لیے ہی ایسے تہواروں کا آغاز کیا تھا۔ پھر وہ ویلنٹائن ڈے میں محبوب کو محض گلاب کے پھول پیش کر کر کے بھی اکتا گئے، اب انہوں نے کہا کہ زندگی پھر سے بدمزہ اور پھیکی ہو گئی ہے، اب کچھ نیا ہونا چاہیے، بالکل نیا کہ جو پہلے کبھی نہ ہوا ہو۔ اس طرح وہ خوشی اور مسرت کے حصول کے لیے ہر دم نئے کی تلاش میں رہے کیونکہ پرانے سے وہ اکتا چکے تھے۔

اور مغرب کے بعض علاقوں میں تو ویلنٹائن ڈے پر عاشقوں کے برہنہ جلوس نکلتے ہیں کہ جنہوں نے اپنے سینوں اور اعضائے مخصوصہ پر اپنے محبوبوں کے نام لکھ رکھے ہوتے ہیں۔ یہ سب وہ محبت کے اظہار کے لیے کرتے ہیں، اور وہ بھی نت نئے طریقوں سے محبت کا اظہار کہ جس سے انہیں قلبی مسرت حاصل ہو۔

ایک صاحب نے یہ لکھا کہ اگر اس دن میں شوہر، اپنی بیوی سے اظہار محبت کر لے اور اسے گلاب کے پھول پیش کر دے تو پھر کیا تکلیف ہے؟ بھئی، تکلیف یہی ہے کہ تم سال میں ایک دن بیوی سے اظہار محبت کر کے یہ کہنا چاہتے ہوں کہ تم نے اس سے محبت کا حق ادا کر دیا ہے، تو یہ غلط بات ہے۔ کیا سال بھر تمہیں بیوی سے اظہار محبت کی فرصت نہیں رہی جو مخصوص دن کی ضرورت محسوس کر رہے ہو؟

جو جو کام تمہارے سال کے ہر دن کے کرنے کا تھا، تم نے ان سے جان چھڑانے کے لیے ہر ایک کا ایک دن مقرر کر لیا۔ یہ بیوی سے محبت کے اظہار کا دن ہے تو یہ ماں باپ سے پیار کا دن، یہ مزدوروں کا دن ہے تو یہ بچوں کا دن۔ مغرب کو تو ماں باپ کا دن منانے کی ضرورت ہے کہ وہ تو انہوں نے اولڈ ہومز میں جمع جو کروا دیے ہیں۔ ہمارے

معاشروں کو فی الحال اس کی ضرورت نہیں ہے کہ ان کی ہر صبح اور ہر شام ماں باپ کے لیے ایسی ہی ہوتی ہے کہ جیسے ان کا مادر فادر ڈے۔

رسم و رواج کی اہمیت اور ضرورت

آج ہم ایک عجیب مذہبی معاشرے کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں کہ جس میں کوئی رسم ورواج نہ ہو۔ ہر مذہبی شخص کے ذہن میں یہ تصور بٹھا دیا گیا ہے کہ رسم و رواج گویا کبیرہ گناہ سے کم نہیں ہے۔ اسلام رسم و رواج کے خلاف نہیں ہے البتہ اسلام اسی رسم و رواج کو پسند کرتا ہے کہ جس میں معاشرے کی فلاح و بہبود کا پہلو ہو۔ اور جو رسوم و رواج معاشرے میں ظلم اور بگاڑ کا باعث بنتے ہوں تو اسلام ان پر قدغن لگاتا ہے۔ ایک صحت مند معاشرے کے لیے رسم و رواج اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ صحت مند جسم کے لیے کھیل۔ رسم و رواج کے بغیر تو معاشرہ، بیماروں کا معاشرہ ہے۔

سوسائٹی میں رسم و رواج کا پیدا ہونا یا ختم ہونا، یہ اسلام کا موضوع نہیں ہے۔ جہاں معاشرت ہوگی، انسان مل جل کر رہیں گے، وہاں رسم و رواج پیدا ہوگا، یہ لازمی امر ہے کہ یہ انسان ہیں، اپنے جذبات کا اظہار چاہتے ہیں اور وہ رسم و رواج کے بغیر نامکمل ہے۔ اسلام کا موضوع یہ ہے کہ کوئی رسم اسلامی اقدار کے منافی نہ ہو، دین کے مقاصد کے خلاف نہ ہو، اس سے معاشرے میں ظلم اور بگاڑ پیدا نہ ہو رہا ہو، اسے دین نہ بنا لیا جائے، اسے فرض اور قانون کا درجہ نہ دیا جائے، اور اس میں اسراف اور فضول خرچی نہ ہو۔

اور رسم و رواج میں انہی پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کی اصلاح دین میں مطلوب ہے نہ کہ رسوم و رواج کو ختم کرنے کی تحریکیں چلانا۔ اگر کوئی شخص رسم و رواج کو ختم کرنے کی کوشش کرے گا تو وہ دراصل انسانی جذبات اور احساسات کو ختم کرنے کی کوشش کرے گا۔ آپ ایک رسم ختم کریں گے، دوسری اس کی جگہ لے لے گی کیونکہ رسوم و رواج کا تعلق انسان کے جذبات اور تعلقات سے ہے۔ اور جب تک انسانی جذبات اور تعلقات قائم رہیں گے، یہ رسم و رواج پیدا ہوتے رہے گے لہذا اسلام کا مقصود رسوم و رواج کا خاتمہ نہیں ہے بلکہ ان کی اصلاح ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے دور جاہلیت کی اکثر رسوم کی اصلاح کی نہ کہ سب رسموں کو بالکل ہی ختم کر دیا۔ البتہ جو ظالمانہ رسوم ورواج تھے تو انہیں آپ نے ختم کیا۔ یہ اہم نکتہ ہے کہ جسے اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اور رسموں کی بھرمار تو یہ ایک دوسری انتہا ہے اور غیر متوازن رویہ ہے لہذا یہ بھی پسندیدہ امر نہیں ہے کہ ہر وقت کھیل تماشے میں ہی لگے رہو۔

اور اہم تر نکتہ یہ ہے کہ اگر غیر شرعی رسوم ورواج کو ختم کرنا چاہتے ہو تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ رسوم ورواج کے خالق بنو۔ جب اپنی رسمیں ایجاد نہیں کرو گے جو عقیدہ توحید اور اسلامی کلچر کی نمائندہ ہوں تو پھر مغربی اور ہندوانہ کلچر کی رسوم ورواج سے ہی لڑتے رہو گے۔ تمہارے معاشرے، ہندو اور مغربی تہذیب سے کیوں خوفزدہ رہتے ہیں، مغربی اور ہندو معاشروں کو تمہارے کلچر سے کیوں خوف محسوس نہیں ہوتا؟ اس لیے کہ تم ایسے رسوم ورواج پیدا کرنے میں بانجھ عورت کی مانند ہو کہ جو عالمی ثقافت بن سکیں اور اس پر مستزاد یہ کہ اس نااہلی کو مذہب کی خدمت سمجھ رکھا ہے۔

برکینی (Burkini)

آحیدہ ایک لبنانی خاتون ہیں جو آسٹریلیا میں رہتی ہیں۔ وہ مسلم ویمن فیشن ڈیزائنر ہیں۔ ان کی ڈیزائن کی گئی دو پراڈکٹس کافی معروف ہوئیں۔ ایک تو انہوں نے کھیلوں میں شرکت کرنے والی مسلمان لڑکیوں کے لیے "حیجود" ڈیزائن کیا اور دوسرا مسلمان خواتین کی سوئمنگ کا لباس "برکینی" ڈیزائن کیا۔

"برکینی" ایک ایسا لباس ہے کہ جس میں سوئمنگ کے دوران خاتون کے چہرے، ہاتھ اور پاؤں کے علاوہ مکمل جسم ڈھکا ہوتا ہے۔ فرانس کی کچھ مسلمان خواتین نے سمندری ساحلوں پر جا کر جب اس لباس میں سوئمنگ کی تو ایک شور بپا ہو گیا۔ فرانس کے تقریباً تیس کے قریب شہروں کے میئرز نے اس لباس میں سوئمنگ پر پابندی لگا دی اور مسلمان خواتین کو جرمانے کیے گئے۔

اس لباس پر پابندی لگانے کی دو وجوہات اب تک بتلائی جا رہی ہے۔ ایک یہ کہ

فرانسیسی قانون میں یہ شامل ہے کہ گلی محلے کے کپڑوں (street clothes) میں سوئمنگ کی اجازت نہیں ہے۔ اور دوسرا یہ ہے کہ "برکینی" پہننے والوں کا تعلق دہشت گردوں سے ہو سکتا ہے۔ اس سارے قضیے میں عدالتیں تو "برکینی" پر پابندی لگانے کے حق میں ہیں جبکہ ہیومن رائٹس والے پابندی کے خلاف ہیں۔

فرانس کا مسئلہ صرف یہ نہیں ہے کہ مسلمان خاتون کو "برکینی" میں سوئمنگ کی اجازت دینی چاہیے یا نہیں بلکہ ان کا اصل چیلنج یہ ہے کہ "برکینی" اتنی تیزی سے مقبول ہوئی ہے کہ "بکینی" (Bikini) کی جگہ لے رہی ہے۔ اور "بکینی" سوئمنگ کا مختصر ترین لباس ہے جو کہ عورت کے جسم کی نمائش کے لیے مغرب میں استعمال کیا جاتا ہے۔ "بکینی" تو اس لیے مقبول ہوئی تھی کہ حقوق نسواں کی تحریک نے عورتوں کو اس بات کا یقین دلا دیا تھا کہ وہ مرد کی غلامی سے اسی صورت مکمل طور آزاد ہو سکتی ہیں جبکہ ان کے جسم کے نمائش پر موجود کسی بھی قسم کی قدغن کو ختم کرا دیا جائے۔ اور "برکینی" کے استعمال میں چالیس فی صد غیر مسلم گاہک خواتین کا ایک بڑا مقصد اپنی جلد (skin) کی حفاظت ہے۔

جو لوگ بھی میک اپ انڈسٹری سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں، انہیں اچھی طرح اندازہ ہے کہ رنگ گورا کرنے والی کریم سے لے کر پلاسٹک سرجری تک بلین ڈالر کی اس انڈسٹری کا مقصد وحید عورت کی سکن ہی ہے۔ تو عورت کو سکن بہتر بنانے کے لیے جس طرح پاگل بنایا گیا ہے، اس پاگل پن کے اثرات ہیں کہ مغربی عورتیں یہ نہیں سوچ رہیں کہ "برکینی" پہننے سے ان کی آزادی متاثر ہو رہی ہے۔ اور بین لگانے کے بعد "برکینی" کی سیل دو سو فی صد بڑھ چکی ہے۔

مجھے تو یہ سوچ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ اسلام بھی کیا عجب مذہب ہے کہ اس دین کی برکت سے ان کا فیشن ڈیزائنر بھی ایک آئیڈیالوجی رکھتا ہے۔ یہ اگر فلم انڈسٹری بھی کھڑی کر دیں گے تو وہ بھی اسلامی ڈسکورس میں ہو گی۔ عجیب لوگ ہیں، ان کی الٹی بھی سیدھی ہے۔

غیر مسلموں کے حقوق اور ان سے تعلقات

غیر مسلم دو طرح کے ہیں؛ ایک وہ جو مسلمان ممالک میں اقلیت میں ہیں اور دوسرے وہ جو غیر مسلم ممالک میں اکثریت میں ہیں۔ جو غیر مسلم اقلیت میں ہیں جیسا کہ پاکستان میں ہندو اور عیسائی تو ان کے حقوق ہیں اور اس سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح غیر مسلم سے حسن سلوک کیا جا سکتا ہے اور کاروباری تعلق رکھا جا سکتا ہے، اس میں بھی شک نہیں ہے۔

سنن ابو داؤد میں اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس نے کسی معاہد، وہ غیر مسلم کہ جو کسی معاہدے کے تحت مسلمان ملک میں ہو، پر ظلم کیا، یا اس کے حق میں کمی کی، یا اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالا، یا اس کی کوئی چیز اس سے چھین لی تو قیامت کے دن میں اس معاہد کا وکیل ہوں گا۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ اللہ عز و جل تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔[الممتحنة: 8]

قرآن مجید نے یہود و نصاری کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی ہے، مسلمانوں نے مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ تجارت کی ہے اور انہیں اپنی سروسز فراہم کی ہیں۔ یہودی بچوں نے آپ ﷺ کی خدمت کی، اور آپ نے ان کی عیادت فرمائی۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کے پاس کثرتیت (pluralism) یا کثیر الثقافتی (multicultural) سوسائٹی میں دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ برداشت اور حسن سلوک کے ساتھ زندگی گزارنے کے حوالے سے اسلامی اصول وضوابط یا تعلیمات نہیں ہیں بلکہ مسئلہ کچھ اور ہے۔

مسئلہ مذہبی نہیں ہے بلکہ معاشرتی اور نفسیاتی ہے۔ مغرب مسلمانوں کو برداشت (tolerance) سکھانا چاہتا ہے کہ مسلمان دوسرے مذاہب کے لوگوں کے بارے

میں برداشت پیدا کریں لیکن خود مغرب کا رویہ مسلمانوں کے بارے عدم برداشت کا ہے۔اسلام دوسرے مذاہب کو برداشت تو کجا،ان سے حسن سلوک کا داعی ہے لیکن اس عالمی سیناریو میں کہ جس میں پوری مسلم دنیا جنگ کی آگ میں جھونک دی گئی ہو،اور اس میں مغرب کا کردار بھی واضح ہو، مسلمانوں سے یہ اپیل کرنا کہ وہ برداشت کا رویہ پیدا کریں،انہیں غیر معقول معلوم ہوتا ہے۔

لیکن میں پھر بھی اپنی قوم کے لوگوں سے یہی کہتا ہوں کہ مغرب میں اسلاموفوبیا یعنی اسلام کا بلاوجہ کا خوف اور اسلام سے نفرت بھی ہے لیکن مغرب سارا برا نہیں ہے، ہمیں اس دنیا میں دوسرے مذاہب کے ساتھ مل کر گزارا کرنا ہے۔ہمیں دنیا کے سامنے اپنا امیج خود ڈویلپ کرنا ہے۔اگرچہ دنیا یہی سمجھتی ہے کہ مسلمان صرف نفرت کرنا جانتے ہیں لیکن ہمیں بحثیت قوم یہ پیغام دوسرے مذاہب کے پیروکاروں تک پہنچانا ہو گا کہ اگر مسلمانوں سے ایک دفعہ محبت کا اظہار کروگے تو یہ تمہیں دو مرتبہ پیار دیں گے جیسا کہ ہم نے یہ میسج بہت اچھی طرح پہنچا دیا ہے کہ اگر ہم سے نفرت کروگے تو ہم تم سے دو مرتبہ نفرت کا اظہار کریں گے۔یہ پیغام مغرب میں اسلام کے بارے اس فوبیے کو کم کرنے میں بہت مدد دے گا کہ جس کا یہ نتیجہ ہے کہ ان شاء اللہ! کہنے پر ایک مسلمان نوجوان جہاز سے اتار دیا جاتا ہے۔

پوپ فرانسس اور مسلمان علماء

ایک دوست نے کہا کہ چند ہفتے پہلے پوپ فرانسس نے اپنے مذہبی تہوار کے موقع پر 12 مہاجرین کے نہ صرف پاؤں دھوئے ہیں بلکہ ان کا بوسہ بھی لیا ہے اور ان مہاجرین میں عیسائیوں کے علاوہ تین مسلمان اور ایک ہندو بھی شامل تھے۔دوست کا سوال یہ تھا کہ کیا پوپ کے جیسی عاجزی اور ہمدردی کا اظہار کبھی کسی معاصر نامور مسلمان عالم دین کی طرف سے دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے حق میں دیکھنے کو ملتا ہے؟

جواب: میرے علم میں ہے کہ عیسائیوں میں بہت سے انتہا پسند، مسلمان دشمن گروہ موجود ہیں، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ عیسائیوں نے ماضی میں مسلمانوں کا بہت دفعہ

اجتماعی قتل عام کیا ہے، میں عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں سے بھی واقف ہو، ان میں سے بہت سو کا مسلمانوں سے بغض بھی میرے علم میں ہے۔

لیکن اس سب کچھ کے ہوتے ہوئے پوپ کا اپنے اس عمل کے ذریعے اپنی قوم کے لوگوں کو واضح پیغام دینا کہ یہ سب بھی اسی خدا کے بندے ہیں کہ جس کے ہم ماننے والے ہیں، اور اسی طرح ہمارے لیے قابل احترام ہیں جیسا کہ ہمارے اپنے مذہب کے لوگ ہیں، تو یہ واقعتاً ایک قابل تحسین اور قابل رشک امر ہے۔

اور صحیح بات تو یہ ہے کہ جس کے کہنے میں حرج نہیں ہے کہ مسلمانوں میں اس کا تصور بھی ممکن نہیں ہے کہ پوپ کے مقام اور مرتبے کا کوئی عالم دین کسی عام عیسائی کے پاؤں دھوئے گا۔ تبلیغی جماعت کے رہنما حاجی عبدالوہاب صاحب جیسے شاید دلی طور تیار ہو جائیں لیکن مسلم معاشرے میں اس کے ممکنہ رد عمل کے خوف سے کبھی بھی عملاً ایسا کرنے کی جرات نہ کر سکیں گے۔

ہم تو ابھی عیسائیوں کے ساتھ مل بیٹھ کر کھانا کھا لینے کے جواز اور عدم جواز سے نہیں نکل رہے۔ اور یہ پوپ ہی کا حوصلہ ہے کہ وہ دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے پاؤں دھونے اور ان کا بوسہ لینے تک جا پہنچا ہے۔ اور یہ پوپ اس قابل ہے کہ ایک مسلمان کے پاؤں دھونے کے بدلے میں اس کے پاؤں دو مرتبہ دھوئے جائیں۔

اسی لیے تو اللہ عزوجل نے عیسائیوں کے بارے قرآن مجید ارشاد فرمایا ہے: اور ایمان لانے والوں کے لیے دوستی میں قریب تر اُن لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں یہ اِس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور اُن میں غرور نفس نہیں ہے۔[1]

بلاشبہ پوپ فرانسس بھی انہی عیسائی رہنماؤں کی طرح ہیں کہ جو ہرقل روم، مقوقس مصر اور نجاشی حبشہ کی طرح اسلام کے بارے نرم گوشہ رکھتے تھے اور ان

[1] المائدۃ: 82، ترجمہ از سید مودودی علیہ الرحمہ

عیسائی راہبوں میں سے ہیں کہ جو عاجزی کا اظہار کرنے والے ہیں اور متکبر نہیں ہیں۔

یورپین کونسل برائے فتوی اور تحقیق

یورپ میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے۔ ان مسلمانوں کو وہاں بہت سے سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل کا سامنا رہتا ہے کہ جن کے حل کے اسلامک سینٹرز وجود میں آئے لیکن مسائل اس قدر پیچیدہ تھے کہ 1997ء میں لندن شہر میں جلیل القدر علماء کی ایک کونسل کی بنیاد رکھی گئی کہ جس کی سربراہی شیخ القرضاوی فرمارہے تھے۔ ان کے علاوہ شیخ مصطفی الزرقاء، شیخ عبداللہ بن سلیمان المنیع، شیخ تقی عثمانی، شیخ عبداللہ بن بیہ وغیرہ بھی اس کے ممبران رہے ہیں۔ اس کے ممبر علماء کی تعداد کوئی پچاس کے قریب ہے جن کی اکثریت یورپ میں ہی مقیم ہے اور یہ علماء یورپ کے تقریباً تیس ممالک سے ہیں۔

یہ کونسل یورپ کے مسلمانوں کے لیے ان کے ماحول اور حالات کو سامنے رکھ کر ان کے مسائل میں اجتماعی فتوی جاری کرتی ہے۔ عصر حاضر میں اجتماعی فتوی جاری کرنے کا رحجان بہت بڑھ گیا ہے۔ اور میرا پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی اس عنوان پر ہے یعنی "عصر حاضر میں اجتماعی اجتہاد: ایک تجزیاتی مطالعہ"۔

دنیا کے مختلف خطوں میں علماء اب انفرادی حیثیت کی نسبت اجتماعی کونسل کی صورت میں فتوی جاری کرنے کو زیادہ پسند کرتے ہیں کہ اس میں باہمی مشاورت کے نتیجے میں نہ صرف صحت رائے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں بلکہ تمام مکاتب فکر کے علماء کے اجتہاد کے نتیجے میں ایک ایسی فقہ حاصل ہوتی ہے کہ جسے بلاشبہ "اجتماعی فقہ" کا عنوان دیا جا سکتا ہے۔

میں نے اپنے مقالے کے آخری باب میں اجتماعی فتوی جاری کرنے والے پانچ اداروں اسلامی فقہ اکیڈمی، انڈیا، اسلامی نظریاتی کونسل، پاکستان، مجمع البحوث الاسلامیہ، مصر، ہیئۃ کبار العلماء، سعودی عرب اور یورپین کونسل برائے افتاء و تحقیق، لندن اور ان کے فتوی جاری کرنے کے منہج اور طریق کار پر بحث کی ہے۔

ایک فاضل دوست نے کینیڈا میں مقیم ایک بھائی کے حوالے سے سوال کیا تھا کہ کیا وہ انتہائی مجبوری میں مارگیج پر مکان لے سکتے ہیں؟ تو اس تناظر میں انہیں اس بارے یورپین کونسل برائے فتوی و تحقیق کا فتوی ارسال کیا تھا۔ اسی سے ذہن میں یہ آیا کہ میرے ساتھ یہاں فیس بک پر بہت سے دوست یورپ اور امریکہ سے ایڈ ہیں تو ان کے سامنے بھی اس کونسل کا مختصر تعارف کروادیا جائے۔

دیکھیں، یہ وہ علماء ہیں جو اس ماحول میں رہ کر آپ کے مسئلے کا حل پیش کر رہے ہیں جبکہ ہوتا یہ ہے کہ یورپ کے مسلمان جب یہاں برصغیر پاک وہند اور عرب کے علماء سے اپنے مسائل کے بارے فتوی پوچھتے ہیں تو انہیں تو وہاں کے حالات اور مشکلات کا اندازہ نہیں ہوتا لہذا سخت فتوی جاری کرتے ہیں جو کہ قابل عمل نہیں ہوتا بلکہ وہ فتوی کم اور تقوی زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ علماء کی یہ کونسل نصوص شریعت کے علاوہ مقاصد شریعت کا بہت خیال رکھتی ہے لہذا وہاں کے مسلمانوں کے لیے عموماً قابل عمل اور معتدل رائے ہوتی ہے اگرچہ یہاں کے مسلمان اسے مداہنت خیال کریں گے۔

مثال کے طور پر یورپ میں جو مسلمان آباد ہیں، اب ان میں سے اکثر کو دوران ملازمت نماز کے لیے وقت نہیں دیا جاتا البتہ کھانے وغیرہ کے لیے وقفہ ہو جاتا ہے تو کیا وہاں کے مسلمان اس وقفے میں ظہر اور عصر کو جمع کر سکتے ہیں؟ اب یہاں کے مفتی حضرات کسی اور لہجے میں جواب دیں گے جبکہ وہاں کے علماء جو وہاں کے حالات سے واقف ہیں، ان کا جواب بالکل مختلف ہو گا۔ وہ ایسی صورت میں رخصت کا رستہ نکالنے کی کوشش کریں گے لیکن نصوص سے جوڑتے ہوئے تاکہ لوگ کسی نہ کسی حد تک اپنے دین سے جڑے رہیں۔ اپنے مقالے کا لنک بھی فٹ نوٹ میں شیئر کر رہا ہوں۔

سی پیک معاہدہ: امکانات اور خدشات

سی پیک (China Pakistan Economic Corridorr) پر بہت سے زاویوں سے لکھا جا رہا ہے مثلاً تحقیقی مقالہ جات میں معاشی پہلوؤں سے یہ جائزہ لیا جا رہا ہے کہ سی پیک معاہدہ کی صورت میں پاکستانیوں کو معاشی فوائد کون سے حاصل ہوں

گے اور معاشی نقصانات کیا کیا برداشت کرنے پڑیں گے۔ اس موضوع پر تو ڈاکٹر زاہد صدیق مغل صاحب بہتر روشنی ڈال سکتے ہیں، ہمیں سر دست سی پیک (CPEC) کے مذہبی فوائد اور دینی نقصانات کی بات کرنی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فوائد اور نقصانات متعین نہیں ہیں بلکہ امکانات اور خدشات کے دائرے کی چیزیں ہیں۔

سی پیک معاہدے سے سب سے بڑا فائدہ جو مذہبی طبقات حاصل کر سکتے ہیں، وہ چینیوں کو اسلام کی دعوت دینے کا موقع ہے۔ چینی کوئی اسی طرح سے نظریاتی قوم نہیں ہیں جیسا کہ روسی اور امریکی۔ ان کی اکثریت بہترین ورکرز اور انجینئرز کی سی ہے کہ جن کے پاس زندگی گزارنے کا کوئی نظریہ اور آئیڈیالوجی موجود نہیں ہے۔ ایسے میں اگر انہیں اسلام کی دعوت دی جائے تو بہت امکانات ہیں کہ ان کی بڑی تعداد اسلام میں داخل ہو جائے۔ اب ہمیں دعوت کی اسٹریٹیجی بھی تھوڑی بدلنی ہو گی کہ ہم دعوت میں افراد کے ساتھ قوموں کو بھی ٹارگٹ کریں۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں قبیلے مسلمان ہوتے تھے تو آج قوموں کے اسلام لانے پر محنت کی جائے۔

ایسی قوموں کا انتخاب کیا جائے کہ جن میں اسلام لانے کے امکانات زیادہ ہوں، ان قوموں کے خصائص وعادات پر تحقیقی مقالات شائع کیے جائیں، ان کی زبانوں کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی جائے، اور ان کے سامنے منظم انداز میں حکمت کے ساتھ اسلام کی دعوت پیش کی جائے۔ اب اسی بات کو لے لیں کہ آج اگر چائنیز یہ کہیں کہ ہم مسلمان ہوتے ہیں لیکن اپنا معاشی نظام سوشلزم نہیں چھوڑیں گے تو دنیائے اسلام میں کتنے ایسے حکیم علماء موجود ہیں جو ان کے اتنے پر بھی راضی ہو جائیں، یہ سوچ کر کہ کلمہ پڑھنے والے اور نہ پڑھنے والے برابر نہیں ہیں، یا یہ سوچ کر کہ ان کی آئندہ نسلیں اسلام میں پوری داخل ہو جائیں گی۔

یہ تو ایک امکان کی بات ہو گی اور جہاں تک خدشات کی بات ہے تو ایک بڑا خدشہ یہ ہے کہ چائنہ کے آنے سے اس خطے میں لادینیت اور بے حیائی کو فروغ ملے گا کہ ان کی زندگی کا مقصد بس دنیا اور دولت ہے۔ میں نے کسی سے سنا ہے کہ چائنہ نے اپنے لوگوں

کے لیے یہاں انویسٹمنٹ کے حوالے سے جو ڈاکومنٹ تیار کر رکھا ہے، اس میں انرجی، انفرااسٹرکچر وغیرہ سب پر دس دس صفحات ہیں لیکن ٹوورازم پر چھتیس صفحات ہیں۔ اور دنیا میں ٹوورازم کہیں بھی شراب اور عورت کے بغیر کامیاب انویسٹمنٹ شمار نہیں ہوتا۔ پھر مساج سینٹرز کھلیں گے اور رد عمل میں لال مسجدیں وجود میں آئیں گے۔ تو ایسے میں ہمارے مذہبی طبقات اور جماعتوں کو پہلے ہی سے بیٹھ کر اس معاہدے کے امکانات اور خدشات کی روشنی میں کوئی حکمت عملی ترتیب دے لینی چاہیے۔

ایک سوال تو یہ ہے کہ ایک مسلمان اگر سور کھائے اور شراب پیے اور ایک غیر مسلم اگر سور کھائے اور شراب پیے تو آخرت میں اس کا کوئی فرق نکلے گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ محض کلمہ پڑھ لینے کی بنیاد پر بھی آخرت میں جہنم میں دائمی اور عارضی جانے کے اعتبار سے فرق پڑے گا۔ اور دوسرا یہ کہ میری رائے یہی ہے کہ اسے اسلام قبول کرنے دیں لیکن ساتھ میں بتلادیں کہ یہ چیزیں اسلام میں ممنوع ہیں، اللہ عزوجل اس کی عبادت اور صدقے کی برکت سے اس سے یہ چیزیں بھی چھڑوادیں گے۔ تیسری بات یہ ہے کہ یہ تو اور بھی بڑی بے وقوفی کی بات ہے کہ وہ کہہ رہا ہے کہ میں کفر کا گناہ چھوڑنا چاہتا ہوں اور ہم کہیں کہ نہیں سارے گناہ اکھٹے چھوڑو ورنہ کفر کا بھی کرتے ہی رہو۔ جو جتنا گناہ چھوڑ رہا ہے، اس سے اتنا قبول کرلیں اور باقی کے چھوڑنے کے لیے اسے ترغیب دیتے رہیں۔

اسلامی بینکاری

بعض دوستوں نے اسلامی بینکاری کے حوالے سے راقم کی رائے جاننی چاہی لیکن اچھی طرح جانتا ہوں کہ اگر حق میں رائے دوں گا تو خوب شیئر ہو گی، یہ جانے بغیر کہ میں کون اور کیا ہوں، اور اگر مخالفت میں رائے ہو گی تو میرے مبلغ علم، معاشیات اور دین، دونوں میں، کو زیر بحث لایا جائے گا، مجھے مفتی حضرات کی طرف رجوع کا مشورہ دیا جائے گا وغیرہ وغیرہ، اور میں یہ سب کچھ بھگت چکا ہوں۔

مجھے یہ کہنے میں عار نہیں ہے کہ اسلامی بینکاری کے مویدین کی اکثریت کا رویہ اس

موضوع پر بات کرتے ہوئے کسی سیاسی پارٹی کے جیالوں کا سا ہوتا ہے۔ میں کامسائٹس یونیورسٹی کے سنٹر آف اسلامک فنانس سے متعلق ہوں، کہ جس کے تحت منعقدہ ایک انٹرنیشنل فورم پر ایک ذمہ دار مفتی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ اسلامی بینکاری کا مسئلہ مجمع علیہ، یعنی جس پر اجماع ہو چکا ہو، ہے حالانکہ خود میرے پاس اس وقت کوئی 17 کتابیں ایسی تھیں، جو پاکستان کے جدید علماء اور ماہرین معاشیات کی طرف سے اسلامی بینکاری کے خلاف میں لکھی ہوئی تھیں۔

کائبور (KIBOR) سے لے کر فریکشنل ریزور بینکنگ تک بیسیوں اعتراضات ایسے ہیں کہ جو اسلامی بینکاری کے صد فی صد حلال ہونے کے آدھے آدھے صفحے کے اخباری اشتہارات کا منہ چڑا رہے ہیں لیکن مفتی صاحب اس کے حلال ہونے کو اجماعی مسئلہ بتلا رہے ہیں۔ میری رائے میں کہ میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھ بھی چکا ہوں، اگر ایک لفظ میں اسلامی بینکاری کی حقیقت کو بیان کریں تو وہ لفظ "کتاب الحیل" ہے یعنی یہ حیلوں کے باب کی ایک عملی صورت ہے۔ اور حیلے سے مراد یہ ہے کہ شریعت سے چالاکی کہ جس میں ظاہر شریعت پر عمل ہو رہا ہوتا ہے جبکہ مقاصد فوت ہو رہے ہوتے ہیں۔ ظاہر پر انگلی رکھنے کی جگہ نہ ہو لیکن دل جیسے رسیاں تڑوا کر بھاگ رہا ہو۔

فقہی اور شرعی اعتراضات سے قطع نظر کہ وہ فیس بک کے صارفین کی سمجھ سے بالاتر ہیں، صرف اتنی عرض عرصہ دراز سے اسلامی بینکاری میں موجود مفتی حضرات سے بھی کر رہا ہوں کہ یہ کیا تماشا ہے کہ ایک ہی بینک میں ایک ہی چھت کے نیچے ایک کاؤنٹر پر اسلامی بینکاری ہو رہی ہے، اور دوسرے پر روایتی۔ یعنی آپ ایچ۔بی۔ایل میں جائیں، اگر آپ نے روایتی طریقے سے گاڑی لینی ہے، تو اس کاؤنٹر پر کار لیزنگ کا فارم مکمل کریں، اور اسلامی طریقے سے لینی ہے، تو اس کاؤنٹر پر اجارہ واقتناع کا فارم مکمل کریں۔ اور شریعہ ایڈوائزر جس طرح اسلامی بینکوں کے پاس ہیں، روایتی بینکوں نے بھی بھرتی کر لیے ہیں کہ مقصد صرف یہ ہے کہ کسٹمر ادھر نہ جائے۔

اور اس سے بڑھ کر تو تماشا اب لگے گا کہ اسٹیٹ بینک نے یہ آڈر جاری کر دیا ہے کہ

فلاں تاریخ تک تمام کے تمام بینک اسلامی بن جاؤ اور رومن امپائر کی طرح، جو ایک رات میں مشرک سے عیسائی بن گئی تھی، ایک صبح جب ہم بیدار ہوں گے تو تمام بینک اسلامی بینک بن چکے ہوں گے کیونکہ اسلامی بننے میں کوئی مشکل تو موجود نہیں کہ اسلامی بینکاری میں کوئی نیا نظام دینے کی بجائے روایتی بینکوں ہی کی تمام پراڈکٹس اور اسٹرکچر کو ہم نے فقہی اصطلاحات سے اسلامائز کر لیا ہے تو اب انہیں کیا وحشت ہونی ہے؟

لوگ مسئلے کا حل پوچھتے ہیں تو مسئلے کا حل اول تو اسلامی بینکوں کے پاس ہے ہی نہیں کہ اسٹیٹ بینک کی طرف سے بینکوں کے لیے جو رولز اینڈ ریگولیشنز طے ہیں، ان کے مطابق بینک بزنس نہیں کر سکتا، بینک فنانسنگ کا ادارہ ہے۔ اور در حقیقت روایتی بینک ہو یا اسلامی بینک، دونوں فنانسنگ ہی کر رہے ہیں، بزنس تو صرف کاغذوں میں ہو رہا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ مضاربہ کمپنیاں بنائیں کہ جو قانون کے تحت رجسٹرڈ ہوں کہ جنہیں بزنس کی قانوناً اجازت ہے۔ قانوناً اور عملاً بینک کا بزنس کا ادارہ بننا اتنا ہی مشکل ہے کہ جتنا عورت کا مرد بننا۔ مریض زیادہ ہو جائیں تو اس کا حل یہ نہیں ہے کہ تھانے میں بیڈ لگا دیں بلکہ یہ ہے کہ نئے ہسپتال بنائیں۔ ہر ادارہ ایک مقصد کے تحت بنتا ہے، وہ عموماً اس سے باہر نہیں نکل سکتا۔ بینک کا ادارہ فنانسنگ کے مقصد کے لیے بنا ہے، نہ کہ کاروبار کے لیے۔

چلیں اور نہ سہی، اسلامی بینکوں نے عوام ہی کی کوئی خدمت کی ہوتی، کہ وہ بھی تو نظر نہیں آتی۔ آپ ابھی روایتی اور اسلامی بینکوں کی ویب سائیٹس پر جا کر گاڑی نکلوانے کے لیے ان کے دیے ہوئے کیلکولیٹر کو استعمال کرتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کریں کہ بیس لاکھ کی گاڑی پر آپ کو روایتی بینک میں انٹرسٹ اور اسلامی بینک میں کرایہ کتنا پڑے گا، تو یہ ایک ہی جتنا ہے۔ بلکہ بعض اسلامی بینک تو روایتی بینکوں سے بھی زیادہ چارج کر رہے ہیں۔ مفتی صاحب کہتے ہیں، بھائی، یہ حلال ہے حلال، حلال کھانا ہے تو قربانی تو دینی پڑے گی۔

اسلامی بینکاری میں ایک پہلو البتہ مثبت ہے کہ میری قوم کے لوگوں کو یعنی

مولویوں کو باعزت ملازمت مل رہی ہے۔ واللہ! میں دل سے اس پر خوش ہوں، یہ کوئی طنز نہیں ہے، اگر اس پہلو سے بات کرو کہ اتنے مولوی بے روزگار ہو جائیں گے لہذا اتنی مخالفت نہ کرو تو اس اعتبار سے میں اس کے حق میں ہوں لیکن اسلامی بینکاری کے نظام میں کچھ ایسی تبدیلیاں تجویز کروں گا کہ جس سے کم از کم یہ ملازمت "صد فی صد" حلال ہو جائے۔

بینک گاڑی اور گھر رینٹ پر نہ دے بلکہ قسطوں پر دے، ان سے جا کر پوچھیں کہ قسطوں کے جواز کا تمام علماء فتوی دے رہے ہیں، آپ گاڑی قسطوں پر دینے کی بجائے، کان ادھر سے کیوں پکڑ رہے ہیں، کہ کرائے (rent) پر دے رہے ہیں۔ پھر ولیں گے تو معلوم ہو گا کہ اندر کی کہانی کیا ہے؟ اسی طرح اسلامی بینک کو چاہیے کہ کار اجارہ کے لیے باقاعدہ شوروم کھولے کہ جس میں گاڑیاں کھڑی ہوں کہ کاروبار کی شکل تو بنے۔ اور ہاؤس فنانسنگ کے لیے جگہیں خرید کر کالونیاں بنائے جیسا کہ بحریہ ٹاون وغیرہ جیسی ہاؤسنگ سوسائٹیوں نے کیا ہے۔ یہ کیا بزنس ہے کہ مجھے گاڑی اور گھر کی ضرورت محسوس ہوئی تو بینک نے مجھے ہی وکیل بنا کر، مجھ ہی سے گاڑی اور گھر خریدوا کر، مجھے ہی کسٹمر بنا کر، کاغذوں میں بیچ دیا۔ یہ فنانسنگ ہے میرے بھائی، بزنس نہیں، آپ دھکے سے اس کو بزنس بنا رہے ہیں۔

سودی بینکاری کے خاتمے کا آسان طریق کار

کسی نے کہا کہ سودی بینکاری نظام کے خاتمے کا کیا طریقہ کار ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ نظام نہ تو اسلامی بینکاری کے فروغ سے ختم ہونے والا ہے اور نہ ہی کسی آئینی جدوجہد سے جیسا کہ تاریخ گواہ ہے۔

اس کے خاتمے بلکہ اسے دھڑام سے گرانے کا آسان ترین طریق کار یہ ہے کہ سودی بینکوں کی کل رقم کے تیس فی صد کے مالکان کو یہ تیس فی صد رقم بینک سے ایک آدھ ہفتہ کے لیے ہی سہی ایک ساتھ نکلوانے پر تیار کر لیا جائے۔ جس دن یہ اپنی رقم لینے بینک کے پاس پہنچیں گے، اسی دن سارا بینکنگ سسٹم کولیپس ہو جائے گا۔

فریکشنل ریزرو بینکنگ، اس نظام کی سب سے بڑی کمزوری ہے لیکن سودی نظام کے مخالفین کی اس طرف توجہ نہیں گئی۔ اس نظام کے تحت بینک کے پاس اگر کل ایک کروڑ کی رقم موجود ہے تو وہ اس ایک کروڑ پر چھ کروڑ کا سودی قرضہ جاری کر سکتا ہے لہذا اگر تمام لوگ بینک کے پاس اپنے حصے کی رقم لینے جائیں تو اس کے پاس سب کے حصے کا پیسہ موجود ہی نہیں ہو گا کہ پانچ کروڑ تو جعلی پیسہ ہے جو بینک نے کاغذی کاروائی کے ذریعے بنایا ہے۔

کریڈٹ کارڈ کی تبلیغ

کل سلک بینک (silk bank) کے ایک مبلغ کریڈٹ کارڈ کی تبلیغ کے سلسلہ میں آفس میں تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ میں سلک بینک سے ہوں، کیا آپ کریڈٹ کارڈ بنوائیں گے؟ میں کام کر رہا تھا لہذا کام کرتے کرتے جواب دیا کہ نہیں کیونکہ ہر قسم کے بینک کے ایسے مبلغین یونیورسٹیوں میں خصوصی گشت پر رہتے ہیں لہذا انہیں ناں کرنا ایک معمول کی بات تھی۔

لیکن وہ صاحب صرف ناں پر راضی نہ ہوئے اور کیوں کے پیچھے پڑ گئے۔ میں نے کہا کہ یہ سودی معاملہ ہے، اس لیے میں کریڈٹ کارڈ بنوانا نہیں چاہتا۔ وہ اب بھی راضی نہ ہوئے اور کہنے لگے کہ میرے ساتھ ڈائیلاگ کریں اور ثابت کریں کہ یہ سود ہے۔ میں نے کہا کہ میں تو ایسے بندے سے شرعی مسئلے میں ڈائیلاگ نہیں کروں گا کہ جس کا میدان شریعت نہیں بینکنگ ہے۔ آپ نے اگر کوئی بات چیت کرنی ہے تو کوئی عالم دین لے آئیں کہ جسے میری بات کم از کم سمجھ آ جائے اور مجھے اس کی بات سمجھ آ جائے کہ شریعت کی ایک زبان ہے جیسے ریاضی اور بائیالوجی کی ایک زبان ہے جو انہی کو سمجھ آتی ہے جو اس فن کے ماہر ہیں۔

وہ کہنے لگے کہ میں نے حافظ سعید صاحب، امیر جماعۃ الدعوۃ، کا کریڈٹ کارڈ بنوایا ہے، وہ میرے پڑوسی ہیں، اب آپ کو اور کیا دلیل چاہیے۔ میں نے کہا کہ بھئی، حافظ سعید صاحب سے ایک پرچی پر لکھوا کر لے آئیں کہ کریڈٹ کارڈ بنوانا حلال ہے تو میں

آپ کو دس بندوں کے کریڈٹ کارڈ بنوا دوں گا۔ خیر، انہوں نے کہا کہ میں یہ تو لکھوا کر لا سکتا ہوں کہ انہوں نے مجھ سے بنوایا ہے لیکن یہ نہیں لکھوا کر لا سکتا کہ کریڈٹ کارڈ حلال ہے۔ خیر، اگر وہ صاحب لے بھی آتے تو میں بھی الدعوۃ کے کارکنان کی منتیں ہی کرتا کہ حضرت حافظ صاحب اسے حلال کہہ رہے ہیں، کوئی دس پندرہ تو بنوا ہی لو۔

اس نے کہا کہ آپ نے کریڈٹ کارڈ کے ذریعے جو رقم ادھار لی ہے، وہ وقت میں ہی مثلاً چالیس دن میں ہی ادا کر دیں تو کوئی سود نہیں پڑتا۔ میں نے کہا کہ یہ سودی معاہدہ تو ہے ناں کہ ہر کریڈٹ کارڈ لینے والا یہ معاہدہ کرتا ہے کہ اگر وقت پر ادائیگی نہ کی تو اتنا سود ادا کرے گا۔ تو سودی معاہدہ تو سب نے کر لیا۔ اب ذرا عملی صورت حال کو دیکھو تو کیا ایسا نہیں ہے کہ نوے سے پچانوے فی صد لوگ کریڈٹ کارڈ سے ادھار لی گئی رقم وقت پر ادا نہیں کر پاتے اور سود میں چلے جاتے ہیں تو اس نے کہا کہ ایسا ہی ہے۔

میں نے کہا کہ آپ کو بھی معلوم ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ہر انسان اپنی خواہشات کو پورا کرنا چاہتا ہے، اور خواہشات لامحدود ہیں، خواہشات کے پورا ہونے میں ایک بڑی رکاوٹ پیسے کا نہ ہونا ہے، وہ آپ نے اس کو ادھار دے دیا ہے۔ اب وہ اپنی استطاعت سے بڑھ کر خریداری کرے گا اور سود میں پھنس جائے گا۔ آپ تو لوگوں کو کھائی میں دھکیل رہے ہیں۔ اس نے کہا ہم تو لوگوں کی بنیادی ضرورتیں پوری کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یونیورسٹی میں جس فیکلٹی کے پاس آپ چکر لگا رہے ہیں، ان کی بنیادی تنخواہ الحمد للہ! اتنی ہے کہ بنیادی ضرورتیں پوری ہیں، آپ تو انہیں خواہشات پوری کرنے کے لیے قرض لینے کی تبلیغ کر رہے ہیں اور خواہشات ان کی لامحدود ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بتلائیں کہ کیا شریعت نے قرض لینے کو پسند کیا ہے؟ رسول اللہ ﷺ تو اس کی جنازہ نہیں پڑھاتے تھے جو مقروض فوت ہو جاتا اور آپ لوگوں کو مقروض ہو کر مرنے کی تبلیغ کر رہے ہیں۔

میں نے کہا آج کوئی بھائی اپنے سگے بھائی کو قرضہ نہیں دیتا بلکہ پیسہ چھپاتا پھرتا ہے کہ کہیں مانگ ہی نہ لے تو بینک اتنا مہربان کب سے ہو گیا ہے کہ لوگوں کی منتیں کرتا

پھرے کہ بھئی قرضہ لے لو، قرضہ لے لو، قرضہ لے لو۔ یہ ساری گیم آپ کے علم میں ہے کہ آپ لوگ کس طرح لوگوں کو سودی شکنجوں میں جکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کو اتنا ہی لوگوں کی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کی فکر ہے تو مالی، گارڈ اور صفائی کرنے والے کو کریڈٹ کارڈ کیوں نہیں پیش کرتے، وہ آگے سے خاموش۔ میں نے کہا میں ذاتی طور ایسے فیکلٹی ممبرز کو جانتا ہوں کہ جنہوں نے آپ جیسے مبلغین کے جھانسے میں آکر کریڈٹ کارڈ بنوالیا اور اب انہیں گالیاں دیتے ہیں کہ ہمیں بتایا ہی نہیں، اس میں تو فلاں چارجز بھی تھے اور فلاں بھی، اور یہ اس سود کے علاوہ تھے جو انہوں نے ادا کرنا تھا۔ لیکن کیا کریں، ہمارے ہاں تعلیمی اداروں میں ہاں مولانا طارق جمیل صاحب کی تبلیغ پر تو پابندی لگا دی گئی ہے لیکن ان ڈاکوؤں کو تبلیغ سے کوئی نہیں روکتا جو عین قانون کے مطابق آپ کا پیسہ لوٹ کر لے جاتے ہیں۔

بٹ کوائن (Bitcoin)

بہت سے دوست بٹ کوائن کے بارے پوچھتے ہیں کہ جائز ہے یا نہیں۔ بٹ کوائن دراصل انٹرنیٹ پر استعمال ہونے والی ایک ڈیجیٹل کرنسی ہے کہ جس کا آغاز 2009ء میں کیا گیا ہے۔ عام کرنسی اور اس میں دو بڑے فرق ہیں کہ عام کرنسی کہ جسے ہم پیپر کرنسی کہتے ہیں، وہ کم از کم کاغذ کی صورت میں اپنا جسمانی وجود رکھتی ہے لیکن بٹ کوائن کا خارج میں کوئی وجود نہیں، صرف سافٹ صورت میں ہے۔ دوسرا یہ کہ عام کرنسی کے پیچھے حکومت یا بینک کی قوت ہوتی ہے لیکن بٹ کوائن ایک آزاد کرنسی ہے کہ جس کے پیچھے کوئی حکومت یا بینک نہیں ہے۔ صارف اپنی مرضی سے یہ کرنسی اپنے کمپیوٹر سے تخلیق کر سکتا ہے۔

شروع شروع میں بارٹر سسٹم تھا یعنی لوگ ایک جنس کی چیز کے بدلے دوسری جنس کی چیز حاصل کر لیتے تھے۔ مثلاً میرے پاس گندم ہے اور زید کے پاس چاول۔ اب مجھے چاول چاہییں اور زید کو گندم تو ہم دونوں آپ میں کسی نسبت اور تناسب سے گندم اور چاول کا تبادلہ کر لیں گے، اسے بارٹر سسٹم کہتے تھے۔ اس کے بعد ایک زمانہ آیا جبکہ

سونا اور چاندی کرنسی کے طور استعمال ہونے لگے۔ اوائل اسلام میں یہی کرنسی رائج تھی۔ دینار سونے کا ہوتا تھا جبکہ درہم چاندی کا۔ دینار رومیوں کا معروف سکہ تھا جبکہ درہم فارسیوں کا۔ خیر القرون میں دونوں رائج رہے ہیں۔

اس کے بعد کاغذی کرنسی کا دور آیا، یہ کیسے شروع ہوئی، اس کی ایک لمبی کہانی ہے۔ لیکن بہر حال آج ہم اسی کاغذی کرنسی کے دور میں سانس لے رہے ہیں کہ جس میں ہزار روپے کے نوٹ پر لکھا ہوتا ہے کہ حامل ہذا کو ہزار روپیہ عند الطلب ادا کیا جائے گا یعنی جو آپ کے پاس ہے، وہ ہزار روپیہ نہیں ہے، اس کی رسید ہے۔ ہزار روپیہ کچھ اور ہے، اگر آپ مانگیں گے تو آپ کو حکومت یا بینک، جو بھی اس کاغذی کرنسی کو جاری کرنے والا ادارہ ہے، ہزار روپیہ ادا کر دے گا۔ اور اس ہزار روپے سے ان کی مراد ہزار روپے مالیت کا سونا یا چاندی ہے جو کہ اب ان کے پاس نہیں ہے کیونکہ انہوں نے نوٹ اتنے چھاپ دیے ہیں کہ جتنا ان کے پاس سونا ہے نہ چاندی۔

بس کاغذی کرنسی کی حقیقت، کاغذ کے ٹکڑے سے زیادہ نہیں ہے۔ اور اسے کرنسی بنانے والی شیء ایک ہی ہے، وہ حکومت کا ڈنڈا ہے۔ جس دن یہ ڈنڈا ختم ہو گیا، اس دن یہ کاغذ کے ٹکڑے ہیں، جو ردی کے بھاؤ سے بک سکتے ہیں۔ کاغذی کرنسی کے دور میں یہ سوال بہت انٹرسٹنگ ہے کہ بٹ کوائن جائز ہے یا نہیں؟ اس میں غور طلب بات یہ ہے کہ کرنسی کو کیا چیز کرنسی بناتی ہے؟ یہ چیزیں کوئی چار پانچ ہیں مثلاً یہ کہ کرنسی وہ ہوتی ہے کہ جس میں فوری لین دین کرنے کی صلاحیت موجود ہو اور یہ پیپر کرنسی کی نسبت بٹ کوائن میں زیادہ موجود ہے۔

اس طرح کرنسی وہ ہوتی ہے کہ جس پر لوگوں کا اعتماد ہو یعنی لوگ اسے قبول کرتے ہوں تو یہ ابھی بٹ کوائن میں کافی کم ہے جبکہ پیپر کرنسی میں بہت زیادہ ہے۔ اسی طرح کرنسی قابل تقسیم ہونی چاہیے جیسے پیپر کرنسی پانچ کے سکے سے لے کر پانچ ہزار تک ہوتی ہے۔ اور کرنسی ایسی ہو کہ جس میں نقل وحمل میں آسانی رہے جیسا کہ پیپر کرنسی یا اے۔ ٹی۔ ایم کارڈ میں تو اور آسان ہے۔ اسلام میں کرنسی کی خصوصیات میں سے جس

چیز پر زیادہ زور ہے، وہ یہ ہے کہ وہ کوئی شیء ہونی چاہیے، ہوائی نہ ہو۔ کاغذی کرنسی تو ہوا میں کھڑی ہے ہی، بٹ کوائن تو بالکل ہی خلاء میں ہے۔ لیکن شاید اس دنیا کی تقدیر یہی ہے کہ ہم پیپر کرنسی سے ڈیجیٹل کرنسی کی طرف جائیں گے کیونکہ اس کے مالک نے اسے ایک خاص وقت میں تباہ کرنے کا ارادہ کیا ہوا ہے اور وہ پورا ہو کر رہنے والا ہے۔

امام مسجد کا سرکار سے تنخواہ لینا

دوست کا سوال ہے کہ امام مسجد کا سرکار سے تنخواہ لینا کیسا ہے؟ میں نے کہا کہ بالکل لینی چاہیے، اس میں کیا حرج ہے؟ اس نے کہا کہ حرج یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اگر وہ سرکار سے تنخواہ لے گا تو حق بات بیان نہیں کرے گا۔

میں نے کہا یہ تو بہت ہی لا یعنی سا اعتراض ہے۔ اگر سرکار سے تنخواہ نہیں لے گا تو مسجد کی انتظامیہ سے لے گا، مسجد کی کمیٹی سے لے گا، مہتمم اور مدیر سے لے گا، تو جس سے تنخواہ لے گا تو اس کے بارے میں حق بات بیان کرے گا؟

اور میں خود ایک سرکاری ملازم ہوں اور تمہیں پورے یقین سے بتلا رہا ہوں کہ سرکار سے تنخواہ لے کر اس کے بارے حق بات کرنے کی جتنی گنجائش اس ملک میں موجود ہے، اتنی کسی مدرسہ کے مہتمم سے یا کسی تحریک کے مرکز سے تنخواہ لے کر اس کے بارے حق بات کرنے کی نہیں ہے۔ یہاں لوگ تنخواہ نون لیگ کی حکومت سے لیتے ہیں اور ووٹ پی۔ ٹی۔ آئی کو دیتے ہیں، بلکہ نون لیگ کو گالیاں بھی دیتے ہیں تو کون پوچھتا ہے، کوئی نہیں۔

پھر آپ یا تو یہ فتوی دیں ناں کہ سرکار کی کوئی ملازمت جائز نہیں ہے کہ حق بات کرنے میں رکاوٹ ہے، چاہے وہ اسکول ٹیچنگ کی ہو، یا کالج میں لیکچرر شپ کی، یا یونیورسٹی میں تدریس کی، یا کسی سرکاری مسجد مثلاً آرمی، نیوی اور ایئر فورس وغیرہ میں خطابت کی، یا اسلامی نظریاتی کونسل کی ممبر شپ کی وغیرہ وغیرہ

جب ایک اسکول ٹیچر، کالج کا لیکچرر اور یونیورسٹی کا پروفیسر سرکار سے تنخواہ لے کر ان کے بارے حق بات کر سکتا ہے تو مولوی کے لیے کیا مانع ہو گا؟ باقی امام حرم سے اس

کی مثال دینا بھی بے وقوفی ہے کیونکہ چند ایک عہدے ایسے نمایاں ہوتے ہیں کہ جن کے لیے سرکار کے بارے بیان دینا آسان نہیں ہوتا جیسا کہ پاکستان میں بادشاہی مسجد کی خطابت کا عہدہ۔ اب اس بڑے عہدے کے بارے آپ بے شک بحث کر لیں کہ یہ سرکار سے نہیں لینا چاہیے کہ حق گوئی میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

کیونکہ جب آپ ایسا بڑا عہدہ قبول کر لیں گے تو اب سرکار کے پریشر میں براہ راست ہوں گے اور حق گوئی میں رکاوٹ کے بہت حالات بھی ہیں اور مواقع بھی لیکن عام اسکول ٹیچر یا امام مسجد جو ہزاروں یا لاکھوں کی تعداد میں ہیں، ان کے لیے سرکار اتنی فارغ نہیں بیٹھی ہوئی کہ جاسوسی کرے گی اور دباؤ ڈالے گی۔ ہاں، اگر آپ کا ایشو یہ ہے کہ جب تنخواہ پی۔ٹی۔آئی کی حکومت دے گی تو ائمہ مساجد پی۔ٹی۔آئی سے متاثر ہو جائیں گے کہ جن پر آپ کی سیاست قائم ہے، تو پھر بات درست ہے اور آپ کا اختلاف سمجھ میں بھی آتا ہے لیکن اسے مذہبی ایشو نہ بنائیں، سیاسی ہی رہنے دیں۔ پی۔ٹی۔آئی بھی تنخواہیں لگا کر سیاست کرنا چاہتی ہے اور آپ اس کا انکار کر کے سیاست کر رہے ہیں۔

کچھ خدا کا خوف کریں اور سیاسی اختلاف میں غریب ائمہ کی روٹی روزی پر لات مت ماریں۔ یعنی وہی مولوی اسکول ٹیچر بھرتی ہو کر سرکار سے تنخواہ لے لے تو حرج نہیں ہے لیکن امام مسجد ہو کر لے تو یہودی سازش ہے، کمال کرتے ہو بھائی صاحب!

❁❁❁❁❁❁❁

باب دہم

تعلیم اور تحقیق

اس باب میں تعلیم اور تحقیق کے بارے بنیادی سوالات پر بحث کی گئی ہے۔

مدرس اور معلم(Teacher and Mentor)

مدرس وہ ہے جو کلاس میں گھنٹے پورے کر کے اور لیکچر جھاڑ کر آ جائے اور معلم وہ ہے جس کی ہر کلاس بچوں میں کسی مثبت تبدیلی کی بنیاد بن جائے۔ مدرس وہ ہے جو معلومات منتقل کر دے اور معلم وہ ہے جو تربیت کر کے دکھا دے۔ مدرس کو بچے صرف اس سمسٹر میں سلام کرتے ہیں کہ جس میں اس کے پاس پڑھ رہے ہوں اور معلم کو سارا سال سلام کرتے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔ ایک دوست نے کہا کہ اسٹوڈنٹ اور طالب علم میں بھی فرق ہوتا ہے۔۔

گوگل: علوم اسلامیہ اور سوشل سائنسز میں تحقیق کا بنیادی مصدر

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے

اُس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

تعلیم کا المیہ: غیر قانونی ڈگریاں

نیوز ویوز (لاہور): صوبہ پنجاب کی 24 پرائیویٹ یونیورسٹیز میں سے 18 یونیورسٹیوں میں غیر قانونی و غیر منظور شدہ ڈگری پروگرامز کا انکشاف ہوا جن میں ہزاروں طلباء وطالبات زیر تعلیم ہیں۔ ان اٹھارہ میں سے 15 یونیورسٹیز صرف لاہور شہر میں موجود ہیں۔

ان یونیورسٹیز میں بی۔ایس، ایم۔ایس، ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کی غیر قانونی ڈگریاں کرائی جا رہی ہیں جس پر محکمہ ہائر ایجوکیشن پنجاب نے ہر یونیورسٹی کو الگ الگ وارننگ لیٹرز جاری کیے ہیں۔ ان یونیورسٹیز میں غیر قانونی و غیر منظور شدہ ڈگریوں کی تفصیلات یوں ہے:

یونیورسٹی آف سنٹرل پنجاب لاہور: اس یونیورسٹی میں فیکلٹی آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز میں بی۔ایس سائیکالوجی، ایم۔ایس سائیکالوجی اور پی۔ایچ۔ڈی سائیکالوجی کی ڈگری غیر منظور شدہ ہے۔ فیکلٹی آف سائنسز میں بی۔ایس زوالوجی، بی۔ایس باٹنی،

بی۔ایس کیمسٹری، بی۔ایس ریاضی اور بی۔ایس فزکس، بی۔ایس شماریات کی ڈگریاں بھی غیر منظور شدہ اور غیر قانونی ہیں۔ اسی طرح یو۔سی۔پی کی فیکلٹی آف لائف سائنسز کا آف بائیو کیمسٹری، مائیکرو بائیولوجی اینڈ بائیو ٹیکنالوجی کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے۔

بیکن ہاؤس نیشنل یونیورسٹی لاہور: اس یونیورسٹی کے بی۔بی۔اے پروگرام کو غیر قانونی اور غیر منظور شدہ قرار دیا گیا ہے اور اس ڈگری میں داخلوں سے روک دیا گیا ہے۔

لاہور گیریژن یونیورسٹی: اس ادارے کے بائیالوجی، زوالوجی، جغرافیہ اور شماریات کے شعبہ جات غیر قانونی ہیں۔ فیکلٹی آف سوشل سائنسز کے ماس کیمونیکیشن، اسلامک اسٹڈیز، پولیٹیکل سائنس، انٹر نیشنل ریلیشن، ایجوکیشن، ہوم اکنامکس، مینجمنٹ سائنسز، کامرس اینڈ اکنامکس کے ڈیپارٹمنٹس کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے۔ ڈیپارٹمنٹ آف اُردو، کمپیوٹر سائنس، بی۔ایس اینوائرنمنٹل سائنسز، مائیکروبائیالوجی، باٹنی، زوالوجی، بائیو کیمسٹری اور بی۔ایس بائیو ٹیکنالوجی کی ڈگریاں غیر منظور شدہ اور غیر قانونی ہیں۔ لاہور گیریژن یونیورسٹی میں ایم۔فل مائیکروبائیولوجی اور زوالوجی کی ڈگریاں بھی ایچ ای سی سے منظور شدہ نہیں ہیں۔

یونیورسٹی آف ساؤتھ ایشیاء لاہور: اس یونیورسٹی میں بیچلرز آف سول انجینئرنگ، الیکٹریکل انجینئرنگ، ڈیپارٹمنٹ آف فزیو تھراپی، ڈیپارٹمنٹ آف فوڈ اینڈ نیوٹریشن سائنسز، ڈیپارٹمنٹ آف بائیو ٹیکنالوجی، مائیکروبائیولوجی، اینوائرنمنٹل سائنسز، مالیکیولر بائیالوجی، بائیو انفارمیٹکس، بائیو کیمسٹری اینڈ مائیکرو بائیالوجی کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے۔ یونیورسٹی آف ساؤتھ ایشیاء کے ڈیپارٹمنٹ آف ہیومن ریسورس، ڈیپارٹمنٹ آف میوزیکالوجی، لینگویج، لینگویج اینڈ لٹریچر، انگلش، اُردو اور ڈیپارٹمنٹ ا آف فیشن اینڈ ڈیزائن کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے۔ ڈیپارٹمنٹ آف فارمیسی میں کیے جانے والے داخلوں کو بھی غیر قانونی قرار دیا گیا ہے۔

یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور: اس یونیورسٹی میں بی ایس آرکیٹیکچر، بی۔ایس سٹی اینڈ ریجنل پلاننگ، ڈاکٹر آف فزیو تھراپی، ڈاکٹر آف نیوٹریشن سائنسز،

بی۔ایس میڈیکل لیبارٹری سائنسز، بی۔ایس میڈیکل امیجنگ، بی۔ایس فوڈ ٹیکنالوجی، بی۔ایس ڈیری ٹیکنالوجی، بی۔ایس ایگریکلچر مینجمنٹ، بی۔ایس اسلامک بینکنگ اینڈ فنانس کی ڈگریاں بھی غیر منظور شدہ ہیں۔

نور انٹرنیشنل یونیورسٹی لاہور: اس یونیورسٹی میں بی۔ایس اپلائیڈ سائیکالوجی، بی۔ایس اینیمل سائنسز، بی۔ایس سپیچ اینڈ لینگوئج تھراپی، بی۔ایس میڈیکل لیب ٹیکنالوجی، ڈاکٹر آف فزیکل تھراپی، بی۔ایس بائیو ٹیکنالوجی اور بی۔ایس اکنامکس کی ڈگریاں غیر قانونی اور غیر منظور شدہ ہیں۔

منہاج یونیورسٹی لاہور: اس یونیورسٹی میں ڈیپارٹمنٹ آف کیمیکل انجینئرنگ، فیکلٹی آف لاء، ڈیپارٹمنٹ آف سافٹ ویئر انجینئرنگ، ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک اکنامکس، بینکنگ اینڈ فنانس، ڈیپارٹمنٹ آف باٹنی ، زوالوجی، میڈیکل لیبارٹری ٹیکنالوجی، فوڈ اینڈ نیوٹریشن، انٹرنیشنل ریلیشن، ماس کیمونیکیشن، ایجوکیشن، لائبریری اینڈ کریمنل جسٹس سسٹم، بیہوریل سائنسز، پیس اینڈ کاؤنٹر ٹیررازم، ریلیجن اینڈ فلاسفی، سوشیالوجی اینڈ اپلائیڈ سائیکالوجی کے شعبہ جات کو غیر قانونی اور غیر منظور شدہ قرار دیا گیا ہے۔

لاہور لیڈز یونیورسٹی: اس ادارے میں میں بی۔ایس سافٹ ویئر انجینئرنگ، بی۔ایس اسلامک فنانس، بی۔ایس ریاضی، ایم۔ایس۔سی ریاضی، ایم۔فل ریاضی، بی۔ایس سپورٹس سائنسز اینڈ فزیکل ایجوکیشن، ایم۔اے سپورٹس اینڈ فزیکل ایجوکیشن، ڈیپارٹمنٹ آف لاء، فارم۔ڈی اور تمام ٹیکنالوجیز سے متعلقہ ڈگریوں کو غیر قانونی و غیر منظور شدہ قرار دیا گیا ہے۔

یونیورسٹی آف لاہور: اس یونیورسٹی میں ڈیپارٹمنٹ آف سول انجینئرنگ، میکنیکل انجینئرنگ، کمپیوٹر انجینئرنگ، لاء کالج، ڈیپارٹمنٹ آف پروفیشنل ٹیکنالوجیز، سپورٹس سائنسز، نرسنگ، ریڈیولوجیکل سائنسز اینڈ میڈیکل امیجنگ ٹیکنالوجی، یونیورسٹی انسٹیٹیوٹ آف فزیکل تھراپی، انسٹیٹیوٹ آف پبلک ہیلتھ، ڈائیٹ اینڈ نیوٹریشنل

سائنسز، ڈاکٹر آف میڈیکل لیبارٹری سائنسز، ایم۔بی۔بی۔ایس، ڈیپارٹمنٹ آف آرکیٹیکچر اینڈ سکول آف کریٹو آرٹس کی ڈگریاں غیر قانونی و غیر منظور شدہ ہیں۔ لاہور یونیورسٹی کے الحاق شدہ کالجز لاہور سکول آف مینجمنٹ، لاہور سکول آف ایوی ایشن،لاہور سکول آف اکاؤنٹنگ اینڈ فنانس کو بھی غیر قانونی قرار دیا گیا ہے۔

انسٹیٹیوٹ آف سدرن پنجاب ملتان: اس ادارے میں ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک سٹڈیز اینڈ اُردو،ڈیپارٹمنٹ آف انجینئر نگ اینڈ ٹیکنالوجی، کمپیوٹر سائنس اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی، سول انجینئر نگ، الیکٹریکل انجینئر نگ اور میکنیکل انجینئر نگ کی ڈگریاں غیر قانونی و غیر منظور شدہ ہیں۔انٹر نیشنل ریلیشن کی ڈگری کو بھی غیر قانونی قرار دیا گیا ہے۔

نیشنل کالج آف بزنس ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس لاہور: اس ادارے میں سائیکالوجی، سوشیالوجی،اسلامک اسٹڈیز،تاریخ، پولیٹیکل سائنس،ماس کیمونیکیشن، جغرافیہ،لاء، انگریزی، ٹیکنالوجی اینڈ ایجوکیشن اور ایم۔ایس سی اینوائرنمنٹل مینجمنٹ کی ڈگریاں غیر قانونی ہیں۔

ہائی ٹیک یونیورسٹی ٹیکسلا: اس ادارے میں بی۔ایس سی میڈیکل الٹرا ساؤنڈ ٹیکنالوجی، بی۔ایس وائرولوجی، بی۔ایس مالیکیولر پتھالوجی، پوسٹ پروفیشنل ڈاکٹر آف آپٹومیٹری، بیچلر آف آرکیٹیکچر، بیچلر آف فائن آرٹس، بیچلر آف فیشن ڈیزائن، بیلچر آف ٹیکسٹائل ڈیزائن، بیلچر آف انٹریئر ڈیزائن، بیچلر آف پراڈکٹ ڈیزائن اور بی۔ایس انگلش کی ڈگریاں غیر قانونی ہیں۔

اکنامکس،اکاؤنٹنگ اینڈ فنانس، انگلش،اُردو، اسلامک سٹڈیز، پاکستان سٹڈیز، لاء، ایوی ایشن مینجمنٹ، ٹیکنالوجی پروگرامز، میڈیا سٹڈیز اینڈ بائیولوجیکل سائنسز پروگرامز کی ڈگریاں غیر قانونی وغیر منظور شدہ ہیں۔

ہجویری یونیورسٹی لاہور: اس یونیورسٹی میں ایم۔ایس سی میڈیا اسٹڈیز، بی۔ایس انجینئر نگ، الیکٹرونکس اینڈ ٹیلی کام، بی۔ایس ٹیکنالوجی، فارمیسی کی ڈگریاں غیر منظور شدہ ہیں۔

یونیورسٹی آف واہ کینٹ: اس ادارے میں سول، کیمیکل، ایم۔ایس انجینئرنگ پروگرامز، اکاؤنٹنگ اینڈ فنانس اور ٹیکنالوجیز کی تمام ڈگریاں غیر منظور شدہ ہیں۔

یونیورسٹی آف فیصل آباد: اس ادارے میں بی۔ایس انٹریئر ڈیزائن، بی۔ایس انجینئرنگ ٹیکنالوجی، ڈیپارٹمنٹ آف فارمیسی، فیکلٹی آف میڈیسن اینڈ الائیڈ ہیلتھ سائنسز، ڈاکٹر آف فزیکل تھراپی، ڈاکٹر آف ہیلتھ اینڈ سپورٹس مینجمنٹ، ڈاکٹر آف فرانزک سائنسز، نرسنگ، ریڈیالوجی، پتھالوجی، کیمونٹی میڈیسن اور ڈینٹل سائنسز کی ڈگریاں غیر قانونی و غیر منظور شدہ ہیں۔

گلوبل انسٹی ٹیوٹ لاہور: اس ادارے میں ڈیپارٹمنٹ آف ٹیکنالوجی مینجمنٹ، بیچلر ان سول ٹیکنالوجی مینجمنٹ، الیکٹریکل ٹیکنالوجی مینجمنٹ، میکینیکل ٹیکنالوجی مینجمنٹ الیکٹرونکس ٹیکنالوجی مینجمنٹ، بی۔ٹیک، بی۔ایس۔ آئی۔ٹی، کمپیوٹر سائنس، ایم۔آئی۔ٹی کی ڈگریاں غیر قانونی و غیر منظور شدہ ہیں۔

مذکورہ یونیورسٹیز نے اپنے ڈگری پروگرامز شروع کرنے سے پہلے ہائر ایجوکیشن کمیشن، پاکستان میڈیکل اینڈ ڈینٹل کونسل، پاکستان انجینئرنگ کونسل اور چانسلر سے منظوری ہی نہیں لے رکھی۔

محکمہ ہائر ایجوکیشن پنجاب نے ہدایات جاری کی ہیں کہ مذکورہ یونیورسٹیز 26 ستمبر تک اپنے غیر منظور شدہ ڈگری پروگرامز سے متعلق پنجاب ہائر ایجوکیشن کمیشن سے رابطہ کریں اور پنجاب ہائر ایجوکیشن کمیشن کی جانب سے جن خامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے اُنہیں بھی یونیورسٹیز دور کریں۔ طلباء کو ہدایات جاری کی گی ہیں کہ وہ مذکورہ ڈگریوں میں داخلے لینے سے گریز کریں۔

یونیورسٹی گریجویٹس کے لیے دینی تعلیم

تبلیغی جماعتوں، اسلامی تحریکوں اور دیگر دعوتی سرگرمیوں کی وجہ سے یونیورسٹی گریجویٹس کی ایک بڑی تعداد نہ صرف دین کی طرف راغب ہو رہی ہے بلکہ دین کا سنجیدہ طالب علم بننے کی خواہش بھی رکھتی ہے۔ یہ بہت ہی خوش آئند رجحان ہے کہ دین

ودنیا کے امتزاج کا ایک فطری اور آسان ترین حل یہی ہے کہ دنیا کی تعلیم کے بعد دین کی تعلیم حاصل کرلی جائے یا دین کی تعلیم کے بعد دنیا کی تعلیم حاصل کرلی جائے۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ دونوں طبقے لاشعوری طور شیطان کے وسوسے میں ہیں۔ مدرسے کا فارغ التحصیل ساری زندگی روایتی دینی تعلیم میں کھپا کر اب جدید علوم میں امام (leader) بننے کی خواہش رکھتا ہے اور یونیورسٹی گریجویٹ دنیا کی تعلیم میں زندگی کھپا کر دین کا امام بننا چاہتا ہے۔ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اس میں غلط کیا ہے؟ اس میں غلط یہ ہے کہ یونیورسٹی گریجویٹ میں جدید علوم کا امام بننے کی خواہش ہونی چاہیے اور مدرسہ کے فارغ التحصیل میں قدیم کا۔

فیلڈ کو تبدیل کرنا بالکل بھی مناسب نہیں ہے، اس سے آپ کا سابقہ علم بالکل بے کار ہو جاتا ہے جبکہ ہمیں یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ سنن ابن ماجہ میں روایت ہے: «اللَّهُمَّ انْفَعْنِي بِمَا عَلَّمْتَنِي، وَعَلِّمْنِي مَا يَنْفَعُنِي، وَزِدْنِي عِلْمًا» ترجمہ: اے اللہ! مجھے نفع بخش علم دے دے، اور جو علم آپ نے مجھے دے دیا ہے تو اسے میرے لیے نفع بخش بنا دیں اور میرے علم میں اضافہ فرما دیں۔ تو ایک تو یونیورسٹی گریجویٹ کو دین کی تعلیم ضرور حاصل کرنی چاہیے لیکن اس طرح نہیں کہ اپنا میدان تبدیل کر لے بلکہ اپنے اصل میدان میں دین کی خدمت کے مواقع تلاش کرے۔

یہ عجب نہیں ہے کہ مدرسے میں پڑھانے والا استاذ اس بات کی خواہش رکھتا ہے کہ یونیورسٹی میں جائے تاکہ دنیاداروں کو صحیح معنی میں دیندار بنا سکنے میں اپنا موثر کردار ادا کر سکے اور یونیورسٹی میں پڑھانے والا پروفیسر اس کا طلبگار ہے کہ اس مخرب ایمان ماحول سے نکلے اور مدرسے میں جا کر قرآن وحدیث کی تعلیم وتعلم میں دل کا سکون تلاش کرے اور دینداروں کو دین دار بنانے کے لیے کچھ کر سکے۔ بس انسان ایسا ہی ہے کہ جو اس کے پاس ہے، اس کی نعمت کا احساس نہیں ہے اور جو نہیں ہے، اس کا خواہش مند ہے۔

ایک یونیورسٹی گریجویٹ کو آٹھ سالہ درس نظامی یا مفتی کورس کی بجائے ایک سالہ یا دو سالہ یا زیادہ سے زیادہ تین سالہ دینی کورس کر لینا چاہیے کہ جس سے اس کی دینی

بنیادیں پختہ ہو جائیں اور پھر اپنی ہی فیلڈ میں دین کی خدمت کے مواقع نہ صرف تلاش کرے بلکہ پیدا کر کے دکھا دے۔ اس کے لیے ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی قرآن اکیڈمی کا ایک سالہ اور دو سالہ کورس بہت مفید ہے اور اس طبقے کے لیے شاید ہی اس سے مفید کوئی کورس میرے علم میں ہو۔

ایک تو یہ ڈیزائن ہی جدید طبقے کے لیے کیا گیا ہے، دوسرا اس میں انداز تدریس، نصاب تعلیم وغیرہ میں بھی جدید کا استعمال کافی ہے کہ یونیورسٹی گریجویٹ کو بالکل محسوس نہیں ہوتا کہ وہ یونیورسٹی کے ماحول سے نکل کر مدرسہ کے ماحول میں آگیا ہے بلکہ اسے یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ اسی ماحول اور ذہنی سطح کے ساتھ دین کی تعلیم حاصل کر رہا ہے کہ جس کے ساتھ اس نے دنیا کی تعلیم حاصل کی تھی۔ تو یونیورسٹی گریجویٹ کے لیے مشورہ یہ ہے کہ سائنس کے امام بنیں کہ آج دنیا کی امامت انہی کی ہے جو سائنس میں امام ہیں۔ دین کے امام پہلے ہی بہت ہیں، ابھی یہاں نئے اماموں کی اتنی ضرورت نہیں ہے۔ اور سائنس کا امام بننے سے یہ دین کے امام بھی آپ کو اپنا امام بنالیں گے کہ میدان بالکل خالی ہے جیسا کہ ڈاکٹر عبد القدیر خان صاحب کو ہی دیکھ لیں کہ تمام دینی طبقات ان کے قدر دان ہیں۔

دینی مدارس کے طلباء کے لیے ایم فل/پی ایچ ڈی

دوست کا سوال ہے کہ میں دینی مدرسہ سے فارغ التحصیل ہوں، میرے پاس وفاق کی شہادۃ العالمیۃ ہے، میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنا چاہتا ہوں، اس بارے مشورہ درکار ہے کہ کیسے کرنا چاہیے۔

دینی مدارس کے طلباء کا ایم فل اور پی ایچ ڈی کی طرف آنا بہت ہی خوش آئند ہے اور اس بات کی بہت ضرورت ہے کہ وہ اسکولز، کالجز اور یونیورسٹیوں میں آئیں۔ اگرچہ ان میں سے کچھ اسکول، کالج اور یونیوسٹی کے ماحول میں آکر اسی رنگ میں رنگے بھی جاتے ہیں لیکن اس سے گھبرانا نہیں چاہیے کہ ایسے طلباء کی تعداد دس فی صد سے زائد نہیں ہے۔ اور دینی مدارس کے طلباء کی اکثریت جدید تعلیمی اداروں میں دینی اقدار کے تحفظ

اور فروغ کے لیے بہت اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ میں تو ایسے طلباء کی بہت حوصلہ افزائی کرتا ہوں لیکن اس وصیت کے ساتھ کہ اپنے دینی سیٹ اپ اور روایت سے جڑیں رہیں۔ ورنہ اصلاح کرنے آئیں گے اور خود کی اصلاح کرواجائیں گے۔

دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلباء جو ایم فل یا پی ایچ ڈی کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے مشورہ یہ ہے کہ وہ ایف-اے اور بی-اے کر کے اس لائن میں آئیں۔ اگرچہ ایچ۔ ای۔ سی دینی مدارس کے طلباء کو ان کی وفاق کی اسناد کے معادلے میں ایکوئیلینس جاری کر دیتی ہے لیکن یہ ایکوئیلینس محض اعلی تعلیم کے حصول کے لیے تو کار آمد ہے لیکن ملازمت اور جاب میں نہیں، یعنی قانونی طور تو ملازمت اور جاب کے لیے بھی اس کی وہی حیثیت ہے جو اعلی تعلیم کے لیے ہے لیکن عملاً ایسی اسناد والوں کو جاب اور ملازمت میں ترجیح نہیں دی جاتی ہے، اسے تعصب کہہ لیں یا جو بھی کہہ لیں، بہر حال ایٹی چیوڈ یہی ہے۔ اگر آپ کا مقصد صرف ایم فل یا پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنا ہے تو ایکوئیلینس کی بنیاد پر کسی بھی یونیورسٹی میں ایم فل یا پی ایچ ڈی میں داخلہ لے لیں کہ یونیورسٹیوں کا مقصد کاروبار ہے نہ کہ تعلیم، وہ فیسیں لے کر ڈگری دینا چاہتے ہیں یہ دیکھے بغیر کہ آپ کو اس ڈگری کا کوئی فائدہ ہوگا یا نہیں۔ کچھ یونیورسٹیاں ایکوئیلینس کی بنیاد پر داخلہ دیتی ہیں اور کچھ نہیں دیتی ہیں۔

لیکن اگر آپ کا مقصد ڈگری کے حصول کے بعد اسکول، کالج اور یونیوسٹی میں جاب کرنا ہے تو پھر ایف۔اے اور بی۔اے کر لیں کہ مارکیٹ میں مقابلہ بہت زیادہ ہے۔ جب آپ جاب کے لیے اپلائی کریں گے تو انٹرویو پینل میں بیٹھے لوگ ایف۔اے اور بی۔اے کی ڈگریاں رکھنے والوں کو ترجیح دیتے ہیں، چاہے قانونی طور آپ کی ڈگری کی حیثیت ان کے برابر ہی کی تسلیم کی گئی ہو۔ اور یہ صرف دنیاداروں میں نہیں ہے بلکہ دینداروں میں بھی ہے۔ اور کوشش کریں کہ سرکاری یونیورسٹی سے ڈگری لیں کہ اکثر پرائیوٹ یونیورسٹیوں کی ڈگریاں مصدقہ (approved) نہیں ہوتیں، تھوک میں داخلے دے دیتے ہیں، اور ان کے پاس فیکلٹی اتنی نہیں ہوتی کہ وہ اتنے بچوں کو مقالے

کرواسکے لہذا بعد میں پریشانی ہوتی ہے اور اسٹوڈنٹس رل جاتے ہیں۔

میں نے جب 2003ء میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات میں پی ایچ ڈی کے ایڈمشن کے لیے ٹیسٹ دیا تھا تو تقریباً 150 لوگوں میں سے 16 نے ٹیسٹ پاس کیا تھا اور سیٹیں 15 تھیں، اب ایک بندہ انھوں نے فارغ کرنا تھا اور وہ مجھے ہی کیا گیا کہ میرے پاس وفاق کی سند تھی اگرچہ اس کے لیے پنجاب یونیورسٹی ہی کا ایکوئیلینس تھا، اور میں میرٹ میں بھی کافی اوپر تھا اور میرے پاس پنجاب یونیورسٹی کی ایم۔اے کی سند بھی تھی لیکن عربی میں تھی، اور پری انجینیئر نگ کے بعد میری گریجویشن بھی ڈبل میتھس کے ساتھ پنجاب یونیوسٹی ہی سے تھی، بس اسلامیات میں ایکوئیلینس سے کام چلانے کی کوشش کی لیکن مجھے یہ بتلا کر انکار کیا گیا کہ آپ کے پاس ایم-اے اسلامیات کی ڈگری نہیں، ایکوئیلینس ہے۔

بعد میں شیخ زاید اسلامک سنٹر میں پی-ایچ-ڈی کے ایڈمشن کے لیے ٹیسٹ ہوا تو 5 سیٹیں تھیں لیکن تقریباً 150 میں سے ہی 3 افراد نے صرف ٹیسٹ پاس کیا جن میں سے ایک میں بھی تھا، دوسرے میرے برادران لاء تھے، تیسرے میرے استاذ تھے۔ یہ واقعہ اس لیے بیان کر دیا کہ اس سے آپ اندازہ لگا لیں کہ آپ جتنے قابل بھی ہو جائیں، یا میرٹ پر آ جائیں، محض مدرسہ کی ڈگری آپ کے کیریئر میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔ اس لیے اگرچہ رستہ تھوڑا لمبا ہے لیکن سیدھا رستہ اختیار کریں اور ایف۔اے، بی۔اے کے ساتھ اس میدان میں آئیں۔ اور اس سے آپ کا ایکسپوئیر بھی بڑھے گا اور لوگوں کو اعتراض کا موقع بھی نہ ملے گا، ورنہ تو یہاں انتشار لگا ہوتا ہے کہ انہیں بس انگلی رکھنے کا موقع ملنا چاہیے کہ آپ کو پیچھے کر دیں۔

بی-ایس اسلامک اسٹڈیز کا پروگرام اور ایچ۔ای۔سی

کچھ دن پہلے اپنی یونیورسٹی میں بی-ایس اسلامک اسٹڈیز کا پروگرام آفر کرنے کے لیے اس کی اسکیم آف اسٹڈیز پر کام کر رہا تھا۔ سوچا کہ پہلے ان لوگوں کی اسکیم آف اسٹڈیز دیکھ لی جائے جو کہ بی-ایس اسلامک اسٹڈیز کا پروگرام چلا رہے ہیں تو سب سے پہلے ایچ-

ای- سی (HEC) کا نام ذہن میں آیا کہ ان کی اسلامک اسٹڈیز کی ایکاڈیمک کمیٹی نے بی- ایس اسلامک اسٹڈیز کا جو نصاب ترتیب دیا ہے، دیکھنا چاہیے۔

پھر یورپ کی یونیورسٹیوں میں بی۔ایس اسلامک اسٹڈیز کے لیے پڑھانے جانے والے کورسز دیکھنے کا موقع ملا تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بی۔ایس اسلامک اسٹڈیز پر اگر سب سے زیادہ کسی نے محنت کی ہے، تو وہ میگ گل (McGill) یونیورسٹی، کینیڈا کی فیکلٹی نے کی ہے۔ ہمارے ہاں تو پنجاب یونیورسٹی بلکہ اکثر سرکاری یونیورسٹیوں نے اپنی آفیشیل ویب سائیٹس پر ایچ-ای- سی کی ذیلی کمیٹی ہی کے تیار کردہ نصاب کو کاپی پیسٹ کیا ہوا ہے۔

چار سالہ بی۔ایس اسلامک اسٹڈیز کے اس نصاب کو کوئی لگ بھگ بیس کے قریب اسلامک اسٹڈیز کے پی ایچ ڈی ڈاکٹرز اور پروفیسرز نے تیار کیا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس پر کتنی محنت ہوئی ہو گی اور آخری مرتبہ اسے 2015ء میں ریوائز کیا گیا ہے۔ اس وقت ہمیں اس نصاب کا تفصیلی جائزہ نہیں لینا ہے بلکہ اس چار سالہ نصاب میں ایک کورس اسلامیات لازمی کا بھی ہے کہ جس کی اگرچہ کوئی تک نہیں بنتی تھی لیکن چلیں، چار سال اسلامیات پڑھنے والوں کو بھی اسلامیات لازمی پڑھانی ہے، یہ ہمارے بڑوں کا فیصلہ ہے لہذا ہم کیا اعتراض کر سکتے ہیں۔

اس اسلامیات لازمی کے نصاب میں کچھ متعین سورتوں کی آیات ہیں اور کچھ احادیث ہیں۔ میں اس تحریر کی وساطت سے نصاب ترتیب دینے والی کمیٹی کی کچھ اصلاح کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے اس نصاب میں سورۃ "اَحزاب" (ahzab) کو "اِحزاب" (ihzab) لکھا ہے۔ سورۃ "مؤمِنون" (muminoon) کو "مؤمَنون" (mumanoon) لکھا ہے، "اَحکام" (ahkam) کو "اِحکام" (ihkam) لکھا ہے وغیرہ وغیرہ۔ نصاب کی یہ غلطیاں واضح کرتی ہیں کہ یہ نصاب تیار کرنے والا بنیادی عربی گرامر سے ناواقف ہے کہ "جمع" کے صیغے کو "مصدر" سمجھ لیا اور "اسم فاعل" کو "اسم مفعول" بنا دیا۔

مجھے معلوم ہے کہ ایچ۔ای۔سی کی اس کمیٹی کے بیس اسلامیات کے مایہ ناز ڈاکٹروں کی ٹیم میں سے کسی نے بھی یہ نصاب تیار نہیں کیا، بلکہ تیار تو کجا، اسے دیکھا بھی نہ ہو گا، بلکہ شاید کسی ایم فل کے اسٹوڈنٹ سے کہ جس کی انگریزی اچھی تھی، لیکن اسے عربی کی بالکل شدبد نہ تھی، سے یہ نصاب تیار کروالیا گیااور پھر اسے ریوائز کرنے کی زحمت بھی نہ کی گئی اور عرصہ دراز سے ایسی فاش غلطیوں کے ساتھ ہی ایچ۔ای۔سی کی ویب سائیٹ کی زینت بنا ہوا ہے۔

میں یہ بھی نہیں کہتا کہ یہ کمیٹی "نااہل" ہے اور نہ ہی میں یہ کہتا ہوں کہ یہ "کام چور" ہے بلکہ میں تو ایک ریسرچر ہونے کے ناطے صرف یہ سوال کر رہا ہوں کہ بی۔ایس اسلامک اسٹڈیز کے اس نصاب تعلیم میں ان "فاش غلطیوں" کے باقی رہ جانے کی توجیہہ کیا ہے؟ ہماری کتابیں تو آپ بغیر کوئی وجہ بتلائے "زی۔کیٹیگری" میں بھی تسلیم نہیں کرتے جبکہ وہ عوام اور خواص میں مقبول ہو چکی ہیں تو ہم بھی آپ کے کام کو "زی۔کیٹیگری" میں بھی شمار نہیں کر رہے لیکن ساتھ میں وجہ بتلا رہے ہیں۔ یہ فی سبیل اللہ پیئر ایویلیوایشن (peer evaluation) ہے۔اور شانت رہیے، ابھی ایچ۔ای۔سی ریکاگنائزڈ ریسرچ جرنلز میں آپ کے پبلش ہونے والے ریسرچ آرٹیکلز کی ایویلیوایشن کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

مدارس کے طلباء اپنی صلاحیت کیسے بڑھائیں؟

دوست کا سوال ہے کہ مدارس اور علوم اسلامیہ کے طلباء اپنی علمی، فکری اور تحریری صلاحیتوں کو کیسے بڑھا سکتے ہیں؟

جواب: جہاں تک علمی صلاحیتوں کا تعلق ہے تو واضح رہے کہ علم چند معلومات کے حافظے کا نام نہیں ہے بلکہ اصل علم تو وہ ہے کہ انسان جس کی تطبیق (application) کرنا جانتا ہو۔اصول حدیث اور اصول فقہ کے متون یاد کر لینا کوئی کمال نہیں ہے، کمال یہ ہے کہ آپ کو اصول حدیث اور اصول فقہ کی تطبیق آ جائے اور وہ بھی عصر حاضر کے مسائل میں۔اصول فقہ کو پڑھنے کے لیے شاید دو سال کی محنت درکار ہے لیکن اس کی

تطبیق سیکھنے کے لیے دس سال کی محنت چاہیے۔

اس علم کا کوئی فائدہ نہیں ہے کہ جس کی آپ تطبیق نہ کر سکیں۔اور تطبیق انسان اس وقت سیکھتا ہے جبکہ وہ کسی علم کو پڑھا لے۔ کوئی علم صرف پڑھ لینے سے نہیں آجاتا بلکہ پڑھانے سے آتا ہے۔تو علم پڑھنے کے بعد پڑھانے کی کوشش کریں، چاہے ایک طالب علم ہی مل جائے۔اور دوسری بات یہ ہے کہ پڑھانے سے بھی آپ کو علوم کی تطبیق اس وقت ہی اچھی آئے گی جبکہ آپ کے شاگرد اچھے ہوں گے۔ یہ اچھے شاگرد ہی ہوتے ہیں جو اچھے استاذ بناتے ہیں۔ یہ اچھے شاگرد ہی ہوتے ہیں جو اچھے سوالات کے ذریعے استاذ کے ذہن کو کھولتے رہتے ہیں۔

اور جہاں تک فکری صلاحیت کا تعلق ہے تو اس وقت دین کے طلباء اور علماء بلکہ ان کے بہترین کا بھی مزاج، تحقیقی ہی بن چکا ہے اور فکری مزاج کی نشوونما کی نہ تو کوئی خواہش ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت کا احساس ہے حالانکہ عالمی اور امت کی سطح پر کام کرنے کے لیے فکری مزاج کا ہونا زیادہ ضروری ہے۔ فکری مزاج تخلیق کار ہوتا ہے جبکہ تحقیقی مزاج محنتی ہوتا ہے۔ ہمارے طلباء کو فکری چیزیں پڑھنے کی زیادہ ضرورت ہے مثلاً ماہنامہ الشریعہ، ماہنامہ محدث، ماہنامہ البرہان اور سہ ماہی حکمت قرآن وغیرہ کو اپنے مطالعہ میں رکھیں کہ یہ بہترین فکری مجلات ہیں۔ ہم کسی تحریر کی قدر وقیمت کا تعین اس کے حوالوں کی تعداد سے ماپنے کے عادی ہو چکے ہیں اور یہ بہت غلط رجحان ہے۔اور خاص طور علوم اسلامیہ میں ایم فل اور پی ایچ ڈی اور ایچ ای سی کے تحقیقی مجلات نے اس رجحان کو مصنوعی حد تک بڑھا دیا ہے۔

پھر اپنی فکر کو پروان چڑھانے کے لیے بہت ضروری ہے کہ آپ معاصر سوشل سائنسز اور ہیومینیٹیز کے علوم کا مطالعہ رکھتے ہوں۔ فلسفہ، سائیکالوجی، سوشیالوجی، اکنامکس، لسانیات اور ادب کا تو ضرور مطالعہ کریں۔ اب ادب کے مطالعے کا میرے نزدیک یہ مطلب نہیں ہے کہ غالب ومیر کی شاعری پڑھنا شروع کر دیں۔ آپ نے ادیب اور شاعر نہیں بننا لہذا آپ کے لیے یہ اتنا مفید نہیں ہے۔ آپ ادب میں نقد کو

پڑھیں۔اس سے دینی نقد میں آپ کا معیار بہت بلند ہو جائے گا۔ مثلاً آپ مجموعہ حسن عسکری کو پڑھیں، یقین مانیے، اگر آپ نے اس کو ہضم کر لیا تو چیزوں کو دیکھنے کے زاویے بڑھ جائیں گے۔ پھر پڑھیں چاہے کم، لیکن غور زیادہ کریں۔ لفظ پر غور کریں، اس کی گہرائی میں جائیں۔ جملے پر غور کریں، اس کی وسعتوں میں گھومیں۔ اور اسے سیکھیں، یہ آپ کو حسن عسکری صاحب بہت اچھی طرح سکھا سکتے ہیں، اگر آپ ان کا مجموعہ پڑھ لیں۔ فلسفہ کا مطالعہ کرنا ہے تو "سوفی کی دنیا" پڑھ لیں۔ یہ نہیں کہ جو فلسفے کی کتاب ہاتھ لگی، پڑھنا شروع کر دیں، اس طرح کچھ سمجھ نہیں آئے گی، الٹا بوریت ہو گی۔

اور تحریری صلاحیت تو لکھنے سے بہتر ہوتی ہے۔ فیس بک پر لکھیں، روزانہ لکھیں، جتنا زیادہ لکھیں گے، اتنی صلاحیت بہتر ہو گی لیکن صرف لکھنے کا کام نہ کریں بلکہ ہر بار لکھنے سے پہلے اس موضوع پر کچھ پڑھ لیں اور اس پر غور کر لیں۔ فیس بک کا لکھا، آپ ڈیلیٹ کر سکتے ہیں، ایڈٹ کر سکتے ہیں۔ اور یہ سب کیا کریں، اس سے تحریر میں بہتری آتی ہے۔ مبتدی کے لیے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ آگے جانا چاہتے ہیں۔ جو روزانہ سوچتے رہتے ہیں، اس کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش کرنا شروع کر دیں۔ لکھنا ایک فن (art) ہے اور فن سیکھنے سے آتا ہے۔ اس فن میں معاصر علوم کا استعمال کریں مثلاً لکھتے وقت مخاطبین کی سائیکالوجی کا لحاظ رکھیں کہ ایک داعی کے لیے بہت ضروری ہے کہ لوگوں کی نفسیات کا دھیان کرے وغیرہ۔

ایجوٹینمنٹ: بھئی، آپ کی سوسائٹی تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے!

دو دن پہلے یونیورسٹی میں چند فیکلٹی ممبرز میں اس بات پر بحث ہو رہی تھی کہ ہماری نوجوان نسل جس طرح موبائل فون اور سوشل میڈیا کی ایڈکشن میں مبتلا ہے تو اس کا علاج کیا ہے؟ ایک پروفیسر صاحب نے کہا کہ اس ایڈکشن کی وجہ سے بچوں کے رویے (attitudes) تباہ ہو چکے ہیں، وہ ماں باپ کی بات کیا مانیں گے، انہیں تو اس ایکٹوٹی کے دوران نہ اپنے ارد گرد کی خبر ہوتی ہے، نہ گھر کی اور نہ ہی اپنی۔ لڑکیاں سیلفی ایڈکشن میں مبتلا ہیں تو لڑکے گیم ایڈکشن میں۔ اور دونوں نوٹیفکیشن دیکھنے کی ایڈکشن میں بھی۔

ایک رائے یہ سامنے آئی کہ بچوں کو صرف دو گھنٹے کے لیے موبائل، ٹیب، لیپ ٹاپ وغیرہ پکڑایا جائے، لیکن اس کا جب تجربہ کیا گیا تو بچوں کی حالت ایسے ہو گئی جیسے کسی نشئی کو نشہ نہ ملنے کی صورت میں ہوتی ہے۔ ایک دوسرے پروفیسر صاحب نے کہا کہ گیم ایڈکشن اس قدر عام ہو چکی ہے کہ میرے دس سال کے بیٹے نے اپنے دوستوں سے ٹائم سیٹ کر رکھا ہوتا ہے کہ اتنے بجے آن لائن ہو جانا اور وہ گروپس بنا کر کھیلتے ہیں اور جب کھیلتے ہیں تو دنیا اور مافیہا سے غافل ہو جاتے ہیں۔ یونیورسٹی میں جہاں ہر طالب علم کے ہاتھ میں کتاب نظر آنی چاہیے تھی، وہاں اب اسمارٹ فون نظر آتا ہے اور شاید اسٹوڈیو میں اتنی تصویریں نہ کھینچی جاتی ہوں جتنی کہ تعلیمی اداروں میں۔

میرا دو سال کا بچہ جس انہماک سے موبائل کی اسکرین دیکھتا ہے، اس سے وحشت ہونے لگتی ہے کہ اس انہماک اور توجہ سے تو ہمارا ساٹھ سالہ بوڑھا سجدہ نہیں کرتا۔ ہم سب کو مسئلے کا علم ہے لیکن اس کا حل کیا ہے؟ یہ سوال بھی سامنے آئے گا کہ مغرب (west) نے اس کا کیا حل پیش کیا؟ تو معلوم ہو گا کہ مغرب تو تباہی کا شکار ہو چکا اور ہم اہل مشرق تباہی کے دھانے پر کھڑے ہیں۔

مغرب کا سارا تعلیمی نظام اسٹوڈنٹ کے گرد گھومتا ہے کہ وہ کسٹمر ہے، بس اسے مطمئن ہونا چاہیے کیونکہ تعلیم کاروبار بن چکی لہذا اب ایجوکیشن کی بجائے ایجوٹینمنٹ کا تصور آرہا ہے۔ استاذ سے مطالبہ یہ ہے کہ وہ طالب علم کو خوش اور مطمئن رکھے، چاہے اسے کلاس میں جوکر (joker) بننا پڑ جائے۔ پس اگر یہ ایجوکیشن سے بھاگتے ہیں تو ایجوٹینمنٹ کی طرف لے آؤ کہ انہیں ایجوکیشنل گیمز دکھا کر کچھ نہ کچھ سکھا دو اور ایجوکیشن کو ان کے لیے اینٹرٹینمنٹ بنا دو۔

مغرب میں جو سوچ بچار رکھنے والے لوگ تھے تو انہوں نے بچے اسکولوں سے اٹھوا لیے اور ہوم اسکولنگ کا تصور بہت تیزی سے عام ہو گیا۔ ہمارے ہاں مشرق میں ابھی اتنا برا حال نہیں ہے کہ کہیں نہ کہیں تعلیمی نظام استاذ کے گرد بھی گھوم رہا ہے لہذا ہم اپنے تعلیمی اداروں میں اب بھی بہتری لا سکتے ہیں۔ مسئلہ یہی ہے کہ ہمارے نوجوان کے پاس

انرجی بہت ہے لیکن کرنے کو کام نہیں ہے یا کام ہے تو اس کام میں اس کا دل نہیں لگتا۔ ایک یونیورسٹی گریجویٹ کے پاس کیا یہ تھوڑا کام ہے کہ وہ اپنی ڈگری اچھے طریقے سے حاصل کر لے لیکن کتنے اپنی تعلیم میں سنجیدہ ہوتے ہیں؟ دو فی صد بھی نہیں۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں تعلیم میں دلچسپی نہیں ہے اور دلچسپی کے نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے اور مقصد نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انہیں کوئی ایسا استاذ نہیں ملا کہ جوان کے دلوں میں مقصد کی محبت اس طرح ڈال سکے جیسے کسی جبلی تقاضے (instinct) کی محبت ہوتی ہے۔ یہ مقصد اور آدرش کی محبت ہی ہے جو تمام خواہشات کی محبتوں پر غالب آسکتی ہے اور یہ وہی استاذ پیدا کر سکتا ہے جو خود بامقصد زندگی گزار رہا ہو۔ ہم جس لائف اسٹائل کے عادی ہو چکے ہیں، یہ جبراً ہم پر مسلط ہو چکا، اب اس سے بھاگنا ممکن نہیں رہا۔ اب ایک ہی رستہ ہے کہ اسے بامقصد بنالیا جائے۔

دوسرا یہ کہ اگر زندگی بامقصد ہو جائے تو انسان اسمارٹ فون اور سوشل میڈیا کے مضر اثرات سے بہت حد تک محفوظ رہ سکتا ہے کہ وہ ان کے ساتھ اپنی روزمرہ زندگی کے معمولات چلا سکتا ہے بلکہ ہماری نوجوان نسل کو یہ سب کچھ سیکھنا ہے کہ انہیں اس سب کچھ کے ساتھ وہ سب کچھ کیسے چلانا ہے جو بامقصد ہے اور ان کے مستقبل، یہاں اس دنیا اور آخرت، کے لیے مفید ہے۔

مجھ سے اکثر دوست پوچھتے ہیں کہ آپ فیس بک پر کتنا وقت دیتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ سنجیدگی سے تو ایک گھنٹہ کہہ سکتا ہوں لیکن غیر سنجیدگی سے دن کا ایک بڑا حصہ۔ میری ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ فیس بک پر بیٹھے ہوئے اپنے بامقصد کام جاری رکھوں۔ عموماً یونیوسٹی آتے جاتے وقت رستے میں ایک مضمون سوچ لیتا ہوں جو کہ لکھنا ہے، پھر اسے لکھ دیتا ہوں، پھر دن بھر میں وقتاً فوقتاً کمنٹس بھی دیکھتا رہتا ہوں، چیٹس کے جواب بھی دیتا رہتا ہوں، ساتھ میں ریسرچ آرٹیکل بھی مکمل کر رہا ہوتا ہوں، کتاب بھی لکھ رہا ہوتا ہوں اور بچوں کے ساتھ کھیل بھی رہا ہوتا ہوں۔ اور یہ بھی کوشش کریں کہ آپ کے فیس بک، واٹس ایپ اور میسنجر وغیرہ کے اکاؤنٹس تک آپ کی اہلیہ یا گھر

والوں کی بھی رسائی ہو کہ جب چاہیں، آپ کے فون یا اپنے فون سے ان میں لاگ ان ہو سکیں۔ ور بہت سے سنجیدہ دوست ایسے ہی اسمارٹ فون اور سوشل میڈیا کو استعمال کرتے ہیں جیسا کہ ان سے بات چیت سے اندازہ ہوتا ہے اور فی الحال اس مسئلے کا یہی حل ہے۔ واللہ اعلم

یونیورسٹی میں تدریس

میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ایک یونیورسٹی میں انجینئرنگ کے طلباء کو گریجویشن لیول پر اسلامیات کا کورس پڑھاتا ہوں۔ کمپیوٹر سائنس، سافٹ ویئر انجینئرنگ، الیکٹریکل انجینئرنگ وغیرہ کے بچے عموماً ہیومینٹیز کے کورسز مثلاً اسلامیات، مطالعہ پاکستان، سوشیالوجی وغیرہ میں دلچسپی نہیں لیتے کہ انہوں نے اس میں ڈگری نہیں لینی ہے وغیرہ۔ اسی لیے ان مضامین کے اساتذہ اپنے طریقہ تدریس میں نئی نئی جہتیں سامنے لاتے رہتے ہیں۔

ہر کورس میں چار اسائنمنٹس ہوتی ہیں، ان اسائنمنٹس کے ذریعے بچوں کی کورس میں دلچسپی کافی بڑھائی جاسکتی ہے جبکہ ان میں کوئی نیا پہلو ہو۔ میں بچوں کو پہلی اسائنمنٹ یہ دیتا ہو کہ وہ ایک موضوع پر فیس بک پیج بنائیں، اس کو دو ہفتوں کے لیے چلائیں، اس پر متعلقہ پوسٹیں لگائیں، اس پیج پر زیادہ سے زیادہ لائکس حاصل کر کے اسے ایڈورٹائز کریں۔ اور پیج کے عنوانات اصلاحی نوعیت کے ہوتے ہیں جیسا کہ فیس بک ایڈکشن یا اسمارٹ فون ایڈکشن یا اسلام اور سائنس یا الحاد کے خلاف موضوع پر پیج بنالیا۔ بچے اس فیس بک پیج کی کلاس میں پریزینٹیشن بھی دیتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ اتنی پوسٹیں ہم نے کی، اتنے لائکس ملے، اتنا ریسپانس رہا وغیرہ

دوسری اسائنمنٹ، پاور پوائنٹ سلائڈز کی دیتا ہو کہ ایک موضوع پر پندرہ سے بیس سلائڈز بنا کر لانی ہیں، اور موضوعات عموماً ایسے ہوتے ہیں کہ جن میں بچوں کی دلچسپی قائم رہے جیسا کہ اس دفعہ کے موضوعات میں اسلامک اسکولز، اسلامک یونیورسٹیز، اسلامک چینلز، اسلامک آن لائن لائبریریز، اسلامک سافٹ ویئرز، اسلامک ایپس،

اسلامک آرٹ، اسلامک کارٹونز وغیرہ تھے۔ اور بچے یہ سلائیڈز بنا کر سلائڈ شیئر نامی ویب سائیٹ پر اپ لوڈ بھی کریں گے کہ جو سلائیڈز کا بہت بڑا ڈیٹا ہے جیسا کہ یوٹیوب ویڈیوز کا بہت بڑا ڈیٹا ہے تاکہ یہ سلائیڈز دعوت کا بھی ذریعہ بنیں۔ اور یہ اسائنمنٹ حق اور رد میں، دونوں پہلووں سے ہوتی ہیں۔

تیسری اسائنمنٹ، پریکٹیکل دیتا ہوتا اور اسے اسلامیات کی لیب کہتا ہوں۔ کچھ عرصے سے یہ تیسری اسائنمنٹ یہ ہوتی ہے کہ بچے پانچ دن تک لگاتار پانچ وقت کی نماز پڑھیں گے، بھلے جماعت سے نہ پڑھیں لیکن یہ کہ وقت پر پڑھیں گے تو پورے نمبر ملیں گے اور اگر قضا ہو گی تو نصف اور نہ پڑھیں گے تو زیرو۔ بچوں کے پاس چارٹ نما ورقہ ہوتا ہے کہ جس پر وہ ٹک مارک کرتے رہتے ہیں۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ بہت سے بچے اس پریکٹس سے نماز پڑھنا شروع ہو جاتے ہیں کہ اگر وہ صرف فرض بھی پڑھ لیں تو میں اسے بھی کنسڈر کر لیتا ہوں کہ فرض تو ادا ہوا۔

کل پری زین ٹیشنز تھیں تو ایسے ہی ذہن میں آیا کہ بچوں کی کوئی اسائنمنٹ شیئر کر دوں، تو چار بچوں کے ایک گروپ نے اسلامک کارٹونز پر سلائیڈز تیار کی ہیں اور اس میں عبد الباری، برقعہ ایوینجرز، صلاح الدین، عبد اللہ، مصری بچے جیسے پانچ کارٹونز سیرز کا تعارف کروایا ہے۔ یہ گریجویشن لیول کے کمپیوٹر سائنس کے بچوں کی محنت ہے، اس کی ضرور حوصلہ افزائی کریں اور ان سے ایم فل اور پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ کے اسٹوڈنٹس جیسے تحقیقی لیول کی امید نہ کریں۔[1]

ماں بننے کی صلاحیت

یونیورسٹی میں پڑھنے والی ایک بچی کے مستقبل میں اگر آپ ذرہ سا بھی جھانکنے کی کوشش کریں گے تو فوراً یہی خیال ذہن میں آئے گا کہ یہ ماں بننے کی صلاحیت سے محروم

---

[1] http://www.slideshare.net/hmzubair52/islamic-cartoons

ہو چکی ہے۔ ماں بننے کے لیے جس سنجیدگی، ٹھہراؤ، تحمل، برداشت، ایثار، قربانی اور فہم وفراست کی ضرورت ہے وہ 80 فی صد لڑکیوں میں مفقود نظر آئے گی۔

لڑکیوں کا یہ حال ہے تو کیا لڑکے باپ بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ تو ان کا حال تو ان سے بھی برا ہے۔ مجھے یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس کو دیکھ کر اور یہ سوچ کر بعض اوقات بہت وحشت ہونے لگتی ہے کہ اس معاشرے کا مستقبل کیا ہے؟ ان کی شادیاں، چاہے آپس میں بھی ہو جائیں، مہینہ چالیس دن سے زیادہ نہیں چلنے والی۔ یہ شادی کے بعد تین ماہ گزار لیں تو بہت بڑی کامیابی ہو گی۔ اگلی چند دہائیوں میں ہماری سوسائٹی میں طلاق کی شرح میں خطرناک حد تک اضافہ ہونے کی توقع ہے اور یہ پڑھے لکھے طبقے میں زیادہ ہو گی کہ اس ضافے کی وجہ جدید تعلیم اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل ہیں۔

ایک صاحب نے بتلایا جو ٹی۔ ایم۔ اے (TMA) کے ادارے میں کام کرتے ہیں کہ جس کے تحت نکاح طلاق کی رجسٹریشن ہوتی ہے کہ رجسٹرڈ طلاق کی شرح 45 فی صد ہو چکی ہے اور ابھی بھی صورت حال یہ ہے کہ نکاح کی رجسٹریشن کم ہو رہی ہے اور طلاق کی زیادہ۔ والدین کو نہ معلوم کیوں یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ ان کی بیٹی کے سسرال والوں اور خود ان کے داماد نے ان کی بیٹی کی بی ایس کی ڈگری کی بنیاد پر اس کی عزت اور احترام نہیں کرنا بلکہ انہوں نے تو کچھ اور دیکھنا ہے۔ چلیں، تعلیمی نظام تو کچھ نہیں کر رہا تو میڈیا معاشرے کی اصلاح میں کچھ کردار ادا کر سکتا تھا لیکن ہمارا میڈیا تو بدقسمتی سے بالکل اس کے برعکس سمت میں معاشرے کو لے کر جا رہا ہے۔

ہمارا میڈیا ڈراموں اور فلموں میں شادی کے بعد کی ایک عجیب قسم کی لگژیوریس اور رومانٹک لائف دکھا کر نوجوانوں کو کھائی میں دھکیل رہا ہے اور انہیں ذرہ بھی خبر نہیں ہے کہ حقیقی زندگی اور میڈیا کی دکھائی ہوئی دنیا میں کتنا فرق ہے؟ ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ ایک بچی ایم۔ فل فزکس اور پی۔ ایچ۔ ڈی ریاضی کرنے کے بعد بچے پیدا کرے گی اور بی۔ ایس فیشن اینڈ ڈیزائن کرنے کے بعد انہیں دودھ پلائے گی؟ یا اپنی فزیک اور فگر کا دھیان کرے گی؟ جدید نظام تعلیم ایک بچی کو کماؤ پوت بنانے میں تو شاید مددگار ہو سو

ہو لیکن ایک اچھی ماں اور بیوی بننے کے لیے بالکل بھی سازگار نہیں ہے۔

اور سچی بات یہی ہے کہ صورت حال یہ ہے کہ گھر کا ادارہ بنانے اور چلانے کے لیے جو جو صلاحیتیں اور خاصیتیں درکار ہیں، ہمارا نظام تعلیم انہیں پیدا اور پروموٹ کرنا تو دور کی بات، انہیں ختم (kill) کرنے میں لگا ہوا ہے۔ مستقبل ان تمام طلباء کا یہی ہے کہ یہ اس معاشرے میں ایک خاندان کی بنیاد رکھیں گے لیکن خاندان بنتا کیسے ہے، جڑتا کیسے ہے، مضبوط کیسے ہوتا ہے، ٹوٹتا کیسے ہے، بکھرتا کیسے ہے، یہ ہمارے نظام تعلیم اور کلاس میں کہیں بھی موضوع بحث نہیں ہے۔

یونیورسٹی میں بچیوں کی تعلیم؟

جدید تعلیمی نظام اور یونیورسٹی ایجوکیشن کے ایک پہلو پر ایک پوسٹ لگائی تھی کہ اس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ ہماری بچیاں ماں بننے کی صلاحیت سے محروم ہوتی جا رہی ہیں۔ کچھ دوستوں کو یہ سمجھ آیا کہ شاید ہم لڑکیوں کے لیے جدید تعلیم کے خلاف ہیں تو بھائی! ہم ہرگز جدید تعلیم کے خلاف نہیں ہیں۔ کچھ لوگوں نے سوال کیا کہ مدرسہ کیا دے رہا ہے؟ تو بھئی، ہم آپ کو یہ مشورہ بھی نہیں دے رہے کہ اپنی بچیوں کو یونیورسٹی سے اٹھا کر مدرسہ میں ڈال دیں۔ البتہ ایک دوست نے سوال کیا ہے کہ کرنا کیا چاہیے، مسئلے کا حل کیا ہے؟ یہ اہم سوال ہے۔

دیکھیں، پہلے مسئلے کی حساسیت کو سمجھیں تو پھر حل کی طرف آنا بھی مفید ہو گا۔ کچھ دوستوں کا خیال ہے کہ شاید میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اعلی تعلیم کے حصول کی وجہ سے لڑکیوں کی عمر بڑھ جاتی ہے لہذا وہ ماں بننے کے قابل نہیں رہتیں۔ یہ تو بہت چھوٹا پہلو ہے جو آپ نے میری بات سے نکالا ہے۔ اصل بات بہت بڑی ہے، اسے سمجھنے کی کوشش کریں کہ ماں بننے کے لیے جس سنجیدگی، ٹھہراؤ، تحمل، برداشت، ایثار، قربانی اور فہم وفراست کی ضرورت ہے، یہ نظام تعلیم اسے پیدا اور پروموٹ کرنا تو دور کی بات، ختم (kill) کرنے میں لگا ہوا ہے۔

اس پورے نظام تعلیم کا بنیادی اسٹرکچر مادہ پرستی کی دیواروں اور خود غرضی کی چھت

پر کھڑا ہے۔ یہاں اگر اخلاقیات کا کورس بھی پڑھایا جاتا ہے تو وہ بھی پروفیشنل اور بزنس ایتھکس کے نام سے کہ سیلز مین نے اگر کسٹمر کو کپڑا بیچنا ہے تو اسے اپنے چہرے پر مسکراہٹ لانی ہے تا کہ وہ اس کی جیب سے چار پیسے نکلوا سکے۔ یہ اخلاقیات آپ کو تعلیم کے نام پر سکھائی جاتی ہیں کہ جس کو ٹول بنا کر آپ اپنے سرمایے میں اضافہ کی خواہش پوری کر سکتے ہیں۔ یہاں کو۔ایجوکیشن کی برکت سے 80 فی صد لڑکیوں کو کلاس لیکچر میں دلچسپی نہیں بلکہ بننے سنورنے، میک اپ اور نت نئے ٹائٹس پہننے کا شوق فرمانے میں دلچسپی ہے۔

آج اگر کسی یونیورسٹی میں آپ کلاس حاضری کو غیر لازم قرار دے دیں تو کلاسز کی حاضری 20 فی صد سے بھی کم رہ جائے گی۔ اس نظام تعلیم نے ہمارے بچوں سے ان کی معصومیت کو چھین لیا ہے، ہر بچی ایک مکار عورت اور ہر بچہ ایک چالباز مرد بن رہا ہے۔ اور رہے لڑکیوں کے پرائیویٹ ہوسٹلز تو انہوں نے تو اَت مچا رکھی ہے۔

ان معصوم بچوں کی جب شادیاں ہوں گی تو یہ میاں بیوی شادی کے بعد ایک دوسرے کی جاسوسی کریں گے یا پچھلی زندگی کو معاف کرنے کا حوصلہ کریں گے؟ ظاہری بات ہے دوسرا کام ہی کریں گے بلکہ یہ کام بہت تیزی سے ہو رہا ہے۔

لڑکیوں کی اعلی تعلیم: مسئلے کا حل

لڑکیوں کی یونیورسٹی تعلیم کے حوالے سے چند مسائل کی نشاندہی کی تو بعض دوستوں نے پوچھا کہ اس کا حل کیا ہے؟ کیا ہمیں اس لیے اپنی بچیوں کو یونیورسٹی نہیں بھیجنا چاہیے کہ وہاں کا ماحول بہت خراب ہے یا جدید نظام تعلیم اور نصاب تعلیم دونوں ہی انسان بنانے کی بجائے رہی سہی انسانیت بھی نکالنے میں مصروف ہیں۔ میرے نزدیک اس کا حل بائیکاٹ نہیں ہے کہ اس سے اور مسائل جنم لیں گے کہ جن کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔

آج جب کوئی نوجوان مجھ سے کرکٹ دیکھنے کے بارے پوچھتا ہے تو میں اسے یہ نہیں کہتا کہ لغویات میں سے ہے، سارا دن دیکھتے رہتے ہو، کیا فائدہ، وقت کا ضیاع ہے،

وغیرہ وغیرہ، اگرچہ بات ایسی ہی ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ اگر اسے دین کے نام پر کرکٹ دیکھنے سے روک دیا گیا تو سارا دن پھر وہ کچھ دیکھے گا کہ جو کرکٹ سے دس گنا برا ہو گا کیونکہ سوسائٹی کا ایمان تو بنا نہیں ہوا لہذا آپ اس سے یہ توقع کریں کہ وہ کچھ آئیڈیل کام کر کے دکھا دیں گے تو یہ بے کار اور ناقابل عمل ہے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی آنے والی نسل جدید تعلیم اور اس کے مضر اثرات سے محفوظ رہے تو درج ذیل اقدامات مفید رہیں گے:

① کوشش کریں کہ آپ کے بچے زیادہ سے زیادہ تعلیم کالج لیول پر حاصل کریں، چاہے پوسٹ گریجویٹ کالج ہو جائے، یونیورسٹی بس صرف ایک نام ہے، پڑھائی میں زیادہ سنجیدگی ہو یا مشرقی اقدار کا بقا اور فروغ مثلاً اساتذہ کا ادب واحترام وغیرہ، یہ باتیں کالج لیول پر زیادہ موجود ہیں بنسبت یونیورسٹی اور جامعہ کے۔

② اور اگر آپ نے اپنے بچوں کو یونیورسٹی میں ڈالنا ہی ہے تو ایسی یونیورسٹی کا انتخاب کریں کہ جہاں مخلوط تعلیم نہ ہو۔ ہم مخلوط تعلیم (co-education) میں آگ اور پٹرول کو ایک ساتھ رکھ کر بے وقوفوں کی طرح یہ توقع لگا رہے ہیں کہ پٹرول بی بی اور آگ میاں بہت سمجھدار ہو چکے ہیں لہذا بھڑکیں گے نہیں۔ مخلوط تعلیم کا لازمی نتیجہ آگ ہے۔ چلیں، آگ بھی بعض اوقات مفید ثابت ہو جاتی ہے، میری مراد یہ ہے کہ اگر یہ آپس میں شادی ہی کر لیں لیکن یہ نہ ہونے کے برابر ہے اور یہ آگ گھر کے ادارے کو جلانے کا ایندھن ثابت ہو رہی ہے یا ہو گی۔

③ اور اگر آپ نے کسی ایسی یونیورسٹی میں بچوں کو تعلیم کے لیے ڈال ہی دیا ہے کہ جہاں مخلوط تعلیم ہے تو پھر ایک بات کا لازمی اہتمام کریں اور وہ یہ کہ ہاسٹل سے بچیں۔ کسی زمانے میں یہ ہاسٹل لائف فلسفی اور ادیب پیدا کرتی ہو گی، اب تو اسمارٹ فون اور انٹرنیٹ کا دور ہے۔ لائف اسٹائل بالکل تبدیل ہو چکا، اب

ہاسٹل لائف اکثر وبیشتر کی زندگی تباہ کرنے کے لیے ہے۔ آپ اپنے بچوں کو ڈے اسکالر کے طور پر یونیورسٹی بھیجیں کہ صبح کو جائیں، شام واپس آ جائیں۔ اب تو ہر ڈویژن میں یونیورسٹی موجود ہے بلکہ ضلعی سطح پر ہر دوسری بڑی یونیورسٹی کا کیمپس موجود ہے تو اس کے باوجود ایک شہر سے دوسرے شہر بچیوں کو تعلیم کے لیے بھیجنا سمجھ نہیں آتا۔

میں اپنے یونیورسٹی اسٹوڈنٹس سے اکثر کہتا ہوں کہ تم یونیورسٹی کے ماحول میں دو کام کر لو تو اللہ کے ولی ہو۔ ایک پنج وقتہ نماز نہ چھوڑو اور دوسرا ڈیٹ نہ مارو۔ تو یہاں بھی دو ہی باتیں کرنے کو کہوں گا کہ زیادہ باتوں پر عمل ہوتا بھی نہیں۔ ایک تو اپنی بچی کو ہاسٹل لائف کے فتنے سے بچا لیں ورنہ ہوم سکنس، والدین کی عدم توجہ اور معلوم نہیں کن کن بہانوں سے وہ لڑکوں کی طرف راغب ہو گی اور دوسرا یہ اہتمام کریں کہ آپ کا بچہ اور بچی دونوں گریجویشن میں قرآن مجید کے مکمل ترجمے سے گزر جائیں۔ اور قرآن کا ترجمہ بھی روایتی مولوی سے نہ پڑھیں بلکہ ان علماء اور اسکالرز سے جو قرآن کو اس کی جدید زندگی سے متعلق (relevant) کر کے دکھا دیں۔ کچھ نہ ملے تو ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے 108 گھنٹوں میں مکمل قرآن کا ترجمہ اور مختصر تشریح نیٹ پر دستیاب ہے، اسی سے گزر جائیں۔

مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے جب ایک سمسٹر میں مجھ سے کچھ بچے اسلامیات پڑھتے ہیں تو اگلے سمسٹر میں یہ کہتے ہیں کہ سر آپ سے پھر پڑھنے کو دل کرتا ہے یا بعض بچے تو کہتے ہیں کہ سر ہماری کوئی کلاس نہیں ہے، کیا آپ کی کلاس میں بیٹھ جائیں؟ تو اس دور میں جبکہ بچہ کلاس میں آنے کو تیار نہیں ہے لیکن اسے کیفے ٹیریا کی بجائے اسلامیات کی کلاس میں اپنا فارغ وقت گزارنے میں دلچسپی ہے تو اس کی ایک ہی وجہ ہے جو مجھے سمجھ آتی ہے کہ ان کے استاذ کے لیکچر میں یہ چیز ہوتی ہے کہ وہ اللہ عزوجل کی توفیق اور فضل سے ان کی اسلامیات کو ان کی روزمرہ کی زندگی سے اس طرح متعلق کر کے دکھا دے کہ شاید سائنس والے بھی اپنے سبجیکٹ کو اس طرح متعلق نہ کرتے ہوں۔ تو یہ

ریلیونس بہت ضروری ہے، ورنہ قرآن مجید بھی بوجھ بن جائے گا۔

سیکس ایجوکیشن از ارشد جاوید

پروفیسر ارشد جاوید ماہر نفسیات(clinical psychologist)ہیں۔ کیلیفورنیا یونیورسٹی، امریکہ سے سائیکالوجی میں ماسٹرز کیا ہے اور وہاں ہی سے ہپناٹزم میں سپیشلائزیشن ہے۔وہ امریکن سوسائٹی آف کلینیکل ہپناسس کے ممبر بھی ہیں۔ کئی ایک کتابوں کے مصنف ہیں اور خاص طور سیکس ایجوکیشن ان کا موضوع ہے۔ دینی اور مذہبی ذہن کے آدمی ہیں، پابند شرع ہیں اور غالباً جماعت اسلامی سے تعلق ہے۔ آج کل شادماں، لاہور میں کلینک کرتے ہیں۔

جنس ہماری زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت ہے لیکن اس سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ مشرق میں اس پر بات کرنا بھی شجر ممنوعہ کی حیثیت بن چکا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ اس کی وجوہات ہیں کہ جنہوں نے سیکس کو موضوع بحث بنایا ہے یعنی اہل مغرب، تو اس بھونڈے انداز میں کہ ایک شریف انسان کو اسے پڑھ سن کر ہی ابکائی آنا شروع ہو جاتی ہے۔ ایسے میں وقت کی ایک اہم ضرورت ہے کہ مہذب اور سلجھے ہوئے انداز میں نوجوانوں کے جنسی مسائل میں ان کی رہنمائی کی جائی۔

پروفیسر ارشد جاوید صاحب نے اس موضوع پر تین کتابیں لکھی ہیں، ایک کنواروں کے لیے، دوسری شادی شدہ مردوں کے لیے اور تیسری شادی شدہ عورتوں کے لیے۔ مجھے ان کی ساری باتوں سے اتفاق نہیں ہے، ان کی بعض باتیں ایسی ہیں جو اپنے موضوع اور نتائج دونوں اعتبار سے غلط معلوم ہوتی ہیں۔ میرا سیکس کے بارے میں ایک بالکل سوچا سمجھا ہوا نکتہ نظر ہے جو ایک کل (whole) کا جز ہے۔ لیکن یہ بات ہے کہ پروفیسر صاحب نے یہ کاوش اخلاص سے کی ہے اور مارکیٹ اور انٹرنیٹ پر سیکس ایجوکیشن کے نام سے جو مواد موجود ہے، اس سے ان کی یہ کتابیں کئی گنا بہتر ہیں۔

بعض نوجوان مجھ سے بھی جنس سے متعلق مسائل پوچھتے ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ میں اس موضوع پر اچھا لکھ سکتا ہوں کہ جنس کا بہت سا تعلق نفسیات اور لسانیات سے

ہے اور ان دونوں مضامین میں مجھے طبعی دلچسپی ہے۔ لیکن پھر ایک حجاب طاری ہو جاتا ہے کہ موضوع ہی ایسا ہے کہ لکھتے وقت ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ آپ اسے جتنا مرضی سلجھے ہوئے انداز میں بیان کر دیں، ہے تو سیکس کا موضوع ہی۔ اور یہ لفظ ہی ایسا ہے کہ ہمارے معاشروں میں اسے زبان پر لانا بھی گناہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ انٹرنیٹ پر سب سے زیادہ یہ موضوع پڑھا اور دیکھا جاتا ہے۔

ایسے میں فی الحال ارشد جاوید صاحب کی کتب ان نوجوانوں اور دوستوں کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں کہ جو اپنے جنسی مسائل سے پریشان ہیں۔ یہ کتابیں آپ گوگل کر کے ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں۔ بس اس رہنمائی کے ساتھ ان کتابوں کو پڑھیں کہ اس موضوع پر مذہبی آدمی کے لیے کوئی آئیڈیل بکس نہیں ہیں بلکہ جو کچھ دستیاب ہے، اس میں سے بہترین ہیں۔ اور نہ ہی سیکس کو ذہن ہر سوار نہ ہونے دیں، اگر یہ ذہن پر سوار ہو گیا تو پھر آپ اپنی شخصیت کی تباہی کے رستے پر ہیں۔ سیکس انسان کی بائیولاجیکل ضرورت ہے، اس میں شک نہیں ہے لیکن پیٹ کی بھوک تو آپ مٹا سکتے ہیں، آنکھوں کی نہیں۔ تو اسے بائیولاجیکل ضرورت ہی رہنے دیں، ذہنی حوس نہ بننے دیں۔ اور زیادہ مذہبی لوگ ان کتابوں کا مطالعہ نہ ہی کریں تو اچھا ہے۔ جزاکم اللہ خیرا۔

اچھا لکھاری

ایک دوست نے میری ایک کتاب پر تبصرہ کیا کہ اس میں یہ خامی ہے، یہ کمی ہے، اس موضوع پر آپ نے کچھ نہیں لکھا، یہ صحیح نہیں لکھا وغیرہ وغیرہ۔ دیکھیں، مجھے تو یہ دعوی کبھی نہیں رہا کہ آپ میری ہر بات کو صحیح مان لیں بلکہ یہ کہ جسے صحیح سمجھتا ہوں اسے لکھ دیتا ہوں اور یہ بھی دل سے سمجھتا ہوں کہ میرے لکھنے میں کمیاں اور کوتاہیاں ہیں جو وقت کے ساتھ دور ہوتی رہیں گے، ان شاء اللہ العزیز!

مجھے دو چیزوں کا بہت شوق ہے، اچھا لکھاری اور اچھا عالم دین بننے کا اور میں اس کے لیے مقدور بھر محنت کرتا رہتا ہوں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے میں نے اپنی زندگی کو دس کی دہائیوں میں تقسیم کیا ہوا ہے۔ مجھے لکھتے ہوئے اور عالم فاضل کی سند حاصل

کیے کوئی شاید گیارہ سال ہو چکے ہیں۔ میں نے اپنے دس سالوں کو ابتدائی سال قرار دیا ہے یعنی پہلے دس سالوں میں، میں ایک ابتدائی درجے کا عالم اور لکھاری ہوں۔ اور اس میں، میں نے کوئی پانچ کتابیں اور ایک صد کے قریب آرٹیکلز لکھے ہیں۔

اب میں اپنی منزل کے اگلی دہائی کا مسافر ہوں۔ اب کے دس سالوں میں میرا ٹارگٹ یہ ہے کہ میں ایک اوسط درجے کا لکھاری اور عالم بن سکوں۔ اور مجھے امید ہے کہ میں اس میں کامیاب جا رہا ہوں کہ گیارہویں سال کے آغاز سے میرے علم میں بھی بہتری آئی ہے اور میرے لکھنے کی صلاحیت بھی کافی بہتر ہو گئی ہے۔ اور اس دہائی کا ٹارگٹ اللہ کے فضل اور توفیق سے وقت سے پہلے ہی مکمل ہوتا نظر آ رہا ہے جو کہ چار کتب پر مشتمل ہے؛ صالح اور مصلح، مکالمہ، وجود باری تعالی اور اسلامی نظریہ حیات۔ ان چار کتب کے اسی ترتیب سے مطالعہ سے دین کے ایک طالب علم کی فکری بنیادیں اتنی پختہ ہو جائیں گی کہ وہ زندگی کے کسی شعبہ بھی میں مار نہیں کھائے گا، ان شاء اللہ! بشرطیکہ انہیں سمجھ کر پڑھا ہو اور ہضم بھی کیا ہو۔ اگلے دس سال یعنی تیسری دہائی میں، میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں ایک اچھا لکھاری بن پاؤں گا کہ جس میں عالمی سطح کے موضوعات کو اپنا موضوع بناؤں گا، ان شاء اللہ العزیز!

اس سے اگلی دہائی میں مجھے ایک عمدہ لکھاری بننے کی تمنا ہے، یعنی ایسا لکھاری جو عالمی سطح پر معروف ہو۔ اور اس سے اگلی دہائی میں مجھے ایک زبردست لکھاری بننے کی خواہش ہے اور اس سے مراد وہ لکھاری ہیں جو دنیا میں گنتی کے ہیں۔ میری منزل بہت دور ہے، سفر بہت لمبا ہے، زاد راہ کم ہے، بس جو ہے، وہ ایک لفظ میں اللہ کی توفیق ہی ہے۔

وہ جو اپنے آپ کو اچھا لکھاری سمجھتے ہیں، ان کی خدمت میں عرض یہی ہے کہ کبھی ان کی ٹائم لائن پر ایک دن گزار لیں کہ جنہیں کچھ دوسرے اچھا لکھاری سمجھتے ہیں تو آپ کا اپنے بارے یہ تاثر جاتا رہے گا اور آپ مزید محنت کر کے کچھ بننے کی طرف آئیں گے نہ کہ خود کو ضائع کر دینے کی طرف جائیں گے۔ آپ کے لیے بھی مشورہ یہی ہے کہ لکھاری یا کچھ بھی بننا ہے تو پھر اس طرح سے بننے کی خواہش اور محنت کریں، شاید بہت

سے پہلے سے ہی ایسا وژن رکھتے ہوں لیکن جن کے پاس نہیں ہے تو ان کے لیے عرض کر دی ہے۔

ایک دوست نے کہا کہ حقیقت تو یہی ہے کہ جس دہائی میں آج آپ خود کو بہترین لکھاری دیکھتے ہیں۔اس دہائی میں پہنچ کر آپ اپنے آپ کو آج سے بھی زیادہ ناقص سمجھیں گے۔ہاں البتہ دنیا آپ کو اچھا لکھاری کہے گی۔غالباً سقراط کا قول ہے کہ جو اپنے عیوب سے جتنا زیادہ آگاہ ہوتا جاتا ہے اتنا ہی لوگ اسے عقلمند اور دانا سمجھتے جاتے ہیں۔

کتاب خرید کر مصنف سے تعاون کریں!

آج مجھے ایک ایسی عادت کو زیر بحث لانا ہے جو بہت سے علم دوست کہلانے والے ساتھیوں میں پائی جاتی ہے اور وہ میری نظر میں اچھی عادت نہیں ہے۔اکثر طلبۃ العلم بلکہ علماء کا بھی رویہ یہ بن چکا ہے کہ انہیں کوئی کتاب خریدنی نہ پڑے اور ہر مصنف انہیں اپنی کتاب ہدیہ اور گفٹ کرے جبکہ ایسا ممکن نہیں ہے۔

میں پہلے بھی ایک تحریر میں عرض کر چکا ہوں کہ اس وقت اردو بازار کے پبلشرز کی صورت حال یہ ہے کہ کوئی آپ کی کتاب پبلش کرنے کو تیار نہیں ہے، چاہے آپ کتنے اچھے ہی لکھاری کیوں نہ ہوں،اور تو اور عطاء الحق قاسمی صاحب نے اپنے ایک کالم میں شکایت کی ہے کہ اب تو وہ دور ہے کہ ہماری کتابیں چھاپنے کے لیے بھی پبلشر پیسے مانگتے ہیں۔اس کی کئی وجوہات ہیں؛ایک وجہ تو یہ ہے کہ پہلے مصنفین کی تعداد کم تھی لہذا پبلشرز کو چھاپنے کے لیے کچھ چاہیے تھا اور اب لکھنے والے اتنے ہو گئے ہیں، ماشاء اللہ سے، کہ کس کس کو پبلش کیا جائے۔اور دوسرا یہ کہ پبلشرز نے بھی اتنی کتابیں چھاپ لی ہیں کہ اب ان کے پاس مزید پر انویسٹمنٹ کی گنجائش نہیں ہے۔

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پبلشرز عموماً اس کی کتاب چھاپتے ہیں کہ جس کا عوام میں بڑا نام ہو اور دوسرا وہ کتاب ایسی ہو کہ بازار میں نکلنے والی ہو یعنی عوامی موضوع ہو لہذا تحقیقی اور تخلیقی نوعیت کے کام کو کوئی ہاتھ نہیں ڈالتا۔ایسے میں مصنف کو اپنا شہ پارہ، ظاہری بات ہے دوسروں کے نزدیک وہ ردی ہو گا لیکن اس بے چارے کے نزدیک تو وہ شہ پارہ

اور ماسٹر پیس ہی ہو گا۔ پبلش کروانا ہے اور عوام کے سامنے لانا ہے تو اسے انویسٹمنٹ بھی خود ہی سے کرنی ہو گی۔ اور ایک طرف وہ بے چارہ تحقیق اور تخلیق کرے اور پھر اس کو پیسے لگا کر پبلش کروائے اور اب مفت میں تقسیم بھی کرے تو یہ اس کے ساتھ بہت ظلم ہے اور علم کی ناقدری بھی۔

نوجوان اور نئے لکھاریوں کی تصانیف اور تالیفات کی پبلشنگ نہ ہونے کی وجہ سے ان کی حوصلہ افزائی نہیں ہو پاتی لہذا آپ کو تحقیق اور تالیف کے نام پر کچھ نئی چیز دیکھنے کو بھی نہیں ملتی۔ اب کچھ عرصے سے اردو بازار میں تحقیق و تصنیف کا غالب رجحان یہی بن چکا ہے کہ گناہ کبیرہ پر کتاب نکال دیں، اس کے بعد عنوان تبدیل کریں اور محرمات اور حرام امور کے نام سے کتاب چھاپ دیں، پھر کبھی جنتی مرد چھاپ دیں اور کبھی جہنمی عورت، کبھی دس تراجم قرآن کو سامنے رکھ کر ایک نیا ترجمہ قرآن چھاپ دیں۔ کبھی حدیث کی کتاب کی ایک تخریج اور تحقیق چھاپ دیں اور کبھی دوسری۔ بس ایک ہی موضوع کو عنوان اور ٹائیٹل پیج بدل بدل کر رگڑا لگاتے رہیں۔ بس یہی تحقیق اور تخلیق ہے جو بدقسمتی سے علم و تحقیق کے نام سے باقی رہ گئی ہے کہ بازار میں اس کے گاہک موجود ہیں۔

ایسے میں اگر کوئی مصنف اس تقلیدی تحقیقی رجحان سے ہٹ کر کچھ پیش کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے محنت کر کے کوئی چیز سامنے لاتا ہے تو اب عوام کے اوپر ہے کہ اس کی حوصلہ افزائی اس طرح کریں کہ اس کی کتاب خرید کر پڑھیں۔ میرے خیال میں یہاں فیس بک پر کچھ نام ایسے ہیں کہ جنہیں پبلش ہونا چاہیے مثلاً احمد جاوید صاحب، ڈاکٹر زاہد صدیق مغل، ادریس آزاد صاحب اور رعایت اللہ فاروقی صاحب وغیرہ لیکن ان کے پاس نہ تو کوئی ادارہ ہے اور نہ کوئی جماعت کہ جو اپنے فنڈز سے ان کو شائع کرے۔

اور اگر ان میں سے کوئی ہمت کر کے اپنے ذاتی خرچہ پر کوئی تصنیف سامنے لاتا بھی ہے تو آپ اس کو خریدنے کے بجائے مفت حاصل کرنے کے خواہشمند ہوں گے تو آپ انہیں یہ پیغام پہنچائیں گے کہ بھئی، یہ کتاب تو شائع کر لی، اسے تو مفت تقسیم کر دو، اب

اگلی کی غلطی نہ کرنا۔ ایک کتاب کی قیمت اگر دو سو ہے، یعنی آپ کو دو سو میں پڑتی تو مصنف کو وہ دو لاکھ میں پڑتی ہے کیونکہ اس نے اس کے ہزار گیارہ سو نسخے پبلش کیے ہیں۔ آپ کتاب نہیں خریدیں گے تو وہ دو لاکھ کا مقروض ہو جائے گا۔

اور ویسے بھی ایک مصنف کی کتاب جب شائع ہوتی ہے تو وہ تقریباً ایک صد نسخے مفت میں تقسیم کرتا ہے، اور اگر آپ ان لوگوں میں سے ہیں کہ جنہیں فری میں نسخہ ملا ہے تو مصنف کا اچھے سے شکریہ تو ادا کر دیں۔ مشاہدے میں یہ بھی آیا ہے کہ ستر اسی فیصد علماء اور پروفیسر جن کو آپ فری میں کتاب بھجوائیں، شکریہ تو دور کی بات اتنی اطلاع بھی نہیں دیتے کہ کتاب موصول ہو چکی ہے جبکہ ان کے پاس آپ کا موبائل، ای میل اور پوسٹل ایڈریس سب پہنچ چکا ہوتا ہے۔ اس معاملے میں ہمیں اپنے رویوں کو ریوائز کرنے کی ضرورت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

انٹرنیشنل امپیکٹ فیکٹر ریسرچ اور کیپٹلزم

بین الاقوامی سطح پر کسی تحقیق کے معیاری ہونے کی دو علامات ہیں یعنی آپ کی تحقیق کسی ایسے ریسرچ جرنل میں شائع ہوئی ہو کہ جو آئی-ایس-آئی انڈیکسڈ ہو یا امپیکٹ فیکٹر (impact factor) جرنل ہو۔

آئی۔ایس۔آئی(Institute for Scientific Information)کی بنیاد 1960ء میں رکھی گئی۔ یہ بنیادی طور ایک ڈیٹا بیس ہے کہ جس میں ہر ڈسپلن سے 14 ہزار کے قریب رسائل کی ایک فہرست تیار کی گئی ہے کہ جسے آئی-ایس-آئی ماسٹر لسٹ کہا جاتا ہے۔ جو مجلہ، خواہ کسی بھی ڈسپلن کا ہو، اس ماسٹر لسٹ میں شامل ہو اور اس مجلے میں آپ کا آرٹیکل شائع ہو جائے تو آپ کی ریسرچ بین الاقوامی سطح پر معیاری شمار ہوتی ہے۔ ہزاروں مجلے آئی ایس آئی کو اپنے دو سال کے شمارے بھیجتے ہیں اور آئی ایس آئی ان شماروں کی ایویلیوایشن کے بعد اسے یا تو اپنی ماسٹر لسٹ میں شامل کر لیتی ہے، یا جواب دے دیتی ہے کہ مزید بہتری کے بعد دوبارہ اپلائی کریں۔

آپ کی ریسرچ کے معیاری ہونے کا دوسرا انڈیکٹر اس کا کسی ایسے جرنل میں شائع

ہوناہے کہ جو امپیکٹ فیکٹر ہو۔امپیکٹ فیکٹر جرنل میں ریسرچ،آئی-ایس-آئی انڈیکسڈ جرنل سے بھی زیادہ معیاری شمار ہوتی ہے۔آئی-ایس-آئی کسی جرنل کو اپنی ماسٹر لسٹ میں شمار کرنے کے بعد اس کے امپیکٹ فیکٹر کا تعین کرتا ہے جو کہ زیرو سے سو تک ہو سکتا ہے۔اور اسی امپیکٹ فیکٹر سے ہی علمی دنیا میں کسی جرنل کی علمی قدر کا تعین ہوتا ہے۔

اب کسی ریسرچ جرنل کا امپیکٹ فیکٹر نکالنے کا طریقہ بڑا دلچسپ ہے۔آئی-ایس-آئی ہر سال ایک رپورٹ پبلش کرتی ہے کہ جسے جے۔سی۔آر (journal citation report) کہتے ہیں۔اس رپورٹ میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ آئی-ایس-آئی انڈیکسڈ جرنلز میں فلاں جرنل کو اتنے جرنلز نے اتنی بار سائٹ کیا ہے یعنی اس کا حوالہ دیا ہے تو گویا جس جرنل کو دوسرے جرنل سائٹ کرتے ہیں تو اس جرنل کی اہمیت بڑھ جاتی ہے لیکن یہ سائیٹ کرے والے جرنل بھی آئی-ایس-آئی ہی کے ہوں گے،اس کی لسٹ کے باہر کے نہیں۔

کسی ریسرچ جرنل کا امپیکٹ فیکٹر یوں نکالا جاتا ہے کہ ایک جرنل کو جے سی آر کی سالانہ رپورٹ کے مطابق جتنی بار سائیٹ کیا گیا ہے،اس نمبر کو آپ اس جرنل کے دو سال کے شماروں میں چھپنے والے آرٹیکلز کی تعداد کے نمبر سے تقسیم کر دیں۔

علوم اسلامیہ میں کوئی امپیکٹ فیکٹر جرنل نہیں ہے البتہ تین جرنل آئی-ایس-آئی انڈیکسڈ ہیں۔جن میں سے ایک "دی مسلم ورلڈ" کے نام سے ہے،یہودیوں کے ہاتھ میں،1911ء سے شائع ہو رہا ہے،جوزف شاخت اور گولڈ زیہر وغیرہ اس میں لکھتے رہے ہیں۔آپ ارٹیکل بھیجیں تو سال بھر تک جواب ہی نہیں دیتے کہ وصول بھی ہو گیا ہے یا نہیں۔دوسرا "الشجرة" کے نام سے انٹر نیشنل اسلامک یونیورسٹی،ملائیشیا سے نکل رہا ہے،ان کا بھی ریسپانس اخلاقی اعتبار سے نہ ہونے کے برابر ہے۔تیسرا آکسفورڈ یونیورسٹی کا "جرنل آف اسلامک اسٹڈیز" ہے جو کہ اخلاقی اعتبار سے سب سے بہتر ہے کہ اڑھائی سے تین ماہ میں جواب دے دیتے ہیں۔

عالمی سطح پر جو ریسرچ شائع ہو رہی ہے تو ان میں کچھ جرنلز کو کاروباری جرنلز کہا جاتا ہے کہ وہ آپ کی ریسرچ پبلش کرنے پر آپ سے پبلیکیشن فیس لیتے ہیں۔ بعض آئی ایس انڈیکسڈ جرنلز بھی فیس لیتے ہیں اور ایک آرٹیکل پبلش کروانے پر یہ فیس دو سو ڈالر سے دو ہزار ڈالر تک ہو سکتی ہے، جرنل کے امپیکٹ فیکٹر کے اعتبار سے۔ اور بعض آئی- ایس-آئی انڈیکسڈ جرنلز تو پبلش کرنے نہیں بلکہ محض مقالہ جمع کروانے (submission) کی بھی فیس لیتے ہیں، چاہے بعد میں وہ آپ کو یہ جواب دے دیں کہ یہ مقالہ قابل اشاعت نہیں ہے۔ یہ سبمشن فیس دو سو ڈالر سے ہزار ڈالر تک ہوتی ہے، خاص طور بینکنگ اور اکنامکس کے مجلات میں۔

ڈاکٹر جیفری بیلز (Jeffry Beals) نے اس موضوع پر کافی کام کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ کسی ریسرچ جرنل کے معیاری ہونے کی بنیاد امپیکٹ فیکٹر نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے اس کی کئی مثالیں بیان کی ہیں جیسا کہ فیصل آباد، پاکستان سے شائع ہونے والے ایک تحقیقی مجلے "جرنل آف اینیمل اینڈ ویٹنری ایڈوانسز" کا امپیکٹ فیکٹر 0.390 ہے۔ سال میں اس کے 24 شمارے جاری ہوتے ہیں اور اس کثرت سے اس کی سالانہ اشاعت کے سبب سے اس میں آرٹیکل شائع کروانا آسان ہے۔ پبلشرز اس کے مقام اشاعت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجلس ادارت میں ستر افراد موجود ہیں لیکن ان کی کسی تعلیمی ادارے یا یونیورسٹی سے وابستگی کا ذکر نہیں ہے۔ آرٹیکل شائع کروانے کی فیس بھی ہے۔ اور مجلہ بعض اوقات ایسے تحقیقی مقالات بھی شائع کر دیتا ہے جو اس کے موضوع اور میدان سے باہر ہیں جیسا کہ اس مجلہ نے Effect of Different Cure Conditions on Compressive Strength of Concrete Having Different Properties کے عنوان سے ایک آرٹیکل شائع کیا ہے۔ اب کنکریٹ کا جانوروں سے کیا تعلق ہے؟ یہ تو انجینئرنگ کا موضوع ہے نہ کہ اینیمل سائنسز کا۔

اسی طرح مجلات ایک دوسرے کو ملی بھگت کے ساتھ سائٹ کرتے ہیں کہ ان کا

امپیکٹ فیکٹر بڑھ جائے۔ایک یونیورسٹی کے پروفیسر اپنے کولیگ کو خوامخواہ سائٹ کرتے ہیں کہ اس کا امپیکٹ فیکٹر بڑھ جائے کیونکہ اب آئی-ایس-آئی افراد کا بھی امپیکٹ فیکٹر شائع کرتی ہے کہ ایک فرد کو کتنا سائیٹ کیا جارہاہے۔یونیورسٹی کے پروفیسر اپنے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے اسٹوڈنٹس کو کہتے ہیں کہ وہ ان کے آرٹیکلز اور جرنلز کو اپنے مقالات (theses) میں سائٹ کریں تاکہ ان کا امپیکٹ فیکٹر بڑھ جائے۔وغیرہ وغیرہ

دوسری طرف بڑے بڑے پبلشنگ ہاؤسز ہیں جو سینکڑوں بلکہ ہزاروں جرنلز شائع کرتے ہیں۔ مثلاً springer والے تقریباً 2500 ریسرچ جرنل شائع کرتے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک ایشو کافی ابھرا تھا کہ springer کے پانچ چھ ریسرچ جرنلز نے ایسی تحقیق شائع کی تھی کہ جس میں بعض فارماسوٹیکل کمپنیز کی میڈیسن کے مثبت اثرات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا تاکہ وہ زیادہ فروخت ہو۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ فارماسوٹیکل کمپنیز ان ریسرچ جرنلز کی اشاعت کے لیے فنڈنگ بھی کرتی تھیں۔

تو یہ ایک پورا جال ہے کہ جس میں انڈسٹری، پبلشر، پروفیسر، یونیورسٹی، ایڈیٹر، جرنل اور انڈیکسنگ کمپنیاں ایک دوسرے سے تعاون کر رہی ہیں۔ انڈسٹری کو اپنی پراڈکٹ بیچنا ہے اور وہ تبھی زیادہ بکے گی جبکہ معیاری تحقیق کے جرنل اس کے معیاری ہونے پر مہر لگائیں گے۔ پروفیسر کو عہدے کی ترقی چاہیے جو کہ آئی-ایس-آئی اور امپیکٹ فیکٹر جرنل میں تحقیق کے شائع ہونے کے ساتھ مشروط ہے۔ پبلشر کو پبلش کرنے کے لیے انڈسٹری سے فنڈنگ چاہیے۔یونیورسٹی کو ایچ-ای-سی کی رینکنگ (ranking) چاہیے کہ جو اس بات کے ساتھ مشروط ہے کہ یونیورسٹی نے کتنی ایسی ریسرچ کروائی ہے جو آئی-ایس-آئی انڈیکسڈ اور امپیکٹ فیکٹر ہے۔ایڈیٹر کو اچھی جاب اور مقام چاہیے۔ریسرچ جرنل کو نام چاہیے وغیرہ۔اور حقیقی ریسرچ نہ ہونے کے برابر ہے، سب مصنوعی کام ہو رہا ہے، حوالہ یوں لگانا ہے یا یوں، مصنف کا نام لکھنا ہے یا کتاب کا نام، شکاگو مینوئل کو فالو کرنا ہے یا اے-پی-اے (APA) کو، بس تحقیق انہی

رسمیات کا نام بن کر رہ گئی ہے۔

ہائر ایجوکیشن کمشن کی تسلیم شدہ تحقیق

ہر یونیورسٹی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے پروفیسر صاحبان ایسی تحقیق شائع کریں کہ جسے ہائر ایجوکیشن کمیشن (HEC)، تحقیق شمار کرے۔ اب ایچ-ای-سی سے کوئی تحقیق تسلیم کروانے کے دو طریقے ہیں؛ ایک یہ ہے کہ آپ کسی ایسے تحقیقی مجلے میں اپنا تحقیقی مضمون شائع کروالیں کہ جو ایچ-ای-سی کا تسلیم شدہ مجلہ ہو یا آپ اپنی کتاب ایچ ای سی کو بھیجیں تو ایچ-ای-سی کی ایک ذیلی کمیٹی آپ کی کتاب کا تجزیہ کر کے اس کے بارے کوئی فیصلہ کرے گی۔

ایچ-ای-سی نے تحقیق کے چار درجات مقرر کیے ہوئے ہیں؛ ڈبلیو، ایکس، وائے اور زی۔ سب سے اعلی درجے کی تحقیقی ڈبلیو کیٹیگری کی تحقیق شمار ہوتی ہے کہ جسے عالمی عرف میں امپیکٹ فیکٹر تحقیق کہتے ہیں۔ اس کا آسان الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ آپ کی تحقیق کسی ایسے مجلے میں شائع ہوئی ہو کہ جس مجلے کی تحقیق نے سوسائٹی میں کوئی ریسپانس پیدا کیا ہو۔ اور اگر آپ کی اپنی تحقیق نے سوسائٹی میں کوئی ریسپانس جنریٹ کیا ہو، مثبت یا منفی، تو اسے امپیکٹ کہتے ہیں اور یہ عالمی ضابطے میں اس سے بھی اعلی درجہ کی تحقیق شمار ہوتی ہے۔

یونیورسٹی کے تقاضے کے مطابق پہلے تو کوشش کی کہ علوم اسلامیہ کے کسی ایسے مجلے میں اپنا کوئی تحقیقی مضمون شائع کروالیا جائے کہ جو ایچ-ای-سی کا تسلیم شدہ ہو لیکن ہمارے رفقاء (colleagues) کا کہنا تھا کہ بغیر ریفرنس اور خوشامد کے ممکن نہیں ہے اور ہمیں بھی یہ بات جلد ہی سمجھ آگئی کہ ایک مجلے کو آرٹیکل بھیجا تو نو ماہ بعد ایک سطری جواب ملا کہ ناقابل اشاعت ہے اور دوسرے مجلے نے دو سال بعد جواب دیا کہ شائع نہیں ہو سکتا۔ بہر حال وہ مضامین تو انگریزی میں ترجمہ کروا کے پاکستان کے باہر سے شائع کروالیے لیکن دوسرے رستے کو آزمانے کا سوچا کہ ایچ-ای-سی کو اپنی کتابیں بھیجوں۔

راقم نے کوئی دس علمی، فکری اور تحقیقی کتابیں لکھی ہیں اور ایک سو سے زائد تحقیقی

مضامین شائع کیے ہیں۔ دو کتابیں ابھی ایچ-ای- سی کو بھیجی تھیں کہ ایک کتاب "اسلام اور مستشرقین" کو انہوں نے زی کیٹیگری عطا فرمائی کہ جو ایچ-ای- سی تسلیم شدہ تحقیق میں ردی تحقیق شمار ہوتی ہے، اور دوسری کتاب "مولانا وحید الدین خان" کو زی کیٹگری کے قابل بھی نہ سمجھا۔ اگلی دو کتابیں بھی ایچ-ای- سی کو بھجوانے کا ارادہ تھا لیکن اب شدید مایوسی کے سبب کوئی بھی کتاب بھجوانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ اور زیادہ دکھ اس پر ہوا کہ کتابوں کی یہ ایویلیوایشن اسلامیات کے لوگوں نے کی ہے۔ اور یونیورسٹی فیکلٹی میں سب سے زیادہ حسد آپ ان لوگوں میں دیکھیں گے، جہاں بھی چلیں جائیں۔ اور یہ بات سب لوگ کرتے ہیں کہ ہم تو چلیں ایسے ہیں سو ہیں، یہ اسلامیات والے ایسے کیوں ہیں؟ تو مولوی ہو اور حسد نہ کرے تو یہ ممکن نہیں ہے، یقین نہ آئے تو مولانا روم کے ارشادات بھی دیکھ لیں اور سوانح بھی۔

مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ ایچ ای سی کی علوم اسلامیہ کے پروفیسروں کی ذیلی کمیٹی نے میری جس کتاب کو زی کیٹیگری کے قابل بھی نہ سمجھا تو انڈیا سے دو پبلشرز نے اسے بعینہ شائع کیا ہے۔ بعض ایم فل کے طلباء نے اپنے مقالوں میں اس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔ جید علماء نے اس کتاب کی تحسین کی ہے، بعض نے لیٹرز بھی لکھے۔ اور امپیکٹ کسے کہتے ہیں؟ یعنی سوسائٹی آپ کی تحقیق میں سے حوالہ نہیں پوری کی پوری تحقیق کو ری پروڈیوس کر رہی ہے، اور مصنف کے کہے بغیر، تو یہ امپیکٹ نہیں تو اور کیا ہے؟

اور میری جس کتاب کو زی کیٹیگری میں شمار کیا ہے، تو کئی پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ کے طلباء نے کہا کہ ہم نے اپنے مقالے میں آپ کی اس کتاب سے بہت استفادہ کیا۔ بعض اساتذہ نے کہا کہ وہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے کورس ورک میں اسلام اور مستشرقین کا کورس پڑھاتے وقت اس کتاب سے بہت استفادہ کرتے رہے۔ اور امپیکٹ کسی بلا کا نام ہے؟ مجھے یہ نہیں کہنا کہ میری تحقیق بہت اعلی ہے لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ جو کچھ ایچ ای سی کے وائے اور زی کیٹیگری کے مجلوں میں تحقیق شائع ہو رہی ہے، اور وہ سب کے علم میں ہے کہ کیا کچھ شائع ہو رہا ہے، تو میری تحقیق اس سے بدرجہا بہتر ہے۔

مجھے افغانستان سے ایک بار فون آیا کہ آپ کی کتاب "چہرے کا پردہ: واجب، مستحب یا بدعت؟" کو ہم پشتو میں شائع کر رہے ہیں، شائع کرنے سے پہلے سوچا کہ جو نمبر کتاب میں دیا گیا ہے، کیا یہ مصنف ہی کا ہے، تو اسی غرض سے فون کیا تھا، آپ مصنف ہیں، میں نے کہا کہ ہاں، فون بند۔ فکر غامدی کتاب کے پانچ ایڈیشن نکل چکے ہیں، وہ انڈیا سے بھی شائع ہو چکی، میرے کہے بغیر۔ حقوق الزوجین یعنی میاں بیوی کے حقوق پر ایک کتابچہ اردو اور ہندی دو زبانوں میں ایک صاحب نے انڈیا سے شائع کروا کے مفت تقسیم کیا۔ ایک کتاب صالح اور مصلح مقبوضہ جموں و کشمیر سے شائع ہو چکی بلکہ اسلامی جمعیت طلباء مقبوضہ جموں و کشمیر نے اپنے تربیتی نصاب میں اس کتاب کو مقرر کیا ہے۔

مجلات نے میرے بیسیوں مضامین ری پروڈیوس کیے ہیں یعنی دوبارہ بعینہ شائع کیے ہیں۔ تکفیر اور جہاد پر حالیہ کتاب پر ایک دفعہ مفتی تقی عثمانی نے فون کر کے بہت مبارک باد دی۔ فکر غامدی پر ایک دفعہ مفتی منیب الرحمن نے فون کر کے تحسین کی اور اس کے کچھ ابواب بذریعہ ای میل منگوائے۔ ارشاد الحق اثری صاحب نے فکر غامدی پر تحسین فرمائی، بلکہ ساتھ لگا کر دعا دی۔ زبیر علی زئی صاحب نے کہا تھا کہ میں حافظ زبیر کی ہر تحریر غور سے پڑھتا ہوں، وغیر ذلک کثیر

اور پھر مختلف طبقات نے جو میری تحریر کا جواب دیا یا میرے خلاف لکھا، یہ بھی تو ریسپانس ہی ہے۔ طالبان نے میرے خلاف پوری کتاب لکھ ماری، یہ میری تحقیق کا امپیکٹ نہیں ہے کیا؟ ہم نے جس کو چھیڑا، اس نے جواب دیا، خوب مکالمے کیے، لوگوں نے پڑھے، وہ شائع ہوئے، اس قدر ری پروڈیوس ہوئے کہ ایک مرتبہ پنجاب یونیورسٹی کے فلاسفی ڈیپارٹمنٹ کے سابق چیئرمین جناب ڈاکٹر ابصار احمد مجھ سے کہنے لگے کہ حافظ صاحب کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کہاں کہاں شائع ہو رہے ہیں؟ اور ایسا واقعی میں ہوا ہے اور میں اس پر اللہ کا شکر گزار ہوں لیکن ایچ۔ای۔ سی کے اس قسم کے رویوں پر دکھ ہوتا ہے کہ ایسی تحقیق کو ردی تحقیق کے درجے سے بھی گرا دیتے ہیں حالانکہ خود اپنی تحقیق کو چھپاتے پھرتے ہیں کہ اس قابل نہیں ہے کہ لوگوں کے سامنے لائی جا

سکے۔اور غلطی سے پروفیسر صاحب کسی کانفرنس میں دو چار علمی باتیں کرلیں توانسان سن کر پریشان ہو جاتاہے کہ یہ اس عہدے تک پہنچ کیسے گئے ہیں۔

فیکلٹی ہی کا کہناہے کہ یہ تحقیق نہیں کاروبار ہے، مناپولی ہے،اصل تحقیق تو وہی ہے جو محدث،الشریعہ، حکمت قرآن وغیرہ جیسے دینی اور عوامی مجلوں میں شائع ہوتی ہے کہ جو معاشرتی مسائل پر ہو اور معاشرے میں ریسپانس پیدا کرے۔اور حقیقت تو یہی ہے کہ اگر سید سلمان ندوی،اور ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق بھی ان کمیٹیوں کو ان کے نام کے بغیر بھجوادی جائے تو وہ بھی زی کیٹیگری کے لائق بھی نہ ہو۔ایسے میں نوجوان محققین مایوس نہ ہوں، لکھتے رہیں، اپنی تحقیقی صلاحیتوں کو نکھارتے رہیں، مستقبل کا قاری یہ فیصلہ کرے گا کہ آپ کتنے بڑے محقق تھے،اور ان کے بارے میں بھی، کہ یہ ایلویلیوایشن کرنے والے کیا تھے؟

اور وہ وقت بھی آئے گا کہ پی۔ایچ۔ڈی مقالوں کے سپروائزروں کے مقالہ جات اور ان کے ایچ۔ای۔سی سے تسلیم شدہ تحقیقی مجلوں پر تحقیق کی جائے گی تو واضح ہو جائے گا کہ ایویلیوایشن کمیٹی کی اپنی تحقیق کا معیار کیاہے یاایچ۔ای۔سی ریسرچ جرنلز میں پبلش ہونے والی اس ردی تحقیق نے معاشرے کے کیا مسائل حل کیے ہیں تو خود بخود ہی اس بارے یونیورسٹیوں میں توازن پیدا ہو جائے گا۔یورپ میں تو ایسے ریسرچ جرنلز بھی ہیں کہ جن کا تخصص ہی مذہبی ریسرچ کا تجزیہ ہے کہ وہ کس پائے کی ہے۔تو یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہیں مسند احمد کی روایت کے مطابق عہدہ دے کر بغیر چھری کے ذبح کیا گیاہے۔ ہمیں نماز میں سجدے کی حالت میں احسان کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی کرسی پر بیٹھ کر قلم کو جنبش دیتے وقت ضرورت ہے کہ ہلکی سی لغزش سے کسی کا حق مارا گیااور آپ قیامت کے دن جوابدہ ٹھہرے۔

بہر حال جو لوگ ہمیں جانتے ہیں، سو جانتے ہیں۔ جو پڑھتے ہیں،انہیں معلوم ہے کہ ہماری تحقیق کا کیا معیار ہے۔اور دوست کا مشورہ ہے کہ ان کے بارے کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ کسی سرکاری یونیورسٹی میں اپلائی کرنے کے قابل نہ رہو گے،اپنی

ہاؤ، جو عرض کرنا تھا، کر چکا۔ اور اب وعظ کرنے کی آپ کی باری ہے اور میں ہمہ تن گوش ہوں۔

مقالہ جات کے سپر وائزروں کی خدمت میں

پاکستان میں بہت سی یونیورسٹیاں علوم اسلامیہ میں ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کروا رہی ہیں۔ غالباً صرف لاہور شہر میں ہی کوئی دس بارہ یونیورسٹیاں تو نکل ہی آئیں گی۔ اور بعض پرائیویٹ یونیورسٹیاں تو گویا تھوک کے حساب سے ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی میں ایڈمشن کرتی ہیں۔ پس اس وقت طلباء کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو کہ ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی میں رجسٹرڈ ہے۔

میرا تعلق چونکہ علوم اسلامیہ سے ہے لہذا ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کے طلباء اپنے مقالہ جات کے عناوین کے انتخاب، خطۃ البحث (synopsis) کی تیاری، مواد کے حصول، حوالے کی کتب (reference books) کی تلاش اور مقالہ لکھنے کے طریق کار وغیرہ کے حوالہ سے رابطہ کرتے ہیں۔ راقم نے بلاشبہ اس سلسلے میں بیسیوں طلباء کی رہنمائی کی ہے لیکن اب آ کر احساس ہوتا کہ اپنے پیٹی بھائیوں سے ایک شکوہ کر لینا چاہیے۔ پچھلے دنوں مولانا سمیع اللہ سعدی اور سید عبد المتین صاحب نے بھی اس پر کچھ گفتگو کی ہے کہ کیا علماء کو طلباء کی یہ رہنمائی مفت کرنی چاہیے؟ کیا اس سے ان کے سپر وائزر اور نکمے نہیں ہو جائیں گے؟

ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طلباء جس طرح رُل رہے ہوتے ہیں، اس کا ذمہ دار کون ہے؟ یہ طلباء دھکے کھا کر کسی لائبریرین سے یا کسی عالم دین سے یا کسی دینی ادارے سے کچھ نہ کچھ رہنمائی لے ہی لیں گے، لیکن آپ کو سپر وائزر بنانے کا مقصد کیا تھا؟ میرے علم میں ہے کہ بعض یونیورسٹیاں اس کام کے لیے سپر وائزر حضرات کو باقاعدہ پے (pay) کرتی ہیں۔ تو یہ اسی لیے ہے کہ یہ طلباء آپ کی ذمہ داری ہیں۔

میں یہ نہیں کہہ رہا کہ آپ کے طلباء عنوان کے انتخاب اور سائن آپسس کی تیاری میں دوسروں سے مشورہ نہ کریں۔ بھئی، یہاں جب وہ دوسروں سے مشورہ کرنے آتے

ہیں تو طالب علم کی بات چیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سپر وائزر صاحب کچھ نہیں کر رہے۔ انہیں صرف اس بات سے غرض ہے کہ میرے سی۔وی (CV) میں یہ لگ جائے گا کہ میں نے اتنے بچوں کو ایم۔فل یا پی۔ایچ۔ڈی کروایا ہے۔ یا انہیں صرف یہ غرض ہے کہ انہیں ایک مقالہ سپر وائزر کرنے پر اتنے پیسے مل جائیں گے۔

مجھے معلوم ہے کہ یہ طلباء اپنے مقالہ کے مقدمہ میں سب سے زیادہ شکریہ کا اظہار آپ کے لیے کریں گے کہ انہیں معلوم ہے کہ ابھی وائیوا (VIVA) ہونا باقی ہے لیکن یہی طلباء جب عنوان، سائن آپسس، مقالے کی تیاری کے لیے دھکے کھا رہے ہوتے ہیں تو وہ آپ کے لیے ایک چلتی پھرتی ایڈورٹزمنٹ ہوتے ہیں۔ آپ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآنہ ہو کر نہ صرف آخرت کو خراب کرتے ہیں بلکہ اپنی دنیا بھی تباہ کر لیتے ہیں۔

اگر ایک بچے نے آپ کے ساتھ ہی مقالہ کرنا ہے، اور مان لیا کہ آپ کا وہ ریسرچ ایریا نہیں بھی ہے اور آپ کو اس بارے زیادہ معلومات نہیں ہیں، تو خود اسے ایسے پروفیسر اور محقق کے پاس لے کر جائیں کہ جس کا وہ ریسرچ ایریا ہے۔ آخر کب تک آپ کے بچے دوسروں سے وقت اور رہنمائی کی بھیک مانگتے رہیں گے۔ یا تو آپ اہل نہیں ہیں کہ مقالہ میں سپر وائزر بن سکیں یا پھر اہل ہیں لیکن کام چور ہیں تو دونوں صورتوں میں آپ مجرم ہیں۔ اور اس جرم کی تلافی اسی صورت ممکن ہے کہ آپ اپنے بچے کے ساتھ ممکن تعاون کریں۔ کیا آپ میں سے کوئی ایسا ہے کہ جو اپنے طالب علم کی ایم فل اور پی ایچ ڈی میں اتنی ہی رہنمائی کرتا ہو جتنا کہ اگر اس کی جگہ اس کا بیٹا ہوتا تو وہ رہنمائی کرتا؟ اگر نہیں تو غور کا مقام ہے۔

یونیورسٹیوں کی درجہ بندی

پوری دنیا میں یونیوسٹیوں کی درجہ بندی (Universities Ranking) کا ایک نظام قائم ہے۔ اس درجہ بندی کے ذریعے ہر یونیورسٹی کا ایک رتبہ قائم کیا جاتا ہے جیسا کہ QS World university Ranking عالمی سطح پر یونیورسٹیوں کی درجہ بندی کے لے معروف ہے۔ یہ ہر سال ایک کتاب پبلش کرتے ہیں کہ جس میں دنیا کی

بڑی یونیورسٹیوں کی اس سال کے اعتبار سے درجہ بندی کرتے ہیں کہ ایم۔آئی۔ٹی (MIT) یونیورسٹی 2016ء میں پہلے نمبر پر رہی، ہارورڈ تیسرے پر اور کیمبرج چوتھے پر اور اسی طرح فلاں یونیورسٹی ہزارویں نمبر پر رہی۔ پورے عالم اسلام کی صرف ایک یونیورسٹی ہے جو اس عالمی رینکنگ میں پہلی پانچ سو یونیورسٹیوں میں شامل ہے۔ اور اسے بڑی تشویش ناک صورت حال بیان کیا جاتا ہے۔

یہی کام پاکستان میں ہائر ایجوکیشن کمشن ہر سال کرتا ہے کہ اگلے سال کے آغاز میں پچھلے سال کی یونیورسٹی درجہ بندی کا ایک ڈاکومنٹ شائع کرتا ہے اور پاکستان کی تقریباً 180 یونیورسٹیوں میں سے کون سی یونیورسٹی پہلے، دوسرے، تیسرے نمبر پر رہی، اس کا اعلان کرتا ہے۔ یونیورسٹیاں پہلی دس پوزیشنز (top ten) میں رہنے کی کوشش کرتی ہیں کہ اس سے انہیں زیادہ سے زیادہ ایڈمشن ملتے ہیں کیونکہ طالب علم کے نزدیک کسی یونیورسٹی میں ایڈمشن کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک بڑی بنیاد یونیورسٹی کی رینکنگ ہوتی ہے۔

عالمی سطح پر بھی اور پاکستان میں بھی جب یونیورسٹیوں کی درجہ بندی کی جاتی ہے تو اس کے لیے ایک معیار مقرر کیا گیا ہے کہ یونیورسٹی نے اتنی ریسرچ پبلش کی ہے یا یونیورسٹی ان ان ڈسپلن میں یہ یہ ڈگریاں آفر کر رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس سارے معیار کا خلاصہ اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو یہ ہے کہ یونیورسٹی کا سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے فروغ میں کتنا کردار ہے یا یونیورسٹی سائنس میں کس قدر اور کتنی اعلیٰ ریسرچ پبلش کر رہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا سائنس کی تعلیم و تحقیق کو یونیورسٹیوں کی درجہ بندی کا بنیادی معیار ہونا چاہیے؟ ہم اس وقت بے وقوفوں کی طرف ٹرک کی بتی پیچھے لگے ہیں۔ سائنس تو امر واقعہ کو جان لینے کا نام ہے، ایک چیز ہے، اس پر پردہ تھا، آپ نے پردہ ہٹا دیا، وہ سامنے آ گئی، تو سائنس کی حقیقت تو محض انکشاف (discovery) ہے نہ کہ تمیز (differenciation)۔ اور اصل علم تو وہ ہے جو تمیز پیدا کرے، حق و باطل میں،

خیر وشر میں۔ اور سائنس تو یہ کام بالکل نہیں کرتی۔ دوسری بات یہ کہ سائنس کا موضوع مادہ (matter) ہے، آپ اسے جاننے میں لگے ہیں۔ سائنس میں انسان کوئی موضوع ہے ہی نہیں اور اگر کہیں انسان موضوع ہے بھی جیسا کہ میڈیکل سائنس میں تو وہاں بھی بطور ایک مادہ کے ہے یعنی بائیولاجیکل تھنگ کے طور پر۔

باقی ہیومینیٹیز (Humanities) کے علوم میں انسان کو موضوع بنایا گیا ہے لیکن انہیں کوئی سائنس مانتا ہی نہیں ہے۔ آج تک سائیکالوجی والے لڑ رہے ہیں کہ ہمیں سائنس مانا جائے۔ تو جو کائنات کا دولہا تھا یعنی انسان، اس کے بارے جاننا تو سائنس نہیں ہے لیکن مٹی گارے کے بارے جاننا عین سائنس ہے اور بہت اعلی علم ہے۔ آپ کی انجینئرنگ کیا ہے؟ مٹی گارے کا علم ہی تو ہے۔ پس زیادہ بڑا عالم وہ ہے جو انسان کو نہیں مٹی کو زیادہ جانتا ہو۔ اور اصل علم کہ جو علم حقیقی ہے، یعنی حق وباطل میں فرق کرنے اور خیر وشر میں تمیز کرنے والا علم، جسے ہم وحی کا علم کہتے ہیں، اسے کوئی علم ماننے کو ہی تیار نہیں ہے۔ اس دنیا میں علم کے نام پر کیا کچھ ہو رہا ہے، ہمارے پاس سوچنے کا وقت نہیں ہے، کیونکہ ہم سوچ میں پڑ گئے تو ٹرک آگے نکل جائے گا اور ہم نے ہر صورت ٹرک کی بتی کو ہاتھ لگانے کا عزم کیا ہوا ہے۔

انٹرنیشنل اسلامک ریسرچ سینٹر کا قیام

خواہشات تو انسان کی بہت سی ہوتی ہیں، دینی بھی اور دنیاوی بھی۔ ایک خواہش یہ بھی ہے کہ ایک بہت عظیم الشان مرکز تحقیق یعنی ریسرچ سنٹر ہونا چاہیے جو مغرب کے مقابلے میں عالم اسلام کی نمائندگی کرے۔ اتنا بڑا ریسرچ سنٹر کہ جیسے سعودی عرب میں جامعۃ الامام ہے یا کم از کم جیسے لاہور میں پنجاب یونیورسٹی ہے۔ جامعۃ الامام تو فیصل آباد شہر جتنی بڑی یونیورسٹی ہے اور پنجاب یونیورسٹی بھی کوئی چھوٹی نہیں ہے۔

اس ریسرچ سنٹر میں اسی طرح شعبہ جات یعنی ڈیپارٹمنٹس ہوں جیسا کہ یونیورسٹی میں ہوتے ہیں لیکن یہ شعبہ جات صرف سوشل سائنسز اور ہیومینٹیز کے ہوں یعنی فلاسفی، سائیکالوجی، اکنامکس، پولیٹکل سائنس، شوشیالوجی، انٹرنیشنل ریلیشن،

آرکیالوجی، اینتھراپالوجی، لاء، ایجوکیشن، لینگویجز، تقابل ادیان، مذاہب عالم، اسلام اور ایریا اسٹڈیز سینٹرز اور جینڈر اسٹڈیز سینٹرز وغیرہ لیکن ان میں کام صرف تحقیق اور ریسرچ کا ہو یا اس کی طباعت اور پبلشنگ کا۔

ان شعبوں اور ڈیپارٹمنٹس میں کتب اور ریسرچ جرنلز پبلش کیے جائیں اور یہ تحقیق، تحقیق برائے تحقیق نہ ہو بلکہ ہر ڈسپلن میں تحقیق کا مقصد واحد، حق و باطل کی پہچان اور خیر و شر کی تمیز ہو۔ اور اس تحقیق کے نتائج انسان کو اللہ کے نزدیک کر دیں۔ اس ریسرچ سنٹر میں دنیا کے ایسے بہترین مسلمان محققین کو جمع کیا جائے جو کچھ کرنے کا جذبہ یا وژن رکھتے ہیں اور انہیں بہترین وسائل مہیا کیے جائیں کہ وہ یکسوئی سے یہ کام سر انجام دے سکیں۔

اتنا بڑا ریسرچ سنٹر کام کیا کرے گا؟ تو کام کرنے کو بہت ہیں۔ اگر یہ اسلام کا ایک مثبت انسائیکلوپیڈیا ہی مرتب کر دے یا ہر ڈسپلن میں پیدا کیے گئے مغربی الحاد کا جواب ہی دے دے تو یہ بھی بہت بڑی خدمت ہے۔ یہودی اور عیسائی مستشرقین نے ایک صدی میں پندرہ جلدوں میں ایسا انسائیکلوپیڈیا آف اسلام تیار کر دیا ہے کہ انگریزی پڑھے لکھے طبقے میں سے ہر خاص و عام کا اسلام کے بارے معلومات حاصل کرنے کا مصدر اول ہے۔ اب تو وہ قرآن مجید پر بھی چار جلدوں میں انسائیکلوپیڈیا تیار کر چکے ہیں۔

پھر دوسری زبانوں میں اسلامی لٹریچر کی منتقلی بھی ایک بڑا کام ہے۔ عربی سے اردو میں ترجمہ تو ہو رہا ہے لیکن اردو میں فکر اسلامی سے متعلق بہت سا مواد ایسا موجود ہے کہ اسے انگریزی اور عربی میں منتقل کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جہاں ریسرچ سینٹر ہو، وہاں ہی محققین کی رہائش گاہیں ہوں، مارکیٹ ہو، مسجد ہو، پارک ہو، عظیم الشان لائبریری ہو، میڈیکل کی سہولت میسر ہو وغیرہ۔ اور چوبیس گھنٹے لائبریری کھلی ہو کہ لوگ مشن بنا کر اس کام کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔

لیکن یہ پراجیکٹ اتنا بڑا ہے کہ کوئی حکومت ہی اس کا بیڑہ اٹھا سکتی ہے کہ خرچہ ہی خرچہ ہے اور آمدن کچھ نہیں ہے۔ اور حکومتی سطح پر ہی یہ ممکن ہے کہ بہترین ریسرچرز

کو اتنی تنخواہ فراہم کرے کہ جو مارکیٹ کے مطابق ہو تا کہ وہ آئے روز ملازمتیں تبدیل کرنے یا اوور ٹائم لگانے کی بجائے یکسو ہو کر کام کر سکیں۔ البتہ ریسرچ اگر انٹرنیشنل لیول کے تقاضوں کے مطابق ہو تو اس کی پبلشنگ سے کسی قدر خرچے پورے کیے جا سکتے ہیں۔

باب یازدہم

تزکیہ اور تصوف

اس باب میں تزکیہ اور تصوف کے بارے بنیادی سوالات پر بحث کی گئی ہے۔

انسان اور تزکیہ

بھئی، اپنے تزکیے پر جتنا زور مرضی لگالو، رہو گے تو انسان کے انسان ہی۔

انسان کی تقدیر

"گرنا" انسان کی تقدیر ہے۔ خدا کو اس کے "گرنے" سے غرض نہیں ہے بلکہ "اٹھنے" سے ہے۔ گناہ کا ہو جانا "گرنا" کہلاتا ہے اور توبہ کا عمل دوبارہ "اٹھنے" کا نام ہے، اللہ کی طرف سفر کرتے بندے کا گر کا دوبارہ اٹھنا اور سفر شروع کر دینا توبہ کہلاتا ہے۔ کیا ہمیں اپنے اس بچے پر زیادہ پیار نہیں آتا جو گرتا پڑتا ہماری گود میں آنے کی کوشش کرتا ہے۔ پس خود بھی اٹھو اور دوسروں کو بھی اٹھاؤ لیکن اس امید پر نہیں کہ دوبارہ نہیں گریں گے بلکہ اس عزم کے ساتھ کہ گر کر گرے نہیں رہیں گے بلکہ اٹھتے رہیں گے۔ بس، خدا کا تم سے اتنا سا تو مطالبہ ہے!

ان کا خیال ہے کہ خدا ان کے گرنے کو گن رہا ہے حالانکہ وہ تو ان کے اٹھنے کو دیکھ رہا ہے۔ خدا تمہارا دشمن تھوڑی ہے جو تمہارے گرنے کو شمار کرے گا، وہ تمہیں تمہاری ماں سے زیادہ پیار کرتا ہے، اسے تو تمہارا اٹھنا گننا ہے۔ اگر بچے کا رخ ماں کی طرف ہے تو اس کی طرف لپکتے ہوتے اس کا گرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ توبہ کرنے والا بھی اللہ کی طرف یکسو ہی ہے، بھلے گرتا پڑتا یکسو ہو، جب تک کہ دل سے توبہ کرتا رہے۔

ضبط نفس (self control)

نفس سے مقابلے میں اگر تھک جاؤ، تو اس سے دوستی کر لو، دوستی میں بھی بہت سی باتیں مان جاتا ہے۔ نفس سے دوستی یہ ہے کہ اس کی بڑی خواہش کی جگہ کوئی چھوٹی سی خواہش پوری کر دو۔ تمہارا یہ دشمن طاقت میں تم سے بہت بڑھ کر ہے لیکن ہے بے وقوف، بالکل بچے کی طرح۔ اسے کینڈی ٹافی پر بہلانے اور پھسلانے کی مہارت پیدا کرو، ورنہ ساری عمر اس کی غلامی میں گزار دو گے۔ مقابلے سے اس کو ہرانے کے لیے بہت ایمان چاہیے جو ہم میں سے اکثر کے پاس نہیں ہے۔

چھوٹی نیکی

چھوٹی چھوٹی نیکیاں زیادہ کیا کریں کہ ہم چھوٹی نیکی خالص اللہ کی رضا کے لیے کرتے ہیں اور بڑی نیکی خالص اپنی رضا کے لیے۔ اور چھوٹی نیکی کی مثال یہ ہے کہ رستے سے اینٹ پتھر کو ہٹادیا اور بڑی نیکی کی مثال یہ ہے کہ کسی کو اپنا مرید یا فالوور بنا کر راہ حق پر لگادیا۔

موسی اور خضر

میں نے کہا کہ موسی افضل تھے، دوست نے کہا کہ خضر۔ میں نے کہا وہ کیسے؟ اس نے کہا کہ خضر، موسی کے استاذ ہیں اور خضر کے پاس وہ علم ہے جو موسی کے پاس نہیں ہے۔ میں نے کہا لیکن یہ عجیب ہے کہ موسی کا ذکر اٹھائیس پاروں میں ہے اور خضر کا نام تک قرآن میں موجود نہیں۔ دوست نے کہا کہ تم موسی کی افضیلت سے نکالنا کیا چاہتے ہو؟ میں نے کہا کہ میں اس پر غور کر رہا ہوں کہ مجلس کی زندگی افضل ہے یا تنہائی کی؟ دونوں پر اللہ کی سلامتی ہو!

آزمائش اور صبر

دوست نے کہا کہ ضروری ہے کہ دعا سے آزمائش ختم ہو جائے۔ میں نے کہا کہ ضروری نہیں ہے ورنہ صبر کا حکم کیوں ہوتا؟ اس نے کہا کہ دعا سے سب کچھ ہو سکتا ہے، میں نے کہا کہ ماں سے کہو کہ ذرا اپنے مردہ بیٹے میں جان ڈال دے، اس کے پاس صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ صبر کا کوئی نسخہ؟ میں نے کہا کہ قرآن مجید، الشریم، المعیقلی یا ادریس ابکر کی آواز میں۔ میں نے کہا کہ لوگوں سے اختلاط کی آزمائش بھی ایسی ہی ہے۔

دعا کی قبولیت

انبیاء کی جو دعائیں قرآن مجید میں منقول ہیں کہ اللہ نے انہیں قبول کر لیا جیسا کہ زکریا علیہ السلام کو بڑھاپے میں بیٹا دے دیا، ایوب علیہ السلام کو بیماری سے نجات دے دی، یونس علیہ السلام

کو مچھلی کے پیٹ سے نکال لیا، تو یہ دعائیں کوئی پہلی مرتبہ میں قبول نہ ہوئیں بلکہ ان دعاؤں کے قبول ہونے کے پیچھے بڑی آہ وزاری تھی۔ حضرت یونس علیہ السلام کو ہی دیکھ لیں کہ تین دن گڑگڑاتے رہے، تو دعا کی قبولیت چاہیے تو سالوں اس کے لیے آہ وزاری کا حوصلہ پیدا کرو۔

بڑا سانحہ

مجھے نہیں معلوم بڑا سانحہ "سقوط حلب" کا ہے یا یہ کہ کروڑوں کی اس امت میں اب دو ہاتھ بھی ایسے نہیں رہے کہ جنہیں خالی لوٹانے سے پروردگار کو شرم محسوس ہو۔

اندر کا انسان

بھئی، میں اپنے اندر کے انسان کی تلاش میں ہوں، میں اس انسان کا بیان چاہتا ہوں، جیسا کہ وہ ہے، بالکل اسی طرح جس طرح خدا نے اسے پیدا کیا ہے، اگر تمہیں اس میں اپنا مسیح نظر آئے تو یوں سمجھ لو کہ سانچہ ایک ہی ہے۔ ہم نے عالم دین کی نظر سے انسان کو پرکھ لیا، اب ایک سوشل سائنٹسٹ اور ہیومنسٹ کی نظر سے دیکھ لینا چاہیے۔ یقین مانو کہ اندر کے انسان کی دریافت علمی دنیا میں ایک بہت بڑا معرکہ ہو گا کہ کبھی اپنے اندر جھانک کر تو دیکھو ایک کائنات آباد ہے۔ صرف نفس کی کمزوریاں دیکھنا چاہو گے تو کئی انسائیکلوپیڈیاز کھل جائیں گے۔

سچا انسان

اپنے اندر کے انسان میں جھانکتے رہو اور اس کو ایویلوایٹ کرتے رہو، اور اس کی ایویلوایشن کو مانتے بھی رہو، اس کے بغیر سچا بننا بہت محال ہے۔

تنہائی کا اقرار

اپنی تنہائی میں اپنے مالک کے سامنے اپنے ان گناہوں کے گناہ ہونے کا اقرار کرنا سیکھو کہ جنہیں گناہ سمجھنے کا تم میں ابھی حوصلہ نہیں ہے۔

صفائی اور گناہ

اپنی صفائی ضرور دو لیکن اس طرح نہیں کہ دوسرا گناہ گار ثابت ہو رہا ہو۔

عورت کی محبت

عورت سے مت بھاگو کہ وہ اپنے جذباتی تعلق سے تمہارے اندر کے نظام محبت کو ایکٹیویٹ کر دیتی ہے، چاہے ماں ہو، بیٹی ہو، بیوی ہو یا بہن ہو۔ اب اس کے بعد کرنے کا کام یہ ہے کہ اس محبت کا رخ خدا کی طرف پھیر دو۔ اسی لیے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے لیے تمہاری دنیا میں سے عورتوں کو محبوب بنا دیا گیا۔ عورت تمہیں خدا سے محبت کرنے کے قابل بناتی ہے اور اس سے تعلق کے بغیر تمہارا دل ایک نان ایکٹیویٹڈ سم کی مانند ہے کہ جسے خدا سے کنکشن کا دعوی ہے۔

اللہ کی محبت

رسول اللہ ﷺ کے لیے جذباتی محبت پیدا ہوئے بغیر اللہ سے محبت محض ذہنی اور شعوری ہو سکتی ہے۔ اللہ سے سچے جذباتی تعلق کے لیے ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جذباتی تعلق پیدا ہو۔ اور رسول اللہ ﷺ سے جذباتی تعلق کے پیدا کرنے کا ایک رستہ یہ ہے کہ مسنون درود کو حرز جان بنا لو۔

یکسوئی

میں نے قرآن مجید میں بار بار پڑھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خوبی یہ تھی کہ وہ "حنیف" تھے یعنی یکسو تھے۔ اس لفظ کے معنی تو سمجھ میں آتے تھے لیکن دل میں نہیں اترتے تھے۔ پھر ایک مثال ایسی سامنے آئی کہ اس لفظ کا معنی حال بن گیا۔ ایک پروفیسر صاحب نے بتلایا کہ وہ مارکیٹ کے لیے اپنی مسز کے ساتھ گاڑی پر گھر سے باہر نکلے، گھر میں موجود بچوں جو کہ اٹھارہ سال سے زائد عمر کے تھے اور اسمارٹ فون پر مشغول تھے، کو کہا کہ گھر کا گیٹ بند کر دینا۔ دو گھنٹے بعد گھر واپس آئے، گھر کا گیٹ اسی طرح کھلا تھا اور بچے اسی پوزیشن میں اسمارٹ فون کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے، اسے کہتے ہیں یکسو ہونا۔

اسکرین کا فتنہ

بھئی، تمہارے لیے کوئی تیسری آپشن باقی نہیں رہ گئی، یا خدا کو دیکھ لو یا اسکرین کو! کاش! ہمارے ساٹھ سالہ بوڑھے کو سجدے میں وہ یکسوئی حاصل ہو جائے جو اڑھائی سالہ بچے کو اسکرین میں حاصل ہے۔

فیس بک چھوڑ دو!

دوست نے کہا کہ فیس بک چھوڑ دو، میں نے کہا کہ کیوں؟ اس نے کہا کہ یہ تمہاری شخصیت کی تعمیر (personality development) میں رکاوٹ ہے۔ میں نے کہا کہ کیسے؟ اس نے کہا کہ نوٹیفکیشن دیکھنے کی ایڈکشن میں مبتلا بھلا خدا کی طرف یکسو ہو سکتا ہے!

دنیا سے محبت

دوست کا سوال ہے کہ دنیا سے محبت کیسے پیدا ہوتی ہے؟ جواب: دنیا سے محبت سب کو ہے، لیکن سب کی دنیا اپنی اپنی ہے، کسی کی "دنیا" اس کا "دین" ہے۔

استاذ اور شاگرد

اچھا استاذ کون ہے؟ جو اپنے شاگرد سے بھی سیکھے۔ اچھا شاگرد کون ہے؟ جس سے اس کا استاذ سیکھے۔

تنہائی اور خود نمائی

اب تو تنہائی بھی خود نمائی (show-off) کا ذریعہ بن گئی ہے، کبھی مجلس میں یہ ذکر کر کے میری تنہائی بہت اچھی ہے، اور کبھی تنہائی میں یہ سوچ کر کہ میری تنہائی لوگوں پر منکشف ہو جائے۔

تسليف الصوفية وتصويف السلفية

یہ شیخ قرضاوی حفظہ اللہ تعالی کے ایک آرٹیکل کا عنوان ہے کہ جس کا معنی یہ ہے کہ صوفیت اور سلفیت میں اعتدال بر مبنی موقف یہ ہے کہ صوفیوں کو سلفیت کا تڑکا لگایا

جائے اور سلفیہ کو صوفیت کا کہ ہر دو کو اصلاح کی ضرورت ہے اور اس کی اصلاح کی ضرورت بھی اس کے مخالف مکتبہ فکر ہی سے پوری ہو گی۔

رمضان اچھا کیسے گزاریں؟

استقبال رمضان یعنی رمضان کا استقبال کرنا اللہ کے رسول ﷺ کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ استقبال رمضان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رمضان کا چاند نظر آتے ہی اس کے استقبال میں پٹاخے اور فائرنگ شروع کر دی جائے بلکہ اس کے استقبال کا مطلب یہ ہے کہ رمضان سے پہلے رمضان کی تیاری کی جائے، رمضان سے پہلے رمضان کی فکر جائے، رمضان سے پہلے رمضان گزارنے کی پلاننگ کی جائے۔

اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں روایات میں ملتا ہے کہ آپ رمضان کے مہینے کے بعد سب سے زیادہ روزے شعبان کے مہینے میں رکھتے تھے۔ اور جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کی اتباع میں شعبان میں کثرت سے روزے رکھنا شروع کر دیے تو آپ نے انھیں منع فرما دیا اور کہا کہ پندرہ شعبان کے بعد روزہ نہ رکھو تاکہ رمضان کے روزوں، جو کہ فرض ہیں، میں کوئی کوتاہی اور سستی نہ ہو جائے۔ تو شعبان میں کثرت سے روزے رکھنے کا عمل یہ بتلاتا ہے کہ آپ ﷺ شعبان کا مہینہ رمضان کے استقبال اور تیاری میں گزارتے تھے۔

یہ بہت آسان فہم سی بات ہے کہ عید کا ایک دن ہے یا چلیں تین دن ہیں لیکن ہمارا پورا رمضان عید کی تیاریوں میں گزر جاتا ہے کہ عید کے دن یہ کھانا پکانا ہے، عید کے دن فلاں فلاں کے ہاں جانا ہے، عید کے دن کے لیے اپنے اور بچوں کے نئے کپڑے سلوانے اور جوتے خریدنے ہیں وغیرہ۔ لیکن رمضان جو کہ پورا ایک مہینہ ہے، ہم اس کی پلاننگ ایک دن پہلے سے بھی نہیں کرتے۔ اگر کوئی شخص عید کی رات کو بچوں کے کپڑوں کی پلاننگ شروع کرے گا تو کیا عید والے دن اپنے بچوں کو نئے کپڑے پہنا پائے گا؟

اسی طرح اگر رمضان کی پہلی رات میں رمضان کی تیاری شروع کی تو پہلے دن کی سحری بھی فوت ہو جائے گی۔ اور رمضان اس طرح نہیں گزرے گا کہ جس سے آپ کی

زندگی میں کوئی تبدیلی آئے۔ رمضان کے آنے پر دل میں خوشی کا پھوٹنا ایمان کی علامت ہے اور رمضان کے آنے پر اگر دل پر بوجھ محسوس ہو تو ایسے شخص کو اپنا ایمان ریوائز کرنا چاہیے۔ تو رمضان سے پہلے رمضان کی تیاری کا مطلب یہی ہے کہ آپ یہ پلاننگ کریں کہ آپ نے اس رمضان میں زیادہ اوقات کو عبادت، تلاوت، ذکر اذکار، اعتکاف، لیلۃ القدر کی تلاش وغیرہ میں گزارنا ہے۔

رمضان میں دنیا کے کام چھوڑنے نہیں ہیں بلکہ انھیں کم کر دینا ہے اور عبادت کے اوقات اور نیکی کے عمل کو بڑھانا ہے اور اسی کی پلاننگ کرنی ہے۔ بھئی، بہت سادہ ہے کہ سحری کے وقت سحری کرنے بیٹھو گے تو نفس وسوسہ ڈالے گا کہ بہت لمبا دن ہے، ڈبل شفٹ لگا لو۔ اور جب افطاری کرنے بیٹھو گے تو نفس دوبارہ وسوسہ ڈالے گا کہ اتنا لمبا دن بھوکے پیاسے رہے، لہذا ڈبل شفٹ لگا لو۔ تو عام دنوں میں آپ نے تین وقت کا کھانا کھایا اور رمضان میں چار وقت کا تو آپ اپنی کیا تربیت کریں گے؟ رمضان کا مقصد تو ضبط نفس یعنی سیلف کنڑول ہے اور وہ تو فوت ہو گیا۔

کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ رمضان میں کھانا پینا بند کر دیں بلکہ یہ کہ کم کر دیں۔ اگر عام دنوں میں دو روٹی کھاتے ہیں تو رمضان میں ڈیڑھ کر دیں۔ اگر افطاری کے وقت پیاس کی شدت سے آپ نے سامنے پڑا روح افزا یا جام شیریں کا پورا جگ چڑھا لیا تو حرام تو کوئی بھی اسے نہیں کہے گا لیکن ایمان سے بتلائیں کہ کیا اس کے بعد آپ تراویح پڑھنے کے قابل رہیں گے؟ تراویح تو دور کی بات آپ اس کے بعد مغرب کی نماز بھی کھڑے ہو کر پڑھ لیں تو بڑی بات ہو گی۔

رمضان کے مہینے میں کھانے پینے سے منع نہیں کیا گیا لیکن یہ کہ رمضان کو کھانے پینے کا مہینہ بنا لینا تو یہ بھی غلط ہے، اس سے رمضان کا مقصد فوت ہو جائے گا یعنی ضبط نفس اور سیلف کنڑول۔ کیا ایسا نہیں کہ پورے پاکستان میں گیارہ مہینوں میں اتنا سموسہ پکوڑا نہیں بنتا جتنا صرف ایک رمضان کے مہینے میں بنتا ہے؟ اتنا کھانے پینے کے بعد کیا ضبط نفس حاصل ہو گا یا کیا عبادت میں کیفیت حاصل ہو گی یا تراویح میں دل لگے گا؟

اتنا سموسہ پکوڑا کھانے کے بعد اگر کوئی آپ کو موٹیویٹ کر کے کہیں تراویح پر لے بھی آیا تو کبھی دائیں ٹانگ تو کبھی بائیں ٹانگ پر کھڑے ہو کر دو چار رکعتیں روتے روتے یا اونگھتے جاگتے پڑھ لیں گے لیکن اس سے کیا تربیت ہو گی؟ اس لیے رمضان میں اپنے کھانے پینے، اپنے اوقات، اپنی دنیاوی مصروفیات کو کنٹرول کریں، اور اسے کنٹرول کرنے کی سوچ بچار شعبان میں شروع کریں تو بس یہی رمضان گزارنے کا اچھا طریقہ ہے۔

رمضان ٹرانسمیشن کا نام تبدیل ہونا چاہیے!

دوست کا کہنا ہے کہ رمضان ٹرانسمیشن کے نام پر جو کچھ دکھایا جا رہا ہے، اس کے لیے "رمضان" کا لفظ استعمال کرنا اس کے تقدس کو پامال کرنے کے مترادف ہو سکتا ہے لہذا ایسی آواز اٹھانی چاہیے کہ پیمرا رمضان کے نام پر کیے جانے والے ان تماشا پروگرامات کے نام تبدیل کرنے کے لیے چینلز کو مجبور کرے۔

یہ تجویز بہت عمدہ ہے، اب یہ تو ممکن نہیں ہے کہ سرکس والے اپنی سرکس بند کر دیں، کہ انہوں نے بھی تو کچھ کمانا اور کھانا ہے لیکن انھیں کم از کم یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ اپنی سرکس کا نام "بسم اللہ سرکس" نہ رکھو، کچھ اور رکھ لو۔ تو اسی طرح رمضان کے مہینے میں دکھائے جانے والے ان شوز کے نام سے رمضان کا لفظ نکال دیا جائے تو اس کا کوئی اور نام رکھ لیا جائے مثلاً "نیلام گھر ٹرانسمیشن"، "لکی ٹرانسمیشن"، اور بعضوں کو تو "سرکس ٹرانسمیشن" کا نام بھی دے دیا جائے تو بہت مناسب ہو گا۔

عوام کو رمضان ٹرانسمیشن کے ان تماشا پروگراموں پر کتنا غصہ ہے؟ اور یہ پروگرام معاشرے میں کس قدر وائلنس کا سبب بن سکتے ہیں، اس کا اندازہ آپ سوشل میڈیا پر گردش کرنے والے ایک میسج سے لگا سکتے ہیں کہ جس میں سعودی عرب میں مقیم ایک پاکستانی "فردوس جمال" یہ کہہ رہے ہیں:

> "ساحر لودھی نے رمضان ٹرانسمیشن کے نام پر مسخرہ پن اور لچر پن شروع کر رکھا ہے، وہ خود آگے بھاگ رہا ہوتا ہے اور ماہ مبارک میں پورا اسلامی جمہوریہ پاکستان یہ تماشا اور بے ہودگی دیکھ رہا ہوتا ہے۔ جو بہنیں ساحر لودھی کے شو

میں جاتی ہیں، ان کے لیے میرا یہ اعلان ہے کہ کوئی بھی بہن اگر موقعے کا فائدہ اٹھا کر ساحر لودھی کو جوتا مارے، اس کے لیے عمرے کی ٹکٹ کا اعلان کرتا ہوں۔ فردوس جمال، مدینہ منورہ، موبائل: 00966569502482"

اللہ عزوجل نے قرآن مجید میں اپنے نبی ﷺ کو حکم دیا ہے: ﴿وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا﴾ [الأنعام: 70] ترجمہ: ان لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا چھوڑ دیں کہ جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا لیا ہے اور انھیں دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔

تو رمضان ٹرانسمیشن کے نام پر دین کو کھیل اور تماشا ہی بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ پس اگر آپ کو اس بات سے اتفاق ہو کہ "رمضان ٹرانسمیشن" کے نام پر کیے جانے والے ان پروگرامات کا نام تبدیل ہونا چاہیے اور اس کے لیے پیمرا کو حرکت میں آنا چاہیے تو اس تجویز کو اپنی وال پر بھی شیئر کریں اور اپنے واٹس ایپ گروپس میں بھی شیئر کریں، شاید کے اس طرح ان میں سے کچھ کو کچھ حیاء آجائے یا وہ اس ڈر سے اپنی اصلاح کر لیں، جزاکم اللہ خیرا۔

اعتکاف اور لیلۃ القدر

رمضان کے آخری عشرے میں رسول اللہ ﷺ دو قسم کی عبادتوں کا اہتمام کرتے تھے، ایک اعتکاف اور دوسرا لیلۃ القدر کی تلاش۔ اعتکاف اتنی بڑی اور فضیلت والی عبادت ہے کہ اللہ عزوجل نے قرآن مجید میں اپنے دو جلیل القدر انبیاء حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کو حکم دیا کہ وہ اللہ کے گھر بیت اللہ کو اعتکاف کرنے والوں کے لیے پاک کریں۔ یعنی اعتکاف کرنا اتنی بڑی عبادت ہے کہ اعتکاف کرنے والوں کی خدمت بھی بہت بڑا نیکی کا کام ہے۔

پس اگر حالات ایسے نہیں ہیں کہ اعتکاف کر سکیں تو کم از کم کسی اعتکاف کرنے والے کی خدمت کر دیں کہ اسے گھر سے سحری اور افطاری وغیرہ لا دی یا اس کے گھر کے کچھ کام کاج کر دیے وغیرہ۔ اور اعتکاف میں دو باتیں اہم ہیں؛ ایک نیت اور دوسرا

مقصد۔اعتکاف رمضان کے آخری عشرہ میں اللہ کی خاطر مسجد میں جم کر بیٹھنے کا نام ہے تواس کے لیے پہلے نیت خالص کر لیں۔

رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ رمضان میں اعتکاف کے لیے اپنے حجرے میں داخل ہونے لگے تو آپ نے کچھ اور خیمے دیکھے۔آپ نے پوچھا تو بتلایا گیا کہ فلاں فلاں ازواج کے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے اس سال کا اعتکاف ترک فرما دیا کہ آپ کو محسوس ہوا کہ ازواج آپ کی وجہ سے اعتکاف کر رہی ہیں اور اس سال شوال میں اعتکاف فرمایا۔

اور دوسرا یہ کہ اعتکاف کا مقصد اللہ کی عبادت کے لیے اپنے آپ کو یکسو کرنا ہے یعنی ہر چیز سے کٹ کر صرف اللہ کا ہی ہو کر رہ جانا تو اس مقصد کو کسی صورت فوت نہ ہونے دے۔اب تو عجب صورت حال دیکھنے کو ملتی ہے کہ لوگ اعتکاف کی حالت میں اخبار پڑھ رہے ہیں، موبائل فون پر گیم کھیل رہے ہیں، لیپ ٹاپ پر فیس بک استعمال کر رہے ہیں، تو یہ سب باتیں اعتکاف کے مقصد کے منافی ہیں۔ اعتکاف در اصل دس دنوں کی رہبانیت ہے کہ جس میں انسان اپنی دنیا سے بالکل غافل ہو جائے اور اس دوران اپنے اندر عبادت کا ذوق بیدار کرے۔یہ المیہ کیا کم ہے کہ ہمیں سجدے میں وہ لذت نہیں ملتی جو مووی دیکھنے میں حاصل ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ عبادت کا ذوق موجود نہیں ہے۔اور اعتکاف ایک ایسی عبادت ہے کہ جو عبادت کا ایسا ذوق بیدار کر دیتی ہے کہ مسجد میں رہنا انسان کو زیادہ محبوب ہو جاتا ہے، سجدے اور دعاء میں اس کا دل زیادہ لگتا ہے۔اور اگر عبادت کا ذوق نہ ہو تو عبادت بوجھ بن جاتی ہے، اعتکاف میں بیٹھ کر یوں لگے گا کہ جیسے قید خانے میں آ گئے ہوں، اس لیے عبادت کا ذوق بیدار کرنا بہت ضروری ہے۔اور عبادت کا ذوق اس وقت بیدار ہوتا ہے جب تنہائی اچھی ہو جائے تو اعتکاف اپنی تنہائی کو اچھا بنانے کی ایک مشق ہے۔

اور دوسری اہم چیز کہ جس کا ہمیں اہتمام کرنا ہے، وہ طاق راتوں میں لیلۃ القدر کی تلاش ہے۔ لیلۃ القدر کی رات طاق راتوں میں گردش کرتی رہتی ہے اور یہ فکس نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں کو وہم ہے کہ ستائیس کی رات لیلۃ القدر کی رات ہوتی ہے

حالانکہ ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔اور لیلۃالقدر کی ایک رات کی عبادت ایک ہزار مہینے یعنی 80 سال کی عبادت سے بہتر ہے، قرآن مجید نے یہ نہیں کہا کہ 80 سال کی عبادت کے برابر ہے بلکہ کہا کہ اس سے بہت بہتر ہے۔ تو اس رات میں جاگنے کا اہتمام کرے اور کچھ اعمال تو ہر طاق رات میں لازماً کرے کہ لیلۃالقدر کو پالینے کا آسان طریقہ ہے۔

مثال کے طور اگر ہر طاق رات میں ایک سو روپیہ صدقہ کرے گا تو یہ ایسا ہی ہے جیسے اس نے 80 سال صدقہ کیا۔اور اگر ہر طاق رات میں ایک سیپارہ تلاوت کرلے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے اس نے 80 سال قرآن مجید کے ایک سیپارے کی تلاوت کی۔اور اگر ہر طاق رات میں دو رکعت نفل نماز یا کوئی تسبیح پڑھ لے گا تو یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے اس نے 80 سال دو رکعت نفل نماز یا تسبیح پڑھی۔ تو بس خود بھی جاگیں اور اپنے گھر والوں کو بھی جگانے کا اہتمام کریں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی اہم ترین سنت ہے۔

لیلۃالقدر میں دعا

آج طاق رات ہے اور جمعہ کی رات بھی ہے لہذا عبادت اور دعا کا زیادہ اہتمام کریں کہ شاید یہی لیلۃالقدر کی رات ہو۔ لیلۃالقدر کی رات کی عبادت کی فضیلت تو ہے ہی، اس کی خاص بات یہ بھی ہے کہ اس رات میں اللہ عزوجل فیصلے بھی فرماتے ہیں۔ تو کوشش کریں کہ اس رات میں دعا میں خصوصی اہتمام ہو کہ اگلے سال بھر کے فیصلوں کے وقت آپ اپنے پروردگار کے سامنے اپنی طلب اور خواہش عاجزی اور انکساری کے ساتھ رکھ سکیں۔

دعا وہی جلد قبول ہوتی ہے کہ جو دل کی بے قراری اور بے چینی کے ساتھ ہو، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ﴾ [النمل: 62]
ترجمہ: یا اللہ کے علاوہ کون ہے جو بے چین اور بے قرار دل کی دعا قبول فرمائے جبکہ وہ اس کو پکارے اور وہ اس کی آزمائش ٹال دے۔اور ضروری نہیں ہے کہ اللہ سے آخرت ہی مانگی جائے بلکہ اللہ سے دنیا بھی مانگیں بلکہ اللہ نے دعا کا جو طریق کار سکھایا ہے، اس میں دنیا کو پہلے رکھا گیا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي

﴿الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ [البقرة: 201] ترجمہ: کہ اے اللہ، ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما۔

اگر دنیا کا سکون نہیں ہو گا تو آخرت کی تیاری میں بھی یکسوئی حاصل نہیں ہو پائے گی لہذا دنیا کا سکون بہت ضروری ہے۔ اور اللہ سے دنیا مانگنا دنیا داری نہیں ہے بلکہ اللہ عزوجل تو خود کہہ رہے ہیں: ﴿ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ [الأعراف: 32] ترجمہ: یہ دنیا کی نعمتیں اور رزق کس نے اللہ کے بندوں پر حرام کیا ہے؟ اللہ نے تو نے یہ نعمتیں خود سے اپنے بندوں کے لیے دنیا میں پیدا کی ہیں اور آخرت میں تو صرف اس کے بندوں ہی کو ملیں گی۔

پس اللہ سے جنت، مغفرت، دنیا، مال، روزگار، ملازمت، صحت، گھر، گاڑی، شریک سفر اور اولاد کی دعاء کریں کہ ان سب چیزوں کی محبت اللہ نے خود سے ان کے دل میں رکھ دی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ﴾ [آل عمران: 14] ترجمہ: اللہ عزوجل نے ہی انسانوں کے دلوں میں بیٹوں، عورتوں، سونے اور چاندی کے ڈھیروں، نشان زدہ گھوڑوں، جانوروں اور کھیتی کی خواہش اور محبت رکھ دی ہے۔

اور اللہ سے ایسے مانگیں کہ جیسے لے کر مصلے سے اٹھیں گے، اور مانگتے وقت اپنی ذلت، عاجزی اور کمزوری اور اللہ کی بڑائی، کبریائی اور عظمت کا تذکرہ کریں۔ اور اللہ سے ہر چیز مانگیں کہ اللہ کے ہاں کچھ ناممکن نہیں ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو 80 سال کی عمر میں بیٹا دے دیا جبکہ ان کی بیوی بانجھ تھی۔ اور یہ بھی ذہن میں رہے کہ دعا میں عجلت نہ کریں، دعا میں عجلت یہ ہے کہ دعا کو مکمل ہونے میں وقت لگتا ہے، وہ قبول تو فورا ہو جاتی ہے لیکن اس کے پورا ہونے میں بہر حال وقت لگے گا، اس وقت میں صبر کریں۔

البتہ یہ کر سکتا ہے کہ اگر دل زیادہ بے چین اور بے قرار ہو تو اللہ سے اپنی دعا کی

قبولیت کی نشانی مانگ لے اور انبیاء ایسا کر لیتے تھے جیسا کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے کہا: ﴿قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً قَالَ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَ لَيَالٍ سَوِيًّا﴾ [مریم: 10] ترجمہ: پروردگار، میرے ہاں بیٹا ہو گا، اس کی کوئی نشانی مجھے دکھادیں تو اللہ عزوجل نے کہا کہ آپ کی دعا کی قبولیت کی نشانی یہ ہے کہ آپ تین دن تک لوگوں سے کلام نہ کر سکیں گے جبکہ آپ تندرست بھی ہوں گے۔ تو دعا کے بعد اللہ کی طرف سے دل کا اطمینان اور سکون بھی دعا کی قبولیت ہی کی نشانی ہے، ان شاء اللہ العزیز۔

دعاء اور تقدیر

دوست کا سوال ہے کہ دعاء اور تقدیر کا آپس میں کیا اور کتنا تعلق ہے، کیا دعاء سے تقدیر بدل جاتی ہے؟ جواب: دیکھیں، تقدیر میں سب کچھ لکھا ہوا ہے، یہ بھی کہ یہ دعاء کرے گا تو اس کی آزمائش ٹل جائے گی یا اسے فلاں نعمت مل جائے گی، اس اعتبار سے جو بھی ہو رہا ہے یا ہونا ہے، وہ پہلے سے لکھا ہوا ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس ہونی یا انہونی کا سبب انسان کی دعاء ہوتی ہے۔

دوسرا یہ کہ آپ دعاء ضرور کریں لیکن اس کے ساتھ تدبیر بھی اختیار کریں، صرف تقدیر پر نہ چھوڑ دیں۔ تقدیر میں بھی یہ لکھا ہوتا ہے کہ یہ تدبیر کرنے سے اسے یہ ملے گا۔ بعض اوقات انسان کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف دعا پر یقین کر لیتا ہے اور محنت نہیں کرتا تو یہ درست نہیں ہے کہ انسان کو ایک چیز مل نہیں رہی ہوتی لیکن جیسے ہی اس کے لیے تدبیر کرتا ہے تو وہ مل جاتی ہے۔ اور بعض اوقات انسان اپنی محنت پر بھروسا کر لیتا ہے اور دعاء یا تقدیر پر یقین نہیں رکھتا تو یہ بھی درست نہیں ہے کہ انسان کو بعض اوقات بہت محنت کے باوجود بھی کوئی چیز نہیں ملتی اور یہ بہت عام ہے۔

تو مومن کا رویہ ان دو انتہاؤں کے بین بین ہوتا ہے کہ وہ تدبیر بھی کرتا ہے اور دعاء اور تقدیر پر بھروسا بھی رکھتا ہے۔ میں نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے کہ جنہیں کینسر کا مرض تھا لیکن وہ محض دعا سے صحت یاب ہو گئے تو ایسا ممکن ہے کہ دعاء سے کوئی انہونی ہو جائے اور یہ ہو جاتا ہے اور اس کے مشاہدات بہت عام ہیں لیکن یہ اللہ کا قاعدہ کلیہ

نہیں ہے۔ اللہ کی سنت یا ضابطہ ہ یہی ہے کہ انسان تدبیر اختیار کرے اور اللہ اس کے سبب سے اس کی تقدیر وضع کریں۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی تدبیر کے بغیر آپ کے حق میں کوئی تقدیر لکھی جائے تو اس کے لیے پھر اللہ کے سامنے بہت دعاء کرنی پڑے گی، بہت رونا پڑے گا کہ آپ آؤٹ آف داوے جا کر کوئی مطالبہ کر رہے ہیں، اور اس صورت میں بھی اللہ کا کوئی یقینی وعدہ نہیں ہے کہ وہ آپ کے لیے لازماً کوئی معجزہ کر ہی دکھائے گا بلکہ اس کی مرضی ہے کہ وہ محض دعاء سے آپ کی تقدیر بنا دے یا اس دعا کو دنیا میں تو قبول نہ کرے لیکن آپ کی آخرت کے لیے توشہ بنا کر رکھ چھوڑے۔

پروردگار کے سامنے مسلمانوں کی شکایتیں نہ لگاؤ!

یقیناً مسلمان موجودہ پستی، ذلت اور رسوائی سے اپنے مالک اور خالق کی مدد اور نصرت حاصل کیے بغیر نہیں نکل سکتے۔ اس وقت یہ امت ایک عجیب نفسیاتی کمپلیکس میں جا چکی ہے کہ یہ نصرت الٰہی کی انفرادی اور اجتماعی ہر قسم کی کوششیں کر چکے ہیں لیکن کہیں سے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے۔ اس امت کی حیثیت اس فرد کی سی ہو چکی ہے جو کسی آزمائش اور بیماری میں اپنے رب سے بہت دعائیں کرتا ہے لیکن اس کی آزمائش ختم نہیں ہوتی تو وہ اپنے رب سے تعلق میں عجیب قسم کے خلاء میں رہنا شروع کر دیتا ہے، اس کے لیے رحمان اور رحیم کے معانی سمجھنا مشکل ہو جاتے ہیں۔ اللہ عزوجل کی مدد بدر و حنین میں نازل ہوئی تھی اور اس شان سے نازل ہوئی تھی کہ ہم آج بھی اسے یاد رکھتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ آج ہم اس خالق اور مالک کی نصرت اور مدد سے محروم ہیں؟

بھئی، مجھے تو یہی سمجھ آ رہی ہے کہ اس وقت ہمیں اپنے رب کو راضی کرنے کی ضرورت ہے۔ اور راضی بھی یوں نہ کریں کہ مسلمانوں کی شکایتیں لگا لگا کر کہ یہ ایسے اور یہ ویسے یا ہم ایسے یا ہم ویسے یا ہم نے کچھ نہیں کیا۔ علامہ اقبال رحمہ اللہ کی شکوہ اور جواب شکوہ اب اس سوال کے پرانے جواب ہو گئے کہ آج بدر کی طرح فرشتے نازل کیوں نہیں ہوتے؟ اب ہمیں اللہ عزوجل کے سامنے اپنی شکایتیں نہیں، اپنے کام رکھ کر

اس کی مدد کا مطالبہ کرنا ہے۔

بس ہر مسلمان یہ کوشش کرے کہ تنہائی میں مصلے پر بیٹھ کر اپنے رب سے دعا گو ہو کہ اے پروردگار! ہم نے آپ کے دین کے لیے کیا نہیں کیا؟ ہم نے ہزاروں مدارس بنا دیے، لاکھوں علماء پیدا کر دیے، ہم نے تبلیغی جماعتیں بنا ڈالیں، ہم نے انقلابی تحریکوں کی بنیادیں رکھ دیں، ہم نے جہاد اتنا کیا کہ جہاد کے نام سے وحشت ہونے لگی۔ ہم نے خدمت خلق اتنی کی کہ دنیا میں کوئی اس کے برابر نہیں پہنچ سکتا، ہم نے بیت اللہ کو ایسے آباد کیا کہ تاریخ انسانی میں اتنا آباد نہیں ہوا ہو گا۔ ہم نے دنیا کے تمام مسلمانوں کے ایک امت ہونے کا وہ احساس بیدار کر دیا کہ ظلم شام پر ہوتا ہے تو دل پاکستان کا روتا ہے، ہم نے تزکیے والے بھی آپ کو دکھا دیے اور فکر اسلامی والے بھی۔

تو اب آپ کو ہم سے اور کیا چاہیے؟ ہم جو دے سکتے تھے، آپ کے دین کو دے دیا کہ ہم مخلوق ہیں اور مخلوق اپنے خالق کو اس سے زیادہ دے بھی کیا سکتی ہے؟ اب تو ہماری لینے کی باری ہے کہ آپ ہماری اسی طرح نصرت فرمائیں جیسا کہ بدر و حنین میں فرمائی تھی۔ مالک! آج اخبار میں اتنی سی سرخی لگ جائے کہ امریکہ اور روس، شام کے مسئلے میں بیٹھ رہے ہیں تو ساری امت کے دلوں میں امید کی ایک کرن بیدار ہو جاتی ہے کہ شاید مسلمانوں کے مسائل حل ہونے جا رہے ہیں۔ آج امریکی صدر اگر کشمیر کے مسئلے پر بات کرے تو لوگوں کی امیدیں بندھ جاتی ہیں کہ شاید کچھ بہتری آ جائے۔ پروردگار! یہ بھولے بھالے مسلمان آپ سے امیدیں کیوں توڑ بیٹھے؟ اسی لیے کہ آپ کی مدد دیکھے انہیں بہت عرصہ ہو چکا۔ یہ دل سے مانتے بھی ہوں کہ مسائل کا حل اللہ کے پاس ہے لیکن ان کی نظریں کہیں اور سے سکون حاصل کر رہی ہیں۔

یہ تو آپ کے ساتھ ان کے تعلق کا سوال ہے۔ پروردگار! اگر گناہ گار ہیں تو معاف فرما دے۔ بھٹکے ہوئے ہیں تو سیدھے رستے پر چلا دے۔ لیکن یہ اپنے حصے کا کام کر چکے۔ جو انہیں سمجھ تھی، وہ اسے لگا چکے اور اس کے نتائج بھی حاصل کر چکے۔ یہ تو آپ ہی کی جماعت ہے، آپ ہی ان کی مدد نہ فرمائیں گے اور ان کے رویوں کی شکایت کریں گے تو

پھر کون ان کی مدد کرے گا، کون ان کی اصلاح کرے گا؟

عشرہ ذی الحجہ اور قربانی کے فضائل

عشرہ ذی الحجہ سے مراد ذوالحجہ کے پہلے دس دن ہیں۔ اکثر لوگ ان کی فضیلت اور اہمیت سے غافل ہیں جبکہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں سال بھر کے دنوں میں افضل ترین دن قرار دیا ہے۔

صحیح بخاری کی ایک روایت کے مطابق ان دنوں میں جو نیک عمل کیا جاتا ہے، دوسرے دنوں میں کی جانے والی نیکی اس کے برابر نہیں ہو سکتی۔ صحابہ نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ کیا دوسرے دنوں میں اگر جہاد کی نیکی کی جائے تو وہ بھی ان دنوں کی عام نیکی کے برابر نہیں ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ہاں دوسرے دنوں کا جہاد بھی ان دنوں کی عام نیکی سے بڑھ کر نہیں ہے الا یہ کہ کوئی مجاہد اپنی جان اور مال سب کچھ اللہ کے رستے میں لٹادے تو پھر شاید ان دنوں کی نیکی کے برابر پہنچ سکتا ہے۔ تو ان دنوں میں نیکی کا اہتمام کرنا بہت ضروری ہے۔ اور ان دس دنوں میں آپ ﷺ روزہ رکھنے کا بہت اہتمام فرماتے تھے۔

صحیح مسلم کی روایت کے مطابق "یوم عرفة" کے روزے کے بارے آپ نے فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ اس سے اللہ عزوجل تمہارے ایک سال اگلے اور ایک سال پچھلے گناہ معاف فرمادیں گے۔

پس سال بھر کی راتوں میں رمضان کے آخری عشرے کی دس راتیں افضل ہیں جبکہ سال بھر کے دنوں میں عشرہ ذی الحجہ کے پہلے دس دن افضل ہیں۔ اسی طرح سال بھر کی راتوں میں افضل ترین رات "لیلۃ القدر کی رات" ہے جبکہ سال بھر کے دنوں میں افضل ترین دن "قربانی کا دن" ہے۔ سنن ابوداود کی ایک روایت کے مطابق افضل ترین دن "یوم النحر" یعنی قربانی کا دن ہے۔ اور اس دن میں افضل ترین عمل "قربانی کا عمل" ہے۔

پس سال بھر کے دنوں میں افضل ترین دن عشرہ ذی الحجہ کے ہیں۔ عشرہ ذی الحجہ

میں افضل ترین دن "قربانی کا دن" ہے۔ اور قربانی کے دن میں جتنے نیک عمل کیے جاتے ہیں مثلاً تلاوت، ذکر، صدقہ وغیرہ تو ان میں سے سب سے افضل عمل "قربانی کا عمل" ہے۔ صحیح مسلم کی روایت کے مطابق جو شخص قربانی کی نیت اور ارادہ رکھتا ہو تو ذی الحجہ کا چاند دیکھنے کے بعد اپنے بال اور ناخن نہ لے۔ اس سے اس کے قربانی کے عمل کا ثواب بڑھ جائے گا۔ سنن الترمذی کی روایت کے مطابق گائے میں سات اور اونٹ کی قربانی میں دس صحابہ نے شرکت کی۔

اگر کوئی شخص قربانی کرے تو نیت میں اپنے تمام گھر والوں کو بھی شامل کر لے تو ان سب کو اجر پہنچے گا، ان شاء اللہ جیسا کہ صحیح مسلم کی ایک روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ قربانی کا جانور ذبح کرتے وقت یہ دعا کرتے تھے: «بِسْمِ اللَّهِ، اللَّهُمَّ تَقَبَّلْ مِنْ مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ، وَمِنْ أُمَّةِ مُحَمَّدٍ» ترجمہ: اللہ کے نام سے، اے اللہ محمد ﷺ کی طرف سے قربانی قبول فرما، ان کے خاندان کی طرف سے اور محمد ﷺ کی امت کی طرف سے بھی۔

مستحب یہی ہے کہ قربانی کرنے والا اپنے جانور کو خود ذبح کرے کہ قرآن مجید میں ہے کہ دل کی جس کیفیت کے ساتھ جانور ذبح کی جاتا ہے، وہ کیفیت اللہ تک پہنچتی ہے۔ اس لیے جانور ذبح کرتے وقت یہی خیال کرے کہ اے پروردگار! یہ تو جانور تھا جو آپ کے رستے میں قربان کر دیا، اگر اپنی جان کی بھی ضرورت پڑی تو حاضر کر دوں گا۔ یا یہ خیال کرے کہ پروردگار! جس طرح اس جانور کو قربان کر دیا، اسی طرح اپنی خواہشات کو آپ کے لیے قربان کرنا پڑا تو دیر نہیں لگاؤں گا۔

شب براءت: احادیث مبارکہ کی روشنی میں ایک تجزیاتی مطالعہ

بہت سے دوستوں نے شب براءت کے حوالے سے پوچھا ہے کہ اس کی کیا حقیقت ہے؟ تو اس بارے راقم نے ایک مضمون مرتب کیا تھا جو ماہنامہ میثاق کے شمارہ ستمبر 2006ء میں پبلش ہوا تھا۔

اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اپنی مختلف کتابوں میں شعبان

اور شب براءت کی فضیلت کے حوالے سے جن روایات کو نقل کیا ہے، تو ان کی تعداد تقریباً 135 ہے۔ ان میں سے بعض روایات موضوع اور منگھڑت ہیں، بعض ضعیف ہیں اور بعض حسن اور صحیح بھی ہیں اگرچہ اکثر روایات ضعیف اور موضوع ہیں۔ اس مضمون میں احادیث کے بارے علامہ البانی رحمہ اللہ کی تحقیق پر اعتماد کیا گیا ہے۔

شب براءت کی رات کی نہ تو کوئی متعین عبادت صحیح روایات سے ثابت ہے اور نہ ہی اگلے دن کا روزہ لیکن اس رات کی مطلق فضیلت ثابت ہے اور وہ یہ کہ اس رات میں اللہ عزوجل اپنے بندوں کی مغفرت فرماتے ہیں لیکن دو لوگوں کی مغفرت نہیں ہوتی، ایک کافر اور مشرک کی اور دوسرا ان دو مسلمانوں کی جو کہ ایک دوسرے سے کینہ اور بغض رکھتے ہوں۔ اس قدر فضیلت کا ذکر ہمیں صحیح اور حسن روایات میں ملتا ہے۔

اس کے علاوہ جو روایات ہیں یعنی بقیع قبرستان کی زیارت کرنے والی روایت یا بنو کلب کی بکریوں سے زیادہ گناہ معاف کرنے والی روایت یا اس رات سو رکعت ادا کرنے والی روایت یا بارہ رکعت ادا کرنے والی روایت یا اگلے دن کا روزہ رکھنے والی روایت وغیرہ تو یہ ضعیف اور موضوع روایات ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے مذکورہ بالا مضمون متعلقہ مجلہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

کبار اہل حدیث علماء میں سے مولانا عبد الرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ نے ترمذی کی شرح "تحفة الأحوذي" اور مولانا عبید اللہ مبارکپوری رحمہ اللہ نے مشکوۃ کی شرح "مرعاة المفاتيح" میں لکھا ہے کہ پندرہ شعبان کی رات نہ تو لیلۃ القدر کی طرح فضیلت والی رات ہے اور نہ ہی عام راتوں کی طرح کی کوئی رات ہے بلکہ اس رات کی مطلق فضیلت بعض روایات سے ثابت ہے۔ اور یہی اس بارے معتدل موقف ہے۔

خیال کی لذت

دوست کا سوال ہے کہ میں خیال کی لذت (lust) سے کیسے بچ سکتا ہوں، مجھے بہت زیادہ خیالات آتے ہیں؟ جواب: خیال کی لذت یا شہوانی خیالات ایک عمومی مسئلہ ہے کہ جس کا ہم سب زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے میں شکار ہوتے ہیں۔ شاید یہی وہ گناہ

ہے کہ جس کے بارے حدیث میں آتا ہے کہ اسے انسان کی تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے۔
صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ اللہ عزوجل نے ابن آدم کی تقدیر میں زنا کا کچھ نہ کچھ حصہ لکھ دیا ہے کہ جس کا ارتکاب وہ کر کے رہے گا، اور آنکھ کا زنا فحش کا دیکھنا ہے، اور زبان کا زنا فحش کا بولنا ہے۔
تو زنا کی دو قسمیں ہیں؛ ایک حقیقی اور دوسرا مجازی یعنی آنکھ، کان، زبان اور خیال کا زنا وغیرہ کہ جس کا ذکر اوپر حدیث میں ہے۔ حقیقی سے بچنا ممکن ہے اور مجازی انسان کی تقدیر ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان کو اس سے بچنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے یا انسان اس سے بچ نہیں سکتا۔ انسان اس سے بچ بھی سکتا ہے اور بچنے کی کوشش بھی کرنی چاہیے اور شریعت نے ان دونوں کاموں کا حکم دیا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا﴾ [الإسراء: 32] ترجمہ: زنا کے قریب بھی مت جاؤ، تو قریب جانے سے مراد یہی مجازی زنا ہے۔ حدیث کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ مجازی زنا کی وجہ سے اپنی اصلاح سے مایوس نہ ہو جائے بلکہ ہمت کرتا رہے۔
شہوت والے خیالات کی بڑی وجہ تو جبلی ہے اور اس کا علاج یہی ہے کہ شادی کر لے۔ اور اب اگر اسے ایسے خیالات آئیں گے بھی تو اپنی بیوی کے بارے آئیں گے اور اس میں حرج نہیں ہے۔ لیکن کچھ لوگوں کا ایمانی لیول شاید اتنا کمزور ہو کہ انھیں شادی سے بھی افاقہ نہ ہو اور انھیں اپنے نفس پر اتنا کنٹرول نہ ہو کہ کسی شہوانی خیال کا رخ کسی غیر محرم عورت سے اپنی بیوی کی طرف موڑ سکیں، تو ان کا علاج کیا ہے؟ حدیث میں ہے کہ جب تمہیں کوئی عورت اچھی لگے یا اس کا خیال تمہارے دل میں کھب جائے تو تم اپنی بیوی کے پاس آؤ، اس سے اس کا خیال تمہارے دل سے جاتا رہے گا۔ تو خیال کی جو وجہ تھی یعنی شہوت، آپ ﷺ نے اسے حلال طریقے سے پورا کرنے کا حکم دیا، تو جیسے ہی وہ وجہ ختم ہوئی تو خیال بھی جاتا رہا۔
دوسرا یہ کہ اگر کسی کو شادی کی استطاعت نہیں ہے تو وہ کثرت خیال سے کیسے جان چھڑائے؟ اس کا مناسب حل مصروفیت ہے، اپنے آپ کو مصروف کر لیں، اسکرین پر

نہیں، دوستوں میں، فیملی میں، اور کچھ نہ ہو سکے تو کسی پارک میں نکل جائیں۔ اور اگر کسی کا خیال بار بار اور تکرار سے آئے تو اگر اس سے شادی کی کوئی صورت نکلتی ہے تو کر لیں، اور اگر نہیں نکلتی تو پھر نماز کے بعد تشہد کی حالت میں بیٹھیں، آنکھیں بند کریں، یکسو ہو جائیں، اور اکیس مرتبہ یہ ورد کریں کہ اللہ مجھے اس سے دور کر دے اور اسے مجھ سے دور کر دے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دعا کرتے وقت آپ کا دل دہائی دے رہا ہو کہ یا اللہ! یہ دعا تو قبول نہ ہی ہو تو اچھا ہے لیکن دعا جاری رکھیں کہ اسی میں آپ کی فلاح ہے، دنیا کی بھی اور آخرت کی بھی۔

اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو ساتھ ہی اپنی بیوی کے بارے یہ وظیفہ بھی اکیس مرتبہ کریں کہ اللہ مجھے اس سے قریب کر دے اور اسے مجھ سے قریب کر دے۔ یہ وظیفہ نفسیاتی حل کے طور بتلایا ہے، اسے کلینیکل سائیکالوجی کی روشنی میں دیکھیں، نہ کہ مذہبی اصولوں کے تناظر میں۔ اور اکیس کے عدد کی سائیکالوجی میں ایک خاص اہمیت ہے یعنی لاشعور کو کوئی پیغام پہنچانے کے اعتبار سے۔ اور شہوانی خیالات کا مصدر بعض اوقات شیطان ہوتا ہے اور بعض اوقات انسان کا اپنا نفس، اس لیے تعوذات اور معوذتین کا پڑھنا بھی ان خیالات کو دفع کرنے میں مفید ہے۔

گناہ کے خیال اور میلان سے بچنے کی تدبیر

دوست کا سوال ہے کہ گناہ کے خیال یا اس کی طرف میلان سے کیسا بچا جائے۔

جواب: گناہ کے خیال یا اس کے طرف مائل ہونے سے بچ جانے کی بہت سی تدابیر ہو سکتی ہیں کہ جن میں سے ایک بہترین تدبیر دعا بھی ہے۔ گناہ کا خیال یا اس کی طرف میلان کی وجہ یا تو انسان کا اپنا نفس ہوتا ہے یعنی انسان کی کوئی نفسانی خواہش یا پھر اس کی وجہ شیطان کا وسوسہ ہوتا ہے کہ جس نے انسان کو گمراہ کرنے کی قسم اٹھا رکھی ہے اور وہ ہر وقت انسان کے دل ودماغ میں گناہ کے خیالات پیدا کرنے میں ہی لگا رہتا ہے۔

تو انسان کا نفس یا شیطان، دونوں کا مالک تو پروردگار ہی ہے۔ بس جب ان میں سے کسی ایک سے بھی کوئی تکلیف اور اذیت محسوس کرے تو ان کے مالک کو پکارے۔ بہت

سادہ سی بات ہے کہ اگر کوئی کتا آپ پر حملہ کردے تو ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ خود سے اس کا مقابلہ کریں اور اس میں شاید آپ ہار بھی جائیں۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ کتے کے مالک کو آواز دیں کہ اسے باندھ کر رکھے تا کہ آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچائے، ایسے میں اس کتے کے نقصان سے بچ جانا یقینی ہے۔

ہمارے احوال میں سے کوئی حال ایسا نہیں ہے کہ جس کے بارے رسول اللہ ﷺ کی دعاؤں میں کچھ منقول نہ ہو، اور یہ بہت حیرت انگیز بات ہے۔ سالک کی اس کیفیت اور حالت کے لیے رسول اللہ ﷺ کی ایک بہت ہی پیاری دعا منقول ہے، بس اس کو اس حال میں حرز جان بنائے اور اس کے معانی میں غور کرے، اور اس کے پڑھنے کے باوجود اگر گناہ کا خیال یا میلان ترک نہ ہو تو بھی اس کو بطور وظیفہ جاری رکھے، ان شاء اللہ! کچھ عرصے میں حالت اور کیفیت بدل جائے گی۔

اللّهُمَّ عالِمَ الغَيْبِ وَالشّهادَةِ فاطِرَ السّماواتِ وَالأَرْضِ رَبَّ كلِّ شَيءٍ وَمَليكَه، أَشْهَدُ أَنْ لا إِلهَ إِلاّ أَنْت، أَعوذُ بِكَ مِن شَرِّ نَفْسي وَمِن شَرِّ الشَّيْطانِ وَشِرْكِه، وَأَنْ أَقْتَرِفَ عَلَى نَفْسي سوءاً أَوْ أَجُرَّهُ إِلى مُسْلِم. [سنن أبو داود]

"اے اللہ! غیب اور حاضر کے جاننے والے، زمین اور آسمانوں کو پیدا کرنے والے، ہر چیز کے رب اور اس کے مالک، میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سواء کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے، اے مالک! میرے نفس کی شرارتوں سے مجھے بچا کر اپنی آغوش میں لے لے، اے مالک! شیطان اور اس کے چیلوں کے شر سے مجھے محفوظ رکھ، اے مالک! مجھے اس سے بچالے کہ میں کسی گناہ میں پڑ جاؤں، اور اس سے بھی بچالے کہ میں کسی مسلمان کو گناہ میں مبتلا کر دوں۔"

گناہ کی عادت کو ترک کرنے کی تدبیر

احمد جاوید صاحب سے سوال ہوا کہ اگر کسی گناہ کی عادت ہو یا وہ گناہ طبیعت کا حصہ بن جائے تو اسے ترک کرنے کی کیا تدبیر ہے؟ انہوں نے سائل کو دو کاموں کے اہتمام کا مشورہ دیا: ایک نیک لوگوں کی صحبت میں اٹھنا بیٹھنا اور دوسرا اپنے سجدے کو لمبا کرنا۔

ان دو مشوروں میں غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ نیک لوگوں کی صحبت سے ان کی محبت پیدا ہو گی اور اس محبت کی وجہ سے معصیت کی طلب کم ہو گی اور خواہش کمزور پڑ جائے گی۔ اور سجدے کو لمبا کرنے سے اللہ کے قرب میں اضافہ ہو گا اور یہ قرب، معصیت سے دوری کا ذریعہ بن جائے گا۔

دوست نے سوال کیا ہے کہ نفس کو کنڑول کیسے کیا جائے، نماز پڑھنا چاہتا ہوں لیکن کبھی تین پڑھ پاتا ہوں اور کبھی چار۔ ایک دوسرے دوست نے سوال کیا کہ فحش ویڈیوز دیکھنے سے بچنا چاہتا ہوں لیکن کبھی بچ پاتا ہوں اور کبھی دیکھ لیتا ہوں؟

جواب: نفس کے بارے ایک اہم بات ذہن میں رہے کہ یہ آپ کا اپنا ہے اور اپنا نہیں بھی ہے۔ یہ آپ کا دوست بھی ہے اور دشمن بھی۔ اس میں ایک ضدی بچے سے لے کر ظالم دشمن تک کے تمام کردار موجود ہیں کہ جنہیں یہ بخوبی نبھاتا رہتا ہے۔ اس کا مقصد آپ کو گرانا نہیں بلکہ اپنا آپ منوانا ہے لہذا کچھ حکیمانہ تدابیر اختیار کر کے اسے با آسانی کنڑول کیا جا سکتا ہے۔

ایک تدبیر تو یہ ہے کہ اگر آپ اپنے فرائض کی حفاظت چاہتے ہیں تو سنن کا اہتمام کریں، سنن کی حفاظت چاہتے ہیں تو نوافل کا اہتمام کریں۔ اس کو سمجھنا بہت آسان ہے کہ اپنے ارد گرد فرائض، سنن اور نوافل کے حصار بناتے چلیں جائیں کہ آپ کا دشمن شیطان اگر حملہ آور ہو گا تو سب سے باہر والا حصار متاثر ہو گا۔ اگر آپ نے شیطان سے حفاظت کے لیے اپنی ذات کے گرد حصار ہی صرف فرائض کا بنایا ہے تو اس کا حملہ ہی فرائض پر ہو گا اور متاثر بھی فرائض ہی ہوں گے۔

مثال کے طور اگر آپ تکبیر اولی کا اہتمام کرنے والے ہیں تو کبھی وہ رہ جائے گی لیکن جماعت مشکل سے ہی رہے گی۔ اور اگر آپ جماعت کی نماز کا اہتمام کرنے والے ہیں تو کبھی وہ رہ جائے گی لیکن نماز مشکل سے ہی قضاء ہو گی۔ اور اگر آپ بس نماز وقت پر پڑھنے کا اہتمام کرتے ہیں، تو کبھی نماز قضاء ہو جائے گی اور کبھی اداء۔ اور اگر آپ صرف

نماز پڑھنے کا اہتمام کرتے ہیں تو کبھی نماز چھوٹ ہی جائے گی۔ بہت آسان ہے کہ اگر تہجد کے چھوٹنے پر افسوس کرنے والوں میں شامل ہیں تو ان شاءاللہ، نماز قضاء ہونے پر افسوس کرنے والوں میں سے نہیں ہوں گے۔

اسی طرح کی تدبیر معصیت میں بھی اختیار کریں۔ اگر فحش ویڈیوز سے بچنا چاہتے ہیں تو موویز اور ڈرامے دیکھنے بالکل بند کر دیں۔ اگر موویز اور ڈراموں سے بچنا چاہتے ہیں تو وقت گزاری کے لیے مزاحیہ ٹاک شوز وغیرہ دیکھنا بند کر دیں۔ اور ایسا مستقل طور کریں، تو ضرور فائدہ ہو گا، ان شاءاللہ۔ اب اگر شیطان کا حملہ ہو گا بھی تو سب سے باہر والے حصار پر۔

دوسرا یہ کہ اپنے نفس کو یہ احساس دلاتے رہیں کہ اس کی مانی جا رہی ہے، یہ بہت ضروری ہے ورنہ تو وہ آپ کو گرانے کی پوری کوشش کرے گا اور اگر وہ اس کوشش میں لگ گیا تو گرنا آپ ہی کا مقدر ہے، اس کا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی چھوٹی چھوٹی خواہشات پوری کرتے رہیں تاکہ اسے اپنے غالب ہونے کا احساس باقی رہے۔ اگر نماز پڑھنے کو دل نہیں کر رہا تو اسے یہ کہیں کہ چلو پڑھ لو، اس کے بعد تجھے آئس کریم کھلاتا ہوں یا وہ کھلا دیں کہ جس سے وہ خوش ہوتا ہو، بس اسے یہ احساس ہو جائے کہ اس کی مانی گئی ہے۔ بھئی، یہ اپنی منوانے کے معاملے میں بیگم سے کم نہیں ہے، اچھی طرح سمجھ لو۔ اب بیوقوفوں کی طرح اس کی ہر بات مان لو یا اسے لولی پاپ دیتے رہو، یہ تمہاری عقلمندی اور سمجھداری پر منحصر ہے۔

شیطان کی چال

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے ایک کتاب لکھی، "تلبیس إبلیس" کے نام سے یعنی شیطان کا جال۔ اس کتاب میں انہوں نے مختلف طبقات مثلاً علماء، صوفیاء، مجاہدین، قراء وغیرہ کو شیطان کس طرح گمراہ کرتا ہے، اس پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر بہت ہی عمدہ کتاب ہے۔

شیطان کے بارے ہمیشہ ذہن میں رکھیں کہ وہ بہت ذہین ہے یا ایک معاملے میں کم

از کم بہت ذہین واقع ہوا ہے اور وہ انسان کو گمراہ کرنے کا معاملہ ہے۔ جیسے عورتیں گھریلو سیاست میں ذہین ہوتی ہیں کہ یہ ان کا میدان ہے تو اسی طرح شیطان گمراہ کرنے میں ذہین ہوتا ہے کہ دن رات اس کا یہی کام ہے۔ شیطان کی پیروی سے بچنے کے لیے تقوی کے ساتھ ذہانت کی بھی ضرورت ہے کہ شیطان اکثر مذہبی ذہن کو مذہب کے نام پر الجھن میں ڈالتا ہے۔

آجکل مذہبی لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے شیطان کی چالیں کیسی ہوتی ہیں مثلاً ایک انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی زبان کو ذکر سے تر رکھے تو شیطان اس کو کبھی وسوسہ ڈالے گا کہ بہت گناہ گار ہے، استغفار پڑھ۔ تھوڑی دیر بعد اس کے ذہن میں خیال ڈالے گا کہ زیادہ بہتر ہے کہ درود شریف کا ورد کیا کرو کہ اللہ کی رحمت بھی نازل ہو گی۔ کچھ دیر بعد اسے کہے گا کہ اللہ کے تجھ پر اتنے انعامات ہیں تو کچھ ان کا شکر بھی ادا کر لو۔ اب انسان اسی سوچ میں الجھ جائے گا کہ میں استغفار کروں، درود شریف پڑھوں یا تسبیح و تہلیل کو ترجیح دوں، الجھن آگے آجائے گی اور ذکر پیچھے رہ جائے گا۔

وہ مدرسہ کے ایک استاذ کے ذہن میں یہ بات ڈالے گا کہ دینداروں کو دین دار بنانا بھی کرنے کا کوئی کام ہے، کام کرنے کا میدان تو یونیورسٹی کا ہے، وہاں جا کر دین کا کام کرنا چاہیے۔ اور جو مدرسے کا فارغ یونیورسٹی پہنچ جائے گا، اسے وہ یہ وسوسہ ڈالے گا کہ یہاں تو اتنی بے حیائی ہے، نہ ہی طلبا میں دین کا شوق ہے تو بے طلبوں کو پڑھانے کا کیا فائدہ؟ قربانی دو اور مدرسہ میں جا کر پڑھاؤ۔

اور یونیورسٹی میں گریجویشن کرنے والے کے دل میں وسوسہ ڈالے گا کہ دنیاوی تعلیم کس کام کی؟ اسے درمیان میں چھوڑو اور مدرسہ جوائن کرو۔ مدرسہ کے طالب علم کے دل میں وسوسہ ڈالے گا کہ اگر دین کا کام کرنا چاہتے ہوں تو جدید تعلیم ہونی چاہیے لہذا مدرسہ چھوڑو اور یونیورسٹی جوائن کرو۔ یا وہ مدرسہ کے ایک طالب علم کے دل میں وسوسہ ڈالے گا کہ یہاں کے استاذ اچھے نہیں ہیں، دوسرے مدرسہ میں جانا چاہیے، وہاں بہت اچھی پڑھائی ہے۔

وہ تبلیغی کے ذہن میں یہ بات ڈالے گا کہ سوشل میڈیا پر تبلیغ کرو کہ ساری دنیا تو وہاں بیٹھی ہے۔اور سوشل میڈیا پر بیٹھے ہوئے کو کہے گا کہ اب فیس بک پر کیا خاک تبلیغ ہو گی، تبلیغ تو میدان میں جا کر دھکے کھانے سے ہوتی ہے۔وہ اسلامی تحریک کے کارکن کے ذہن میں یہ بات ڈالے گا کہ تمہاری زیادہ ضرورت تزکیہ نفس کے لیے بیعت ہونا ہے۔اور رہا بیعت ہونے والا مرید، تو اسے وہ نہیں چھیڑتا جیسا کہ کچھ اور لوگوں کو بھی نہیں چھیڑتا کہ وہ اپنے آپ سے مطمئن ہیں۔اور یہ انہیں چھیڑتا ہے جو اپنے آپ سے مطمئن نہ رہتے ہوں۔ بھئی،واقعی میں کوئی دین کا کام کرنا چاہتے ہو تو جس حالت میں ہو، اسی میں سب سے بہتر کام کر سکتے ہو،بس احسان پیدا کرلو اور مریدوں والا اطمینان۔

قلب کا جاری ہونا

دوست کا سوال ہے کہ قلب جاری کرنا کیا سنت سے ثابت ہے؟ جواب: قلب جاری کرنا متاخرین صوفیاء کی اصطلاح ہیں، متقدمین صوفیاء کے ہاں ایسی بدعت نہ تھی۔ بدعت اس کو اس لیے کہا ہے کہ نہ تو کتاب وسنت میں قلب جاری کروانے کا کوئی حکم موجود ہے اور نہ ہی خیر القرون، سلف صالحین، فقہاء، محدثین، متکلمین اور متقدمین صوفیاء میں کہیں بھی آپ کو یہ پریکٹس نظر آتی ہے۔

بھئی، آپ نے کیا قلب جاری کر لینا ہے، وہ تو پہلے ہی جاری ہے، کیوں لوگوں کو دھوکے میں ڈالا ہوا ہے،اس بیچارے کا قلب جاری ہے تبھی تو زندہ ہے، زندہ کا قلب جاری کرنا بھی کوئی کام ہے بھلا،ذرہ مردے کا قلب جاری کرو تو ہم بھی مانیں کہ کوئی فن ہے اور کوئی فنکار ہے۔

اچھا کہتے ہیں کہ آپ کو تو پتہ ہی نہیں، قلب جاری ہونا کسے کہتے ہیں؟ بھئی، ہمیں خوب پتا ہے کہ قلب جاری ہونا کسے کہتے ہیں کہ ہم نے جاری قلبوں کا مشاہدہ کیا ہوا ہے۔ ایک مرتبہ ایک دوست کسی بزرگ سے ملوانے لے گئے،ان کی مسجد میں ایک صاحب تھے جو کہ سلسلہ سیفیہ سے حال ہی میں بیعت ہوئے تھے اور ان کا قلب جاری تھا۔اور اس کے جاری ہونے کی کیفیت یہ تھی کہ انہوں نے سینے سے کپڑا اٹھایا تو ان کے قلب کی

شدت حرکت کی وجہ سے ان کا پورا سینہ گویا کہ ہلتا تھا۔

یہ دھک دھک بھی کیا خوب قلب کا جاری ہونا ہوا، ایسا قلب تو کوئی حسینہ بھی جاری کر سکتی ہے تو کیا اس سے بیعت فرما لیں۔ بعض اوقات کسی کا تصور ہی آپ کے دل کی دھڑکن کو تیز کر دیتا ہے، سانس کو پھلا دیتا ہے، دل میں درد اور سوز و گداز پیدا کر دیتا ہے، اور محبت تو نام ہی درد کا ہے۔ تو اگر قلب جاری ہونے کی وجہ اللہ کی محبت ہوئی اور اس کی کیفیت وہ درد ہوا جو دل میں پیدا ہوتا ہے تو یہ کیفیت تو عام محبوب کے بارے بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

استاذ محترم عبد الرحمن مدنی صاحب فرماتے ہیں کہ ان کی اہل حدیث صوفی بزرگ عالم دین مولانا محمد لکھوی رحمہ اللہ سے مدینہ میں ملاقات ہوئی تو لکھوی صاحب رحمہ اللہ نے کہا کہ قلب جاری ہونا بہت ضروری ہے۔ مدنی صاحب کہتے ہیں کہ میں نے ان سے کہا کہ پھر میرا بھی جاری کر دیں۔ تو لکھوی صاحب رحمہ اللہ گھنٹہ ڈیڑھ بھر لگے رہے یہاں تک کہ پسینوں پسینے ہو گئے اور آخر میں تھک ہار کر کہنے لگے کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر اثر نہیں ہوتا۔

مدنی صاحب کہتے ہیں کہ میں نے لکھوی صاحب رحمہ اللہ کو تو نہیں بتلایا کہ وہ بزرگ ہیں، ناراض ہو جائیں گے، آپ کو بتلا دیتا ہوں کہ میں دل میں مسلسل آیت الکرسی پڑھ رہا تھا، مجھے یہ پتا تھا کہ اگر قلب جاری ہونا کوئی رحمانی حال ہوا تو آیت الکرسی اس میں ہر گز رکاوٹ نہیں بنے گی لیکن اگر شیطانی حال ہوا تو رکاوٹ بن جائے گی۔

البتہ اگر تو قلب جاری ہونے سے مراد قلب کے وہ احوال ہیں جو اللہ کی کتاب میں بیان ہوئے ہیں تو یہ بات درست ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ﴾ [الحدید: 16] ترجمہ: کیا اہل ایمان کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد اور جو حق بات نازل ہوئی اس کے سبب سے جھک جائیں۔ اسی طرح قرآن مجید کی سماعت سے اہل ایمان کے دلوں کا نرم پڑ جانا وغیرہ تو یہ وہ قرآنی کیفیات قلبی ہیں جو رحمان کی طرف سے ہیں۔

زندگی سے بیزاری

دوست کا سوال ہے کہ بعض اوقات انسان زندگی سے اچاٹ اور بیزار ہو جاتا ہے، زندہ رہنے میں اور اس مادی دنیا میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ جاتی۔ ایسے میں جنت اور اللہ سے ملاقات کا شوق اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ انسان نہ چاہتے ہوئے اللہ سے یہ دعا کرنے لگ جاتا ہے کہ اسے اب اس دنیا میں نہیں رہنا، اسے اپنے رب سے ملنا ہے، اپنے خالق کو دیکھنا ہے، جنت میں رہنا ہے، اپنے مالک کے ساتھ وغیرہ وغیرہ

یہ کیفیت تو بہت خوب ہے، بہت اچھی ہے، اگر کبھی کبھار پیدا ہو تو، اور اگر مستقل ہو تو پھر اچھا نہیں ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کو ایسی کیفیات سے واسطہ پڑتا ہے؛ دنیادار کو بھی اور دیندار کو بھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک دنیادار شخص اپنے اندر کے روحانی خلاء کی وجہ سے مادی دنیا سے بیزاری محسوس کرے گا تو ایک دیندار اللہ کے قرب کی منازل طے کرتے ہوئے درمیان میں کوئی رکاوٹ محسوس کرتا ہے جو عموماً دنیا ہی ہوتی ہے تو اس کے دل میں آخرت کی کشش اور محبت شدت اختیار کر جاتی ہے اور دنیا سے بیزاری بڑھ جاتی ہے۔

اور بعض اوقات اس کیفیت کو صوفیاء کے ہاں قبض کہا جاتا ہے کہ جس میں دل بند ہو جاتا ہے، قلب ہر چیز سے اچاٹ اور بیزار ہو جاتا ہے اور اس کے علاج کے طور سورہ انشراح کی تلاوت تجویز کی جاتی ہے۔ یا اللہ سے دعا کرے کہ اس کیفیت پر اجر عطاء فرمائے لیکن اس کیفیت پر گھبرانا نہیں چاہیے کیونکہ یہ بسط یعنی دل کی خوشی اور کشادگی کا دروازہ ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں بھی ایسی کیفیت کا تذکرہ روایات میں ملتا ہے کہ جب پہلی وحی کے بعد وحی کے نزول میں کچھ انقطاع آ گیا تو آپ زندگی سے بیزاری محسوس کرتے تھے لیکن یہ کبھی کبھار اور عارضی ہوتا ہے۔ اسے آزمائش سمجھ لے یا اللہ کے قرب کی منازل طے کرنے کا زینہ اور سیڑھی سمجھ لے تو یہی اطمینان کے لیے کافی ہے۔ اور آپ ﷺ کی بیزاری کی وجہ یہی تھی کہ وحی زندگی اور حیات ہے اور جب اس کا

آنا کچھ عرصہ بند ہو گیا تو زندہ رہنے کی خواہش بھی ماند پڑ گئی۔

دوسری بات یہ کہ رویے اصل میں دو ہیں؛ ایک یہ کہ اللہ کے لیے مر جانا اور دوسرا اللہ کے لیے زندہ رہنا کہ پہلے کو صوفیاء فناء کہتے ہیں اور دوسرے کو بقاء کہتے ہیں۔ شریعت کے مطالعہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عام حالات میں دوسرا کام یعنی بقاء باللہ زیادہ اہم ہے کہ اس میں زیادہ مجاہدہ ہے جبکہ کچھ مخصوص حالات میں فناء فی اللہ یعنی شہادت کا درجہ زیادہ ہے۔ پس اس بیزاری کی کیفیت کا حل یہ بھی ہے کہ اس کے لیے زندگی میں کچھ مقاصد (goals) متعین کر لے کہ یہ کرنا ہے اور یہ کرنا ہے، پوری زندگی کے لیے بھی، اور ہر سال کے لیے بھی، اس سے دوسری کیفیت غالب آنا شروع ہو جاتی ہے۔

اسی طرح جب انسانی طبیعت پر دعوت تبلیغ، درس وتدریس اور اصلاح معاشرہ کا رجحان غالب ہو تو سالک میں اللہ کے لیے باقی رہنے کی خواہش بڑھ جاتی ہے اور اگر عبادت، نوافل، اور ذاتی اصلاح اور تزکیہ کی طرف توجہ زیادہ ہو جائے تو اللہ کے لیے مر جانے کی خواہش بڑھ جاتی ہے لہذا اپنی ایکٹوٹی کو تھوڑا سا تبدیل کر کے دیکھ لیں کہ عبادت سے زیادہ دعوت کو وقت دیں تو اس سے بھی یہ کیفیت کم ہو جائے گی لیکن اس کیفیت کو ختم نہیں ہونے دینا چاہیے، ورنہ اپنی اصلاح رک جائے گی۔ پس خلاصہ یہ ہے کہ اس کیفیت کو نعمت سمجھے لیکن حد سے بڑھنے نہ دے۔

علاوہ ازیں زندگی سے بیزاری کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ آپ کی دنیاوی خواہشات پوری ہو چکیں مثلاً شادی ہو گئی، بچے ہو گئے، ملازمت اچھی ہے، گھر بار بھی ہے، اللہ کے فضل سے کوئی بیماری اور بڑی آزمائش نہیں ہے تو ایسے میں انسان سمجھتا ہے کہ جیسے اس کی زندگی کا مقصد پورا ہو گیا ہو کیونکہ یا تو اس کی زندگی میں کوئی دینی مقصد نہیں تھا اور جو دنیاوی بھی تھا تو وہ بھی بہت چھوٹا تھا لہذا جیسے ہی پورا ہوا وہ دنیا سے بیزاری محسوس کرنے لگ گیا۔ اس کا حل یہی ہے کہ دینی مقاصد کو شعوری طور مقصد زندگی بنائے اور خاص طور بڑے بڑے دینی مقاصد کو۔ اور بعض اوقات زندگی سے بیزاری کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ آپ کی کوئی شدید دلی خواہش پوری نہیں ہو پا رہی ہوتی، ایسی خواہش

کہ جو آپ کے لیے زندگی کا مقصد بن چکی ہو تو آپ زندگی سے بیزاری محسوس کرنے لگتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

قرآن مجید کا اثر

دوست کا سوال ہے کہ قرآن پڑھتا ہوں لیکن کوئی اثر نہیں پڑتا جبکہ قرآن کا بیان ہے کہ اس کی تلاوت سے ایمان بڑھ جاتا ہے۔ اور یہ بھی قرآن میں ہے کہ اگر یہ قرآن پہاڑوں پر نازل کیا جاتا تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتے تو انسان پر اس کا اثر کیوں نہیں پڑتا؟ بس رسمی سی تلاوت ہے جو ہم کبھی کبھار کر لیتے ہیں، کبھی صرف تلاوت اور کبھی ترجمہ قرآن کے ساتھ بھی۔ اور کبھی کچھ تھوڑا بہت اثر ہو بھی جاتا ہے لیکن ویسے نہیں ہوتا جیسا کہ ہونا چاہیے۔

یہ بہت اہم سوال ہے اور اس کا جواب قرآن ہی کی روشنی میں یہ ہے کہ انسانی دل پتھروں کی طرح سخت ہو جاتے ہیں کہ وہ قرآن کے اثر کو قبول نہیں کرتے جیسا کہ سورۃ البقرۃ کی آیت 74 میں ہے۔ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق قرآن مجید کی وحی کو بارش کے پانی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اب بارش کے پانی میں نفع ہی نفع ہے، فائدہ ہی فائدہ ہے لیکن یہ فائدہ صرف وہی زمین اٹھاتی ہے جو کہ بارش کے پانی کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو لہذا بارش کے پانی سے نرم زمین کو فائدہ ہو گا اور وہ پانی کو جذب کرنے کے بعد خوب پھل پھول، اناج اور غلہ اگائے گی اور اگر زمین پتھریلی ہو گی تو بارش کا پانی اسے کچھ فائدہ نہ دے گا۔

بس ہمارے کرنے کا جو کام ہے، وہ یہ ہے کہ ہم اپنے قلب یعنی دل کی زمین کو نرم کریں تا کہ قرآن اور وحی کے اثرات اس میں جذب ہو سکیں۔ اب دل کی زمین کے نرم ہونے کے کچھ اسباب فطری ہیں کہ جن میں سے ایک آزمائش بھی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کے ساتھ کوئی نہ کوئی آزمائش لگی ہوئی ہے، اور کچھ نہ سہی تو ایک بچہ ہی اپنے والدین کے تین سال لے جاتا ہے کہ کبھی صبح ہسپتال کا چکر اور کبھی شام، کبھی دن کی بے آرامی اور کبھی رات کا جاگنا۔ اور آزمائش کی تو بیسیوں صورتیں ہیں کہ جن میں انسان

کا دل نرم ہو جاتا ہے۔

پس اب زمین تیار ہے اور جو کرنے کا کام ہے، وہ یہ کہ اللہ کی طرف متوجہ ہونا ہے تو اب وحی کے اثرات دل کی زمین میں جذب ہوں گے۔ اور یہ کر کے دیکھ لیں کہ اگر آپ اپنے بچے کے لیے ہسپتال میں مارے مارے پھر رہے ہیں تو اس حالت میں صرف سبحان اللہ اور الحمد للہ کے الفاظ آپ کو اللہ کے جتنا قریب کر دیتے ہیں، اتنا شاید عام حالات میں ایک تہائی رات کا قیام بھی آپ کے دل میں اثر نہیں ڈالے گا۔ تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آزمائش کے حالات کو بے صبری سے ضائع نہ کریں بلکہ اللہ کے قریب ہونے کا سبب بنا لیں اور قرآن اور وحی کا اثر قبول کرنے کا ذریعہ بنا لیں۔

پھر دل کی نرمی کے لیے کوئی مصنوعی مشق مثلاً میڈیٹیشن وغیرہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے بلکہ صرف اتنا کر لیں کہ کبھی کبھار اکیلے میں قبرستان کی زیارت کر لیا کریں اور وہاں قبروں کے بیچ بیٹھ کر مردوں کی مغفرت کے لیے اپنی مادری زبان میں دعائیں کریں، یا ہسپتال کا وزٹ کر لیا کریں اور مریضوں کے لیے جی بھر کر شفاء کی دعا کریں تو اپنی موت کی یاد اور شکر کے جذبے سے دل کا جو بھی گرد و غبار ہے، وہ کسی قدر اتر جائے گا اور اب قرآن مجید کی تلاوت کا خوب اثر ہو گا۔ اسی طرح نیک اساتذہ، دوستوں، پڑوسیوں اور رشتہ داروں کی صحبت بھی قرآن اور وحی کے اثر کو قبول کرنے کا مادہ دل میں پیدا کر دیتی ہے لہذا ایسے لوگوں کی صحبت تلاش کریں۔

عبادت میں دل نہیں لگتا!

دوست کا سوال ہے کہ عبادت میں دل نہیں لگتا، نماز تلاوت، ذکر، دعا سب چل رہا ہے لیکن دل نہیں لگ رہا، ایسا کیا کریں کہ عبادت میں دل لگنا شروع ہو جائے۔ جواب: یہ ہمارے معاشرے کا ایک عام مسئلہ ہے؛ عوام کا بھی اور خواص کا بھی۔ کسی کی توجہ نہیں لگ رہی تو کسی کا تو دل بھی نہیں لگ رہا اور عبادت جیسے بوجھ بن کر رہ گئی ہو۔

عبادت میں توجہ اور رغبت پیدا کرنے کی کچھ تدابیر ہیں، انہیں اختیار کرنے سے فائدہ ہو گا، ان شاء اللہ۔ توجہ، ذہن کی یکسوئی کا نام ہے اور رغبت، دل کی یکسوئی کو کہتے

ہیں یعنی عبادت میں ذہن اور قلب دونوں متوجہ ہوں، یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ یہ اس لیے عرض کر دیا کہ بہت سے لوگ خشوع وخضوع صرف ذہنی یکسوئی کو ہی سمجھتے ہیں کہ ذہن اللہ کی طرف متوجہ رہے، حالانکہ ذہنی یکسوئی کے ساتھ دل میں عبادت کا ذوق اور شوق بھی اصلا مطلوب ومقصود ہے کہ دل عبادت کے دوران اللہ کی طرف لپکتا رہے۔ ذہنی یکسوئی، تصور اور خیال کی ہے جبکہ قلبی یکسوئی، خواہش اور طلب کی ہے۔

ایک صحیح روایت میں قرآن مجید اور وحی کی مثال بارش کے ساتھ دی گئی ہے کہ جو سخت اور نرم زمین پر اترتی ہے۔ اب نرم زمین اس کو جذب کر لیتی ہے تو غلہ اور اناج اگتا ہے لہذا زمین کو بھی فائدہ ہو گیا اور دوسروں کو بھی۔ سخت زمین میں سے بعض پیالے کی طرح ہوتی ہیں کہ پانی کو خود تو جذب نہیں کرتی لیکن ذخیرہ کر لیتی ہے لہذا اس نے خود تو فائدہ نہ لیا لیکن دوسروں نے اس کے علم سے فائدہ حاصل کر لیا۔ اور بعض سخت زمین چٹان کی طرح ہوتی ہے کہ بارش کے پانی کو نہ تو جذب کرتی ہے اور نہ ہی دوسروں کے لیے روک رکھتی ہے۔

عبادت میں توجہ اور دل لگنے کے لیے ضروری ہے کہ ذہن اور قلب کی زمین نہ صرف عبادت کے اثرات قبول کرنے کے لیے تیار ہوں بلکہ ان اثرات کو ذخیرہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں تاکہ دوسروں کو فائدہ پہنچا سکیں۔ اب دل اور دماغ کو اس کے لیے تیار اور ہموار کیسے کیا جا سکتا ہے تو اس کی کچھ تدابیر ہیں۔ سب سے اہم آزمائش ہے، ہم میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی آزمائش کا سامنا رہتا ہے، چھوٹی ہو یا بڑی، یہ آزمائش آپ کے دل ودماغ کو یکسو کر دیتی ہے اور نرم بھی، پس اس یکسوئی اور نرمی کو عبادت کے لیے استعمال کر لیں۔

دوسرا طریقہ صحبت کا ہے کہ ایسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھیں کہ جنہیں عبادت میں ذہنی اور قلبی یکسوئی حاصل ہو چکی ہو۔ کچھ عرصہ بیٹھنے سے ایسے احوال اور کیفیات حاصل ہوں گی کہ دل اور دماغ کی زمین عبادت کے اثرات قبول کرنے کے لیے تیار ہونا شروع ہو جائے گی۔ تیسری تدبیر خواہش اور طلب کی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کی کچھ

خواہشات ہیں، بعض خواہشات کی طلب حد سے بڑھ جاتی ہے۔ یہ حد سے بڑھی ہوئی طلب آپ کو ذہنی اور قلبی یکسوئی دیتی ہے، اسے عبادت کے لیے استعمال کر لیں۔ اور اگر یہ خواہش اور طلب خالص دینی ہو جیسا کہ لوگوں کی ہدایت کی تڑپ رکھنا تو یہ تو بہت ہی بہترین ذریعہ ہے۔ دعوت تبلیغ کا کام کرنے والوں میں سے اکثر کی عبادت میں یکسوئی اسی رستے سے قائم ہوتی ہے۔

وہ ہم میں سے نہیں ہے!

نبی کریم ﷺ سے بہت روایات ایسی مروی ہیں کہ جن میں آپ نے بعض افعال کا ارتکاب کرنے والوں کے بارے "فليس منا" یا "فليس مني" کے الفاظ کہے ہیں کہ وہ ہم میں سے نہیں ہیں یعنی اس کا مسلمان امت سے کوئی تعلق نہیں ہے، یا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے یعنی نبی کریم ﷺ سے۔ وہ لوگ جو نبی کریم ﷺ سے محبت، نسبت اور تعلق کے دعویدار ہیں تو ان کے لیے آپ ﷺ کے یہ الفاظ بہت اہم ہیں۔

ایسا کہنے سے آپ ﷺ کی مراد ان افراد کو دائرہ اسلام سے خارج کرنا نہیں تھا بلکہ ان کے ان اعمال اور افعال کی کراہت اور ناپسندیدگی کو بیان کرنا مقصود تھا کہ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود بھی کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم مسلمان ہو، رسول اللہ ﷺ کے امتی ہو، اور تمہیں نبی سے کوئی ذرا برابر بھی تعلق اور نسبت حاصل ہے؟ تو نبی کریم ﷺ کہیں کہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے جو یہ کام کرے اور میں وہ سب کام کر کے بھی اپنے آپ کو عاشق بامراد کہلواتا رہوں تو کتنا بڑا دھوکا ہے کہ جو میں نے اپنے آپ کو دے رکھا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

① وہ ہم میں سے نہیں ہے کہ جس نے مسلمان کو دھوکہ دیا۔ (صحیح مسلم)
② وہ ہم میں سے نہیں ہے کہ جس نے مسلمان پر تلوار اٹھائی۔ (صحیح مسلم)
③ وہ ہم میں سے نہیں ہے کہ جس نے اس چیز کے اپنے ہونے کا دعوی کیا کہ جو کسی دوسرے مسلمان کی ہے۔ (صحیح مسلم)
④ وہ ہم میں سے نہیں ہے کہ جس نے کسی مسلمان کی بیوی یا اس کے غلام/ملازم

کو اس کے بارے بہکایا۔ (سنن ابو داود)

⑤ وہ ہم میں سے نہیں ہے کہ جو چھوٹوں پر شفقت نہ کرے اور بڑوں کا ادب نہ کرے۔ (سنن ابو داود)

⑥ وہ ہم میں سے نہیں ہے کہ جس نے کسی کا مال چھین لیا۔ (سنن ابو داود)

⑦ وہ ہم میں سے نہیں ہے کہ جس نے اپنی مونچھوں کو پست نہ کیا۔ (مسند احمد)

⑧ جو اس حال میں مرا کہ اس کا تقدیر پر ایمان نہیں ہے تو اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ (سنن ابو داود)

⑨ نکاح میری سنت ہے اور جس نے میری سنت پر عمل نہ کیا تو اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ (سنن ابن ماجہ)

⑩ میرے بعد کچھ ظالم حکمران ہوں گے، جو ان کے پاس گیا اور اس نے ان کے ظلم کی تصدیق کی اور ان کے جھوٹ کو سچ کہا تو نہ اس کا مجھ سے کوئی تعلق ہے اور نہ میرا اس سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی یہ حوض کوثر پر مجھ سے مل سکے گا۔ (سنن الترمذی)

⑪ اور میرا امتی کہ جس نے دوسرے امتی کے خلاف تلوار نکالی، ان کے نیکو کاروں پر بھی اور گناہ گاروں پر بھی، نہ مومن کے ایمان کی پرواہ کی اور نہ ذمی کے عہد کا خیال رکھا تو اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ (صحیح مسلم)

ایک ہی شخص میں جنت اور جہنم والے اعمال کا جمع ہونا

دوست کا سوال ہے کہ بعض اوقات ایک شخص ایسی نیکیاں کرتا ہے کہ جن پر احادیث مبارکہ میں جنت کی بشارت دی گئی ہے لیکن اس کے ساتھ وہ بعض ایسے گناہ بھی کرتا ہے کہ جن پر جہنم کی وعید ہے، تو اب اس کا ٹھکانا کون سا ہوگا؟ مثال کے طور صحیح مسلم کی روایت میں ہمیں ملتا ہے کہ جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوگا تو وہ جنت میں داخل نہ ہوگا جبکہ صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ جس نے اپنی زبان اور شرم گاہ کی حفاظت کر لی تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اب ایک شخص میں یہ

دونوں باتیں ہیں یعنی جنت میں داخلے کا سبب بھی موجود ہے اور جہنم میں جانے کا بھی تو اس کا انجام کیا ہے؟

اصل بات یہ ہے کہ احادیث میں جن اعمال پر جنت کی بشارت دی گئی ہے یا جہنم کی وعید ہے تو وہ دو قسم پر ہیں۔ بعض روایات میں انہیں "موجبات" کہا گیا ہے یعنی وہ جنت یا جہنم کو واجب کر دینے والے اعمال ہیں اور یہ کوئی تیس کے قریب ہیں۔ اور بعض روایات میں انداز یہ ہے کہ یہ جنت یا جہنم میں داخل ہونے کے اسباب ہیں یعنی ضروری نہیں ہے کہ ان کی وجہ سے وہ جنت اور جہنم کا لازمی مستحق قرار پائے۔ اور جنت میں ہر مومن اللہ کی رحمت سے داخل ہو گا نہ کہ اپنے عمل کے سبب سے یہ بات بھی صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت میں موجود ہے۔ پس جب جنت میں داخلہ ہی اللہ کی رحمت سے ہونا ہے تو پھر ان دوسری قسم کی احادیث میں کوئی تعارض باقی نہیں رہتا۔

جہاں تو موجبات کی بات ہے یعنی ایسے اعمال جو جنت کو واجب کر دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ اس عمل سے جنت اس شخص کے لیے واجب ہو جائے گی بشرطیکہ اس نے کوئی ایسا کام نہ کیا ہو جو جنت میں داخل ہونے میں مانع اور رکاوٹ بن جائے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص اخلاص سے گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں تو اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے۔ اب اس سے مراد یہی ہے کہ اتنے عمل سے جنت واجب ہے جب تک کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کر لے کہ جو جنت میں داخل ہونے میں رکاوٹ بن جائے۔

بھئی، بہت سادہ سی بات ہے کہ کسی ملک کا ویزا حاصل کرنے کے لیے ایک تو بنیادی معیار ہوتا ہے، اگر اس پر آپ پورے اترتے ہیں تو آپ ویزا حاصل کرنے کے اہل ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کو ویزہ مل بھی جائے گا کہ اگر آپ کسی جرم میں ملوث پائے گئے تو ویزے کا حصول آپ کے لیے مشکل ہو جائے گا کہ ایک مانع یا رکاوٹ آ گئی ہے۔ اور جب تک یہ دور نہ ہو گی تو آپ کا کیس ملتوی (pending) رہے گا۔

پس جس شخص میں ایمان اور کفر کی شاخیں جمع ہو جائیں یا اس میں جنت اور جہنم

دونوں کے اسباب موجود ہوں تو ایک صورت تو یہ ہے کہ جس کے اسباب "میزان" میں غالب ہوں گے، اس کے مطابق اس کا فیصلہ ہو جائے۔ اگر جنت کے اسباب کا وزن غالب ہے تو جنت میں جائے گا اور اگر جہنم کے اسباب کا وزن غالب ہے تو جہنم میں جائے گا اور بالاخر جنت اس کے لیے واجب ہو جائے گی۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ اگر دونوں اسباب کا وزن برابر ہوا تو ایسا شخص مقام اعراف میں ہو گا، مقام اعراف جنت اور جہنم کے مابین ایک مقام ہے اور یہاں وہ لوگ ہوں گے کہ جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی۔ یہ لوگ بعد میں اللہ کی رحمت سے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔

جنت میں داخل کرنے والے اعمال: مسلک پرستوں اور مسلک بیزاروں کے لیے

① نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ پچھلی قوموں میں ایک شخص کی روح قبض کرنے کے بعد فرشتوں نے اس سے کہا کہ کوئی نیکی کا کام بھی کیا ہے؟ تو اس نے جواب میں کہا کہ مجھے یاد نہیں ہے۔ فرشتے پھر کہیں گے کہ یاد کرو۔ تو وہ جواب میں کہے گا کہ ایک نیکی یاد ہے کہ میں لوگوں کو قرض دیتا تھا اور جب قرض واپس لینے کا وقت ہوتا تھا تو اپنے غلاموں کو یہ حکم دیتا تھا کہ دیکھنا جو تنگ دست ہو، اس کو مزید مہلت دے دینا اور جو قرض ادا نہ کر سکتا ہو، اس کو معاف کر دینا۔ اللہ نے اس عمل پر اس کو جنت میں داخل کر دیا۔ (صحیح مسلم)

② نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایک شخص نے مسلمانوں کے راستے میں ایک کانٹے دار شاخ کو دیکھا تو اس نے کہا کہ اللہ کی قسم! میں اسے مسلمانوں کے راستے سے صاف کر دوں گا تاکہ کسی مسلمان کو تکلیف نہ ہو۔ تو اللہ نے اس عمل پر اسے معاف کر دیا اور جنت میں داخل کر دیا۔ (مسند احمد)

③ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھنے کو اپنا معمول بنا لیا تو اس کے جنت میں داخل ہونے میں صرف ایک

ہی رکاوٹ ہے، اور وہ اس کی موت ہے۔(صحیح الجامع)

④ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں اس شخص کو جنت کے کنارے گھر کی بشارت دیتا ہوں کہ جو جھگڑا چھوڑ دے، چاہے اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہو۔ اور اس کو جنت کے وسط میں گھر کی بشارت دیتا ہوں جو جھوٹ کو چھوڑ دے، چاہے مزاح میں ہی کیوں نہ ہو۔ اور اس شخص کو جنت کے اعلی درجوں میں گھر کی بشارت دیتا ہوں کہ جو اپنے اخلاق کو بلند کر لے۔(سنن ابی داود)

⑤ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں ایک ساتھ ہوں گے۔ اور آپ نے شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی سے اِس طرح اشارہ کر کے دکھایا کہ ان دونوں کے مابین کچھ فاصلہ تھا۔(صحیح البخاری)

⑥ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ جب میں اپنے بندے کے جگر گوشے کی روح قبض کر لوں تو اس پر صبر کا بدلہ میرے پاس صرف جنت ہے۔(صحیح البخاری)

⑦ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو مجھے اپنی شرم گاہ اور زبان، دو چیزوں کی حفاظت کی ذمہ داری دیتا ہے تو میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہو۔(صحیح البخاری)

⑧ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایک عمرہ دوسرے عمرہ تک تمام گناہوں کا کفارہ ہے اور مقبول حج کی جزا تو جنت ہے۔(موطا امام مالک)

⑨ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس کا آخری کلام لا الہ الا اللہ ہو گا، وہ جنت میں داخل ہو گا۔(سنن ابی داود)

⑩ جنت میں ایک شخص کا درجہ اچانک بلند کر دیا جاتا ہے۔ تو وہ یہ پوچھتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا ہے؟ تو اسے جواب دیا جاتا ہے کہ تمہاری اولاد نے تمہارے لیے مغفرت کی دعا کی ہے۔(سنن ابن ماجہ)

بلاک ہونے والوں کی خدمت میں

فیس بک پر شاید سارے ہی مستقل لکھاری بلاک اور ان فرینڈ کی آپشن استعمال کرتے ہیں لہذا لکھاریوں کی نظر میں یہ معمول کی بات ہے لیکن بلاک ہونے والوں کو اس پر شکایت ہوتی ہے اور بعض بلاک شدگان تو بلاک کرنے والوں کے فضائل ومناقب میں پوسٹیں بھی مرتب کر دیتے ہیں۔ بلاک کرنے والا عموماً بلاوجہ بلاک نہیں کرتا بلکہ جب اسے کسی جلن آمیز (irritating) رویے کا سامنا ہوتا ہے تو وہ تنگ آ کر کمنٹ کرنے والے کو بلاک کر دیتا ہے۔

بلاک ہونے کی بڑی وجہ فیس بک کا مزاج نہ سمجھنا ہے۔ فیس بک پر ہر شخص کی وال ایسے ہی ہے جیسے اس کے گھر کی دیوار۔ اور جیسے اسے اپنے گھر کی دیوار کے بارے یہ حق حاصل ہے کہ اس پر کیا نظر آنا چاہیے اور کیا نہیں، اس طرح اسے اپنی وال کے بارے بھی یہی اختیار حاصل ہے۔ اب کیا کوئی شخص یہ پسند کرتا ہے کہ لوگ اس کے گھر کی دیوار پر اس کے خلاف گالیاں لکھیں یا نعرے لگائیں یا اس کو طعنے دیں یا ایسی بات کریں کہ جس سے وہ اندر تک سڑ کر رہ جائے۔ ہر گز نہیں، کبھی نہیں۔

بھئی، کسی کمنٹ کو ڈیلیٹ کرنے کے لیے آپ کے لیے اتنی دلیل ہی کافی ہے کہ میں اسے پسند نہیں کرتا۔ بس آپ کی دیوار ہے، آپ اگر اس پر کسی اشتہار کا لگنا پسند نہیں کرتے، چاہے وہ کسی مذہبی مجلس کا ہو یا دینی محفل کا، تو آپ کا یہ حق ہے اور اختیار ہے کہ اسے رکھیں یا مٹا دیں۔ اس کا تعلق حق و باطل سے بھی نہیں ہے بلکہ پسند و ناپسند سے ہے۔ اس لیے بہترین لکھاری وہ ہیں کہ اگر کسی سے اختلاف کرتے ہیں تو اپنی وال پر، ان کی وال پر جا کر لمبے لمبے کمنٹس کر کے انہیں وحشت میں مبتلا نہیں کرتے۔

میں عموماً ان لوگوں کو بلاک کر دیتا ہوں جو طعن و تشنیع شروع کر دیتے ہیں اور ان کے طعن و تشنیع والے کمنٹس بھی ڈیلیٹ کر دیتا ہوں۔ اور یہ بلاک کرنا ایک طرح سے ان سے معذرت ہوتی ہے کہ آپ سے گفتگو ممکن نہیں ہے، مجھے ہی معذور سمجھیں۔ بھئی، میرے پاس الجھنے کا وقت نہیں ہے، کرنے کو اور بہت کام پڑے ہیں۔ اور میچور

لکھاری کا لب ولہجہ اختلاف کرتے وقت بہت محتاط ہوتا ہے، مجھے خود اختلاف کرنے کا اسلوب سیکھنے میں دس سال لگے ہیں۔ میں نے شروع میں اپنے تزکیے کے لیے طعنے بھی برداشت کیے ہیں لیکن کیا کریں کوئی غامدی بنادیتا ہے تو کوئی قادیانی سے بھی ملادیتا ہے۔ لہذا اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ بلاک کے ذریعے معذرت کرلی جائے۔

عاجزی انکساری اپنی جگہ، لیکن یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ فیس بک پر سب برابر نہیں ہیں، سب کی ذہنی سطح ایک جیسی نہیں ہے، سب کا نالج ایک نہیں ہے۔ میں پچھلے گیارہ سال سے مسلسل لکھ رہا ہوں، ایک صد پچاس کے قریب تحقیقی اور فکری مضامین شائع ہو چکے ہیں، آٹھ دس کتابیں مرتب کرلی ہیں، ریسرچ میرا اوڑھنا بچھونا ہے، کبھی عشاء کو بیٹھتا ہوں تو فجر کی اذان ہو جاتی ہے، اور جو پبلش نہیں ہو سکا، ہارڈ ڈسک میں لکھ یا جمع کرر کھا ہے، وہ اتنا ہے کہ اگلے بیس سالوں کے لیے کافی ہے۔

بھئی، عاجزی واجزی بہت ہو گئی، آپ ایک محقق کی وال پر ہیں، جہالت کے طعن والے کمنٹ کرنے سے پہلے صرف اتنا سوال کرلیا کریں کہ اس موضوع پر آپ کی تفصیلی تحریر ہے تو وہ شیئر کر دیں۔ پھر اس تفصیلی تحریر کا جواب دیتے رہیں، اگلی نصف صدی تک۔ ہم نے کوئی دوڑ کر نہیں لکھا، بہت محنت سے لکھا ہے، جواب دینے بیٹھو گے تو معلوم ہو گا کہ یہاں صرف پسینہ نہیں نکلے گا، خون بھی سڑے گا۔

پوسٹ ڈیلیٹ کرنا

ایک ہی چیز کو دیکھنے کے کئی زاویے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ہم اپنی کھڑکی سے گلی کا منظر دیکھتے ہیں اور ہمارا پڑوسی اپنی کھڑکی سے دیکھتا ہے لہذا دونوں میں گلی کا منظر بیان کرنے میں اختلاف ہو جاتا ہے اور ایسی جگہ پر دونوں صحیح ہوتے ہیں۔ لہذا یہ ممکن ہے کہ آپ کی کسی تحریر میں خیر کا پہلو بھی ہو اور شر کا بھی ہو۔ آپ اس کے خیر کے پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے اس تحریر کو پوسٹ کر رہے ہوں اور آپ کا کوئی دوست اس میں کسی شر کے پہلو کی طرف اشارہ کر رہا ہو۔

ہم سب یہاں سیکھنے کے لیے موجود ہیں۔ میں کوئی بھی تحریر پوسٹ کرنے سے پہلے

سوچتا ہوں، بعض اوقات دس بار بھی سوچتا ہوں، لیکن اس کے باوجود بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی ایک دوست اس تحریر کے کسی شر کے پہلو کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ جس کی طرف میری توجہ پہلے نہیں تھی تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ مجھے یہ تحریر ڈیلیٹ کر دینی چاہیے۔ یہ کہنا تو درست نہیں ہے کہ مجھے یہ تحریر پوسٹ نہیں کرنی چاہیے تھی کیونکہ میں نے سوچ بچار کے بعد اس کو پوسٹ کیا لہذا پوسٹ کرنا غلطی نہیں تھی البتہ اب جبکہ کسی نے اس تحریر کے نقصان دہ پہلو کی طرف توجہ دلا دی ہے تو اب اس تحریر کو اپنی ٹائم لائن پر باقی رکھنا شاید نامناسب ہو گا۔

اب یہ بھی ہے کہ ہر دوست کو ہر تحریر پسند نہیں آتی لہذا یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ انباکس میں اگر کوئی صاحب حکم دے رہے ہوں کہ فلاں تحریر نامناسب ہے تو میں اسے ڈیلیٹ کر دوں لیکن یہ تو ہے نا کہ میری بعض تحریریں ایسی ہوتی ہیں کہ کسی کے ہلکا سا احساس دلا دینے سے بھی اندر سے ایک آواز آتی ہے کہ اسے ڈیلیٹ کر دو تو اچھا ہے یعنی میں ڈیلیٹ عوام کے اثر سے نہ کروں بلکہ اندر کی آواز پر کروں۔ لیکن اگر اندر کا آدمی ہی مر چکا ہو تو بھئی پھر تو یہ کہتے پھرو گے کہ میں ایسا لکھتا ہی نہیں ہوں کہ بعد میں ڈیلیٹ کرنا پڑے۔ یہ تو خدائی دعوی ہے نہ کہ انسانی۔

اور مجھے تو یہ بھی یقین ہے کہ جس دن میرے اندر سے ایسی آواز آنا بند ہو گئی تو مجھے یقین کر لینا چاہیے کہ میں اندر سے مر چکا ہوں۔ شاید دو تین ہفتے پہلے ہی اپنی ایک تحریر ڈیلیٹ کی ہے۔ بعض اوقات کسی دوست کو بھی یہ مشورہ دینے کو دل کرتا ہے کہ وہ اپنی فلاں تحریر ڈیلیٹ کر دیں، لیکن ابھی تک کسی کو یہ مشورہ دیا نہیں ہے کہ شاید اس کی کوئی قیمت ہی نہیں ہے کہ ہر کوئی خیر خواہ اور واعظ ہے اور جب سب خیر خواہ ہوں تو کوئی خیر خواہ نہیں ہوتا۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میرے خیال میں اچھا لکھاری وہی ہے، جو اپنی پوسٹ ڈیلیٹ کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہو کہ یہ رویہ یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ تا حال انسان ہی ہے۔ لیکن میں یہ بھی نہیں کہہ رہا کہ آئے روز پوسٹیں ڈیلیٹ کرتا رہے، اس کا مطلب تو یہ ہے

کہ اسے لکھنا ہی نہیں چاہیے۔

میسنجر انباکس

آپ کے متقی ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ کے فیس بک میسنجر انباکس تک آپ کے گھر والوں کو، جب اور جیسے، رسائی (access) حاصل ہو۔ احمد جاوید صاحب کا کہنا ہے کہ شاید بہت سے دینداروں اور متقیوں کے انباکس اس قابل نہیں ہوں گے کہ جنہیں ان کے گھر والوں یا دوستوں کے سامنے کھولا جا سکے یعنی وہ انھیں اپنے گھر والوں اور دوستوں سے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

بہر حال امر واقعہ ایسا ہے یا نہیں لیکن اگر ہم میں سے کسی کو اپنا انباکس اپنے گھر والوں یا دوستوں سے چھپانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہو تو اس کی تنہائی "احسان" اور "تقوی" والی نہیں ہے۔ میں متقی ہونے کا دعویدار تو نہیں ہوں لیکن میں نے اپنی بیگم کو اپنے میسنجر اور واٹس ایپ تک رسائی ضرور دے رکھی ہے لیکن اس کے باوجود کسی کو میری اصلاح کی اتنی فکر پڑی ہے کہ میرے اکاؤنٹ سے پچھلے ایک ماہ سے چھیڑ خوانی فرما رہے ہیں کہ مجھے آئے دن اپنے فون نمبر پر پاسورڈری سیٹ کرنے کے کوڈز ہی ملتے رہتے ہیں۔ محترم ہیکر صاحب! اگر آپ یہ بیگم کی رسائی والی بات پر ایمان لے آئیں تو آپ کی محنت ضائع ہونے سے بچ جائے گی۔

خیر میرے اکاؤنٹ سے تو جو مرضی چھیڑ خوانی کر لیں لیکن یہاں المیہ ہے کہ ہر دوسرے عالم دین یہی شکایت کر رہے ہوتے ہیں جبکہ اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث کا مفہوم ہے کہ اے وہ لوگو کہ ایمان جن کی زبان پر ہے، دل میں نہیں اترا، جو مسلمانوں کے عیوب تلاش کرنے میں لگے ہو، باز آ جاؤ، ورنہ خدا تمہارے عیوب کے پیچھے پڑ جائے گا، اور خدا جس کے عیوب کے پیچھے پڑ جائے، تو اسے اس کے گھر میں رسوا کر دیتا ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو صحیح الجامع میں نقل کیا ہے۔

تو اسلام میں ایک تو یہ ہدایت ہے کہ اگر کسی بھائی کا عیب سامنے آ بھی جائے تو اس پر پردہ ڈالے کہ اللہ تعالی قیامت والے دن اس کے عیوب پر پردہ ڈالیں گے جیسا کہ صحیح

مسلم کی روایت میں ہے۔اور یہاں تو اخلاق کی گراوٹ کی انتہاء دیکھیں کہ کسی کی خامی یا عیب یا کمزوری کچھ مل جائے سہی، چاہے اس کے لیے جاسوسی کرنی پڑی، آئی ڈی ہیک کرنی پڑے،اور پھر جس طرح گندی مکھی گند پر بیٹھ کر اٹھتی ہے تو جہاں بیٹھتی ہے تو گند ہی پھیلاتی ہے، تو بس یہی کام کریں۔یہ ہیں اس مسلمان معاشرے کی اخلاقیات جو آپ کو روزمرہ زندگی میں بھی نظر آئیں گی۔

مدرسے کا طالب علم

مدرسہ کے زمانہ طالب علمی میں ایک بار ایسا ہوا کہ کسی طالب علم نے بیت الخلاء میں جا کر لوٹے میں پیشاب کر دیا۔ ممکن ہے کہ اسے کسی استاذ سے ڈانٹ پڑی ہو لہذا اس نے غصہ اس طرح نکالا۔ بہر حال اس کے فعل شنیع کی وجہ جو بھی ہو،ایک دوسرا طالب علم جب واش روم میں گیا تو اس نے لوٹے میں پیشاب دیکھا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

دوسرے طالب علم کو اور تو کچھ سمجھ نہ آئی، وہ دوڑتا ہانپتا اپنے ایک کلاس فیلو دوست کے پاس آیا کہ اس طرح کسی طالب علم نے لوٹے میں پیشاب کر دیا ہے۔ تیسرا طالب علم اسی وقت اپنی جگہ سے اٹھا، بیت الخلاء کی طرف دوڑا، لوٹے کے پیشاب کو فلش میں بہایا، لوٹے کو اچھی طرح دھویا اور واپس اسی جگہ رکھ دیا۔ انجینیئر محمد علی مرزا صاحب جیسے لوگ جو کہ مدرسہ پر ضرورت سے زیادہ ہی تنقید کرتے رہتے ہیں، انہیں یہ تیسری قسم کے طلباء نظر کیوں نہیں آتے۔

اب جو لوگ مدارس کے خلاف ہیں یا اہل مدرسہ سے بغض رکھتے ہیں اور لوگوں کے دلوں میں مدرسہ اور اہل مدرسہ کی بری تصویر بٹھانا چاہتے ہیں تو وہ پہلی قسم کے طالب علم کے واقعے کو لیں گے اور یہ دعوی کریں گے کہ مدرسہ کا طالب علم ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہمیں یہ ماننے میں حرج نہیں ہے کہ اس قسم کے طالب علم بھی مدرسہ میں ہوتے ہیں لیکن اگر دو سو طلباء میں سے ایک طالب علم نے ایسی حرکت کی ہے تو یہ ایک فی صد بھی نہیں بنتے۔

دوسری طرف تیسرا طالب علم بھی تو ہے کہ جس نے پہلے طالب علم کی گندگی کو

صاف کر دیا۔اس تیسرے طالب علم کو مدرسہ کے طالب علم کی اصل تصویر ماننے میں کیا رکاوٹ ہے؟ہم نے خود مدرسہ میں چٹائیوں پر بیٹھ کر پڑھا ہے۔میں یہ دعوی تو نہیں کر رہا کہ مدرسہ کے ننانوے فی صد طالب علم ایسے ہیں کہ اگر وہ بیت الخلاء میں گندگی اور نجاست دیکھ لیں تو اسے صاف کر دیتے ہیں لیکن کم از کم بیس تیس فی صد ایسے ضرور ہیں کہ اس قسم کے واقعے میں وہ لوٹے کو صاف کر کے اس کی جگہ رکھ دیتے۔

علمائے اہل حدیث کا ذوق تصوف: تبصرہ کتاب

کچھ عرصہ پہلے جامعہ البیت العتیق کے ایک استاذ نے ذکر کیا کہ "علمائے اہل حدیث کا ذوقِ تصوف" کے نام سے حکیم محمد طارق محمود مجذوبی چغتائی صاحب کی ایک کتاب آئی ہے جو پڑھنے کے لائق ہے۔مجھے چونکہ لڑکپن ہی سے تصوف اور اس کے متعلقات کے مطالعہ کا کافی شوق رہا ہے لہٰذا فوراً یہ کتاب منگوا لی۔کتاب 1250 روپے میں ملی۔اس کے ناشر کے طور "دفتر مرکز روحانیت وامن، مزنگ چونگی، لاہور" کا نام درج ہے اور میری معلومات کے مطابق صرف یہیں سے ملتی ہے۔یہ ایک ضخیم کتاب ہے اور اس کی پہلی جلد اگست 2013ء میں شائع ہوئی جو 2360 صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف دوسری جلد بھی تیار کر رہے ہیں۔اس کتاب کو ایک انسائیکلوپیڈیا قرار دیا جا رہا ہے۔

کتاب تو بڑے شوق سے منگوائی تھی اور مطالعہ سے پہلے یہی خیال تھا کہ جس نے بھی یہ کام کیا ہے، بہت ہی عظیم کام ہے، اہل الحدیث میں اصلاح قلب اور تزکیہ نفس کے کام کی بڑی ضرورت ہے وغیرہ لیکن جوں جوں کتاب کا مطالعہ کیا، دردِ سر بڑھتا ہی گیا اور طبیعت میں ایک عجیب بے چینی سی پیدا ہو گئی۔لہٰذا نہ چاہتے ہوئے بھی تبصرہ لکھنے بیٹھ گیا اور احساس یہ تھا کہ اس کتاب پر تبصرہ نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک شرعی ذمہ داری کو ترک کر دینا۔

امر واقعہ یہ ہے کہ ذوق تصوف کے نام پر اہل حدیث کے کھاتے میں وہ رطب ویابس ڈال دیا گیا ہے کہ اللہ کی پناہ!کتاب کا ایک بڑا حصہ اسکین شدہ کتابوں پر مشتمل ہے۔صفحہ نمبر 1317 سے 1456 تک تقریباً 140 صفحات میں نواب صدیق الحسن

خان صاحب کی کتاب "کتاب التعویذات" اسکین کر کے دی گئی ہے۔ مرتب نے صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اسی کتاب کا نیا ایڈیشن بھی اسکین کر کے فوراً بعد ہی صفحہ 1457 سے 1585 تک دے دیا ہے۔ اب یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے ایسا کیوں کیا گیا ہے؟ ایک ہی کتاب کے دو ایڈیشن کس لیے؟ کتاب کے صفحات بڑھانے کے لیے؟

اور پھر اہم سوال یہ ہے کہ تعویذات کا تصوف سے تعلق کیا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ مولف تصوف کے معنی و مفہوم سے بھی ناواقف ہیں۔ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ سے لے کر مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تک کس نے تعویذات کو تصوف کا موضوع قرار دیا ہے؟ تصوف کا یہ معنی و مفہوم تو خود اہلِ تصوف کے ہاں نہیں ہے چہ جائیکہ اہل الحدیث کے ہاں ہو۔ تصوف کے موضوعات عام طور دو رہے ہیں؛ نظری اور عملی تصوف۔ نظری تصوف میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود وغیرہ بیان کیا جاتا رہا ہے اور یہ بھی متاخرین کے ہاں ہیں۔ متقدمین تصوف کو اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ جہاں تک عملی تصوف کا تعلق ہے تو اس کے دو بڑے موضوع رہے ہیں؛ ایک اعمال قلوب اور دوسرا اخلاق ورذائل نفس۔ اور یہی دو موضوعات دراصل تصوف کے اصل موضوعات ہیں، وہ تصوف جو کہ متقدمین کا تصوف تھا۔

نواب صاحب کی اس کتاب میں ختم قادری، ختم خواجگاں اور ختم حضرت مجدد شیخ احمد سرہندی جیسے بے شمار عناوین ہیں کہ جن کے غیر شرعی ہونے کے بارے اہل الحدیث اہل علم کا اتفاق ہے۔ مثلاً نواب صاحب کی اسکین شدہ کتاب کا ایک اقتباس ذیل میں ملاحظہ ہو:

> "طریق ختم خواجگان رضی اللہ عنہم، یہ ختم جس نیت و قصد سے پڑھا جاتا ہے وہی مقصد حاصل ہوتا ہے۔ طریقہ اس کا یہ ہے کہ پہلے ہاتھ اٹھا کر ایک بار سورہ فاتحہ پڑھے۔ پھر سورہ فاتحہ مع بسم اللہ سات مرتبہ پڑھے۔ پھر درود سو بار پھر الم نشرح مع بسم اللہ ہفتاد ونہ بار۔ پھر سورہ اخلاص با بسم اللہ ہزار ویکبار۔ پھر سورہ فاتحہ با بسم اللہ سات بار۔ پھر درود سو بار۔ پھر فاتحہ پڑھ کر ثواب اس

ختم کا ارواح حضرات کو جن کی طرف یہ ختم منسوب ہے، پیش کرے۔ ان بزرگوں کی تعیین نام میں اختلاف ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ سے حصول مدعا بوسیلہ ان بزرگوں کے چاہے۔" (ص1545)

کیا اہل حدیث کے ذوق تصوف کے نام سے ایسی باتیں جمع کرنے میں کوئی خیر مقصود ہوسکتی ہے؟ شیعہ لیڈر علامہ خمینی سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے علامہ احسان الٰہی ظہیر کی کتاب "الشيعة وأهل البيت" پڑھی ہے تو انہوں نے جواب دیا: ہاں! سائل نے کہا کہ اس کے بار آپ کی کیا رائے ہے؟ تو علامہ خمینی نے جواب دیا: شر اہل تشیع کی کتابوں میں بکھرا ہوا تھا جسے احسان الٰہی ظہیر نے جمع کر دیا جس سے اہل تشیع کی بہت بری تصویر سامنے آئی ہے۔

اس کے بعد صفحہ 1586 سے 1705 تک تقریباً 120 صفحات میں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی کتاب "القول الجميل" کا اسکین شدہ اردو ترجمہ دیا ہے۔ اس کتاب کا ایک اقتباس ذیل میں ملاحظہ ہو:

" اور مشائخ چشتیہ نے فرمایا کہ جب قبرستان میں داخل ہو تو سورۃ إنا فتحنا دو رکعت میں پڑھے۔ پھر میت کے سامنے ہو کر کعبہ کی طرف پشت دے کر بیٹھے۔ پھر سورہ ملک پڑھے۔ اور اللہ اکبر اور لا إلہ إلا اللہ کہے۔ اور گیارہ بار سورۃ فاتحہ پڑھے۔ پھر میت سے قریب ہو جاوے۔ پھر کہے یارب یارب اکیس بار۔ پھر کہے یاروح اور اس کو آسمان میں ضرب کرے اور یاروح الروح کی دل میں ضرب لگائے یہاں تک کہ کشائش اور نور پاوے۔ پھر منتظر رہے اس کا جس کا فیضان صاحب قبر سے ہوسکے دل پر۔" (ص1630)

اب کون اہل حدیث قبر سے فیض حاصل کرنے کا قائل ہے؟ اسی طرح صفحہ 1706 سے 1852 تک شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی کتاب "انتباه في سلاسل أولياء الله" کا اسکین شدہ ترجمہ اور صفحہ 1853 سے 1956 تک شاہ صاحب کی کتاب "فیوض الحرمین" کا اسکین شدہ ترجمہ شامل کتاب کیا گیا ہے۔ فیوض الحرمین تو شاہ صاحب کے ذاتی مشاہدات ہیں جن کا اہل حدیث کے ذوق تصوف سے کیا تعلق؟

اسی طرح صفحہ 1957 سے 1987 تک میں شاہ صاحب کی کتاب "فیصلة وحدة الوجود والشهود" کا اسکین شدہ ترجمہ دیا گیا ہے۔ شاہ صاحب کی اس کتاب کے ترجمے کا اس لحاظ سے مطالعہ تو مفید ہے کہ شاہ صاحب کا وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے بارے کیا موقف ہے، لیکن اس کتاب کو "علمائے اہل حدیث کے ذوق تصوف" کے نام سے بیان کرنا اہل الحدیث کے ساتھ بڑی زیادتی ہے کہ ان کے کھاتے میں ایک ایسا عقیدہ ڈال دیا گیا کہ جس پر کم از کم فتوی ان کے اہل علم کے ہاں بدعت اور گمراہی کا ہے اور زیادہ کی تو پھر کوئی انتہاء نہیں ہے۔

صفحہ 1989 سے 2053 تک مولوی غلام رسول صاحب کی کتاب "خوارق" کی اسکینگ دی گئی ہے جس میں انہوں نے زیادہ تر اپنے حضرت جی کی کرامات بیان کی ہیں۔ صفحہ 2226 سے 2281 تک کمال الدین کمال سلار پوری کی کتاب "میرے روحانی تجربات ومشاہدات" کی اسکینگ دی گئی ہے۔ اس کتاب کے عناوین میں "کلمہ شریف کا تعویذ" اور "عمل سورة جن" اور "سورة فاتحہ کا عمل" اور "جنات کی حاضری کا عمل" وغیرہ شامل ہیں۔ جنات کی حاضری یا عاملوں کی چلہ کشی کا تصوف سے کیا تعلق؟ تصوف کی ایسی جامع تعریف تو اہل تصوف کے ہاں بھی نہیں ملتی!

کتاب کا ایک بڑا حصہ کراماتِ اہل حدیث پر بھی مشتمل ہے یہ بھی تصوف کا اصل موضوع نہیں ہے۔ تصوف کا اصل موضوع افعالِ قلوب اور اخلاق ورذائلِ نفس ہیں جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ محقق صوفیاء کرامت کو صوفی کا حیض قرار دیتے ہیں۔ اس پر تفصیلی بات ہم اپنی کتاب "صالح اور مصلح" میں کر چکے ہیں۔

اضافی طور ہم یہ بھی ذکر کرتے چلیں کہ سلفیہ اور اہل الحدیث دو علیحدہ تحریکیں ہیں۔ بعض لوگ انہیں ایک سمجھتے ہیں۔ سلفیت کی تحریک عقیدے کی اصلاح کی تحریک تھی جبکہ اہل الحدیث کی تحریک تقلیدی جمود کے خلاف تھی اور اس کا موضوع فقہ بنتا ہے۔ معاصر سلفی تحریک کا آغاز نجد کے علاقہ سے ہوا اور اس کے امام شیخ محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ (1792-1707ء) تھے جبکہ تقلیدی جمود کے خلاف تحریک کا مرکز

برصغیر پاک وہند ہے اور اس کی ابتداء شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ (1114-1174ھ) سے ہوئی۔

اسی لیے ہم سعودی علماء میں دیکھتے ہیں کہ وہ عقیدہ کے معاملہ میں بہت سخت ہیں یعنی ماتریدیہ، اشاعرہ، صوفیاء وغیرہ کے بارے عام فتویٰ گمراہ فرقوں کا ہے لیکن تقلید ائمہ کے معاملے میں وہ نرم ہیں۔ سعودی عرب میں تقابلی فقہ پڑھائی جاتی ہے اگرچہ وہ فقہ میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہاں کے علماء اور شیوخ اپنا تعارف حنبلی کی بجائے سلفی کے طور کرواتے ہیں۔ پس سلفیت کوئی فقہی مذہب نہیں ہے بلکہ وہ عقیدہ و منہج ہے کہ جس کی نسبت صحابہ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ اربعہ کی طرف کی جاتی ہے۔ اور اسے ایک باقاعدہ منظم فکر کے طور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے متعارف کروایا۔

جبکہ برصغیر پاک وہند میں چلنے والی تحریک چونکہ تقلیدی جمود کے خلاف تھی لہٰذا شروع میں عقائد کی اصلاح پر اس میں اس قدر توجہ نہ تھی جتنی کہ سلفیت میں تھی۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ اور شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کے ہاں بھی ہمیں وحدت الوجود وغیرہ کی ابحاث مل جاتی ہیں۔ پس برصغیر میں شروع شروع میں کسی شخص کے اہل الحدیث ہونے کا مطلب صرف یہی تھا کہ وہ تقلیدی جمود کا قائل نہیں ہے۔ عقیدے میں وہ اشعری، ماتریدی یا صوفی بھی ہو سکتا تھا جیسا کہ نواب صدیق الحسن خان رحمہ اللہ وغیرہ جیسی مثالیں ہمیں مل جاتی ہیں۔

جب برصغیر کے علماء کا سعودی اہل علم سے علمی رابطہ ہوا، یہ رابطہ پہلے پہل تو کتابوں کے ذریعے ہوا اور بعد ازاں پاکستان کے نامور شیوخ نے مدینہ یونیورسٹی میں جا کر تدریس کی یا وہاں تعلیم حاصل کی، تو ان دونوں تحریکوں نے ایک دوسرے سے اثر لیا۔ برصغیر کے اہل حدیث علماء نے سلفیت کی تحریک سے اثر لیا اور عقائد میں یہاں بھی توحید اسماء وصفات کی بحثیں سننے کو ملیں جبکہ سعودی علماء نے برصغیر کے علماء سے اثر لیا اور حنبلی فقہ کی طرف نسبت کے باوجود مسائل استنباط میں عدم تقلید کا رویہ بطور منہج

قرار پایا۔ پس اب کے جو معاصر اہل حدیث ہیں وہ عقیدہ میں سلفی اور فقہ میں اہل الحدیث کے منہج پر ہیں۔

علاوہ ازیں تصوف کی تاریخ کا بھی اگر ہم بغور مطالعہ کریں تو یہ چار ادوار سے گزرا ہے۔ پہلا دور کہ جس میں تصوف یا صوفی کی اصطلاح موجود نہ تھی، اس میں عبادت کا زیادہ شوق کرنے والے اور دنیا سے بے رغبتی کرنے والے اہلِ احسان موجود تھے جنہیں زہاد یا صلحاء کہا جاتا تھا۔ زہد اور احسان ان کی نمایاں خصوصیات تھیں جیسا کہ صحابہ کی جماعت میں عبداللہ بن عمرو بن العاص اور ابو درداء رضی اللہ عنہما یا تابعین میں حضرت حسن بصری اور سعید بن مسیب رحمہما اللہ وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ تصوف کا یہ دور وہ ہے جو کہ خیر کا دور ہے۔ امام ابن تیمیہ اولین صوفیاء حضرت جنید بغدادی، سری سقطی اور ابراہیم بن ادہم رحمہم اللہ وغیرہ کو بھی اسی دور کا ایک حصہ قرار دیتے ہوئے ان کی عام طور تعریف کرتے ہیں اگرچہ زمانی اعتبار سے یہ حضرات تابعین کے بعد کے زمانے کے ہیں۔

اس کے بعد دوسرا دور جو کہ تبع تابعین سے شروع ہوا، وہ تھا کہ جس میں تصوف کی اصطلاحات وجود میں آئیں اور رفتہ رفتہ آنے والی نسلوں میں زہد اور دنیا سے بے رغبتی کے حوالہ سے کچھ نئے تصورات متعارف ہوئے اور اس دور کی انتہاء امام غزالی رحمہ اللہ پر ہوئی جنہوں نے "إحياء علوم الدين" میں ایک طرف توضعیف اور موضوع روایات بھی جمع کر دیں اور دوسری طرف عزلت نشینی کو جمعہ و جماعت کی نماز پر ترجیح دی۔ علامہ ابن جوزی نے امام غزالی رحمہ اللہ کی اس کتاب کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے اسی حوالے سے اپنی کتاب "منهاج القاصدين" مرتب کی تھی۔ تصوف کا یہ دور وہ ہے کہ اس میں خیر کا پہلو بھی موجود ہے اور شر کا بھی جبکہ خیر کا پہلو غالب ہے۔

تصوف کا تیسرا دور وہ ہے جبکہ یونانی فلسفے کے زیر اثر نظریاتی تصوف نے جنم لیا اور شیخ اکبر ابن عربی نے وحدت الوجود کا نظریہ پیش کیا۔ تصوف کا یہ دور وہ ہے کہ جس میں صوفی کی توجہ نہ صرف اپنے اصل مقصود یعنی اعمال قلوب اور اخلاق ورذائل سے ہٹ گئی بلکہ شریعت بھی جاتی رہی۔ شیخ ابن عربی کے معاصر اہل علم میں فقہائے حنفیہ، مالکیہ،

شوافع اور حنابلہ کی ایک بڑی جماعت نے اس نظریہ کو کفر اور شرک قرار دیا کہ جس پر کسی قدر تفصیلی گفتگو ہم اس کتاب کے پہلے باب میں کر چکے ہیں۔ اب تصوف عمل سے زیادہ نظریہ بن گیا اور صوفی کو اصلاح نفس سے زیادہ فکر عرفان نفس کی ہو گئی۔

تصوف کا چوتھا دور وہ ہے جس سے ہم آج گزر رہے ہیں کہ مداریوں اور کرتب دکھانے والوں کی کثرت ہے جو لوگوں کی دنیا اور دین دونوں تباہ کرنے کے لیے تلے بیٹھے ہیں۔ یا تو ایسی بڑی بڑی گدیاں اور سجادہ نشین ہیں کہ جن کا دین سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے یا پھر سلاسل کی بچی کھچی لڑیاں ہیں کہ جن کے سالکین کو اپنے شیخ کے روحانی مقام اور مرتبے یا اپنے سلسلے کی دوسرے سلاسل پر فضیلت کی وجوہ بیان کرنے سے فرصت نہیں ہے۔

بہر حال یہ موضوع تفصیل طلب ہے کہ سلفی منہج کے مطابق تزکیہ نفس اور اصلاح کا کیا نظام ہونا چاہیے اور ہم نے اس پر مفصل گفتگو اپنی کتاب "صالح اور مصلح: کتاب وسنت اور سلف صالحین کے منہج پر تزکیہ نفس اور اصلاح احوال کا پروگرام" میں کی ہے۔ موضوع کی اہمیت سے انکار نہیں ہے لیکن جو منہج زیر تبصرہ کتاب میں پیش کیا گیا ہے، وہ اصلاح نفس کا سلفی تصور یا منہج نہیں ہے۔ اور عقیدہ و منہج، سلفی فکر کے دو ایسے ستون ہیں کہ جن پر سلفیت قائم ہے۔ اصلاح نفس ہو یا تعلیم و تربیت، دعوت وجہاد ہو یا جنگ وجدال، ہر شعبہ زندگی میں سلفی عقیدہ اور سلفی منہج سے رہنمائی لینا ہی اہل حدیث کا طرہ امتیاز ہے۔

تعجب تو ان فضلاء اور علمائے اہل حدیث پر ہوتا ہے کہ جنہوں نے اس کتاب کے بارے توصیفی کلمات کہے۔ اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ فی زمانہ جماعت اہل حدیث میں اصلاح نفس کی ضرورت اس قدر شدت سے محسوس کی جا رہی ہے کہ اس وقت انہیں تزکیہ نفس کے نام سے کچھ بھی پروگرام دے دیا جائے، وہ ایک مرتبہ اس کی طرف ضرور شوق سے متوجہ ہوں گے۔

لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ کوئی شخص رطب ویابس کو جمع کر کے اہل

حدیث کے لیے سلوک کے بدعی رستے مقرر کرے۔ اگر مرتب کو اہل حدیث کے ذوق تصوف کے حوالہ سے کچھ جمع کرنا بھی تھا تو امام نووی رحمہ اللہ کی ریاض الصالحین، امام ابن جوزی رحمہ اللہ کی منہاج القاصدین، امام ابن قیم رحمہ اللہ کی مدارج السالکین اور شیخ محمد التویجری کی موسوعہ فقہ القلوب کے تراجم کو ہی جمع کر دیتے۔ یہ کتابیں اصلاح نفس کے سلفی منہج کے مطابق ہیں۔ مرتب کے جمع کردہ ہزاروں صفحات سے بہتر تھا کہ وہ پانچ سات صفحات میں مدارج السالکین کی فہرست کا ترجمہ ہی شائع کر دیتے ہیں۔

صوفیوں سے محبت اور بغض

دوست نے کہا کہ آپ صوفیوں سے محبت رکھتے ہیں بغض؟ میں نے کہا کہ ان میں سے جن میں خیر کا پہلو غالب ہے، ہمیں ان سے محبت ہے اور ان سے اگر کچھ شر کی باتیں نقل بھی ہو گئی ہیں تو ہم ان کے شر کی تاویل نہیں کرتے کہ تاویل تو معصوم کے کلام کی ہوتی ہے بلکہ ان کے بارے اللہ سے مغفرت کی امید رکھتے ہیں۔ ان کے خیر سے خود بھی استفادہ کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی تلقین کرتے ہیں کہ ان سے استفادہ کریں۔ اور ان کی شر کی باتیں جو کہ خیر کی نسبت کم ہی ہیں، ان سے براءت کا اعلان کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی تلقین کرتے ہیں کہ ان سے براءت کا اظہار کریں۔

اس نے کہا کہ یہ کون سے صوفی ہیں کہ جن سے آپ محبت رکھتے ہیں اور ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ بہت سے ہیں مثلاً سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی، شیخ مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ دہلوی، مولانا اشرف علی تھانوی رحمہم اللہ وغیرہ۔

اس نے کہا کہ کیا کسی صوفی سے بغض بھی ہے۔ میں نے کہا کہ ان تمام سے بغض ہے جن میں شر کا پہلو غالب ہے۔ ان میں خیر بھی اگر ہے تو ان کے شر کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔ نہ ہم ان سے استفادہ کرتے ہیں اور عوام کو بھی ان کی طرف رجوع کرنے سے منع کرتے ہیں کیونکہ یہ خود بھی گمراہ ہیں اور گمراہ کرنے والے بھی ہیں۔

اس نے کہا کہ یہ کون سے صوفی ہیں جن سے آپ بغض رکھتے ہیں اور انہیں ضال اور مضل سمجھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ بہت سے ہیں مثلاً منصور الحلاج، ابن عربی، ابن الفارض

اور بو علی قلندر وغیرہ۔ یہ سب باطنی اسماعیلی تحریک کے نمائندے ہیں، ان کا دین اسلام کی نمائندگی سے ذرا بھی تعلق نہیں ہے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کا ایک صوفی سے مباہلہ

ملا علی القاری الحنفی رحمہ اللہ نے ابن عربی کے رد میں "الرد علی القائلین بوحدة الوجود" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی کہ جس میں ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کا یہ مباہلہ ذکر کیا ہے:

"الْحَافِظ الْحجَّة القَاضِي شهَاب الدّين أَحْمد بن عَليّ بن حجر الشَّافِعِي الْعَسْقَلَانِي أَنه قَالَ جرى بيني وَبَين بعض المحبين لِابْنِ عَرَبِيّ مُنَازعَة كَبِيرَة فِي أَمر ابْن عَرَبِيّ حَتَّى قلت مِنْهُ بِسوء مقَالَته فَلم يسهل ذَلِك بِالرجلِ المنازع لي فِي أمره وهددني بالشكوى إِلَى السُّلْطَان بمصْر بِأَمْر غير الَّذِي تنازعنا فِيهِ ليتعب خاطري فَقلت لَهُ مَا للسُّلْطَان فِي هَذَا مدْخل تعال بنَا نتباهل فَقل أَن يتباهل اثْنَان فَكَانَ أَحدهمَا كَاذِبًا إِلَّا وَأُصِيب قَالَ فَقَالَ لي بِسم الله فَقلت لَهُ قل اللَّهُمَّ إِن كَانَ ابْن عَرَبِيّ على ضلال فالعني بلعنتك فَقَالَ ذَلِك قلت أَنا اللَّهُمَّ إِن كَانَ ابْن عَرَبِيّ على هدى فالعني بلعنتك قَالَ وافترقنا قَالَ ثمَّ اجْتَمَعنَا فِي بعض مستنزهات مصر فِي لَيْلَة مُقْمِرَة فَقَالَ لنا مر على رجْلي شَيْء ناعم فانظروا فَنَظَرْنَا فَقُلْنَا مَا رَأينَا شَيْئا قَالَ ثمَّ التمس بَصَره فَلم ير شَيْئا انْتهى وَالْمعْنَى أَنه ثَبت كَونه من الْكَاذِبين وَيتَفَرَّع عَلَيْهِ أَنه من الملعونين وَشَيْخه من الضَّالّين المضلين ثمَّ اعْلَم أَن من اعْتقد حَقِيقَة عقيدة ابْن عَرَبِيّ فكافر بِالْإِجْمَاع من غير النزاع وَإِنَّمَا الْكَلَام فِيمَا إِذا أول كَلَامه بِمَا يَقْتَضِي حسن مرامه."

"حافظ ابن حجر عسقلانی الشافعی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ ان کے اور ابن عربی کے ایک پرستار میں ابن عربی کے بارے مناظرہ ہو گیا۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے ابن عربی کے عاشق کو اس کے بدترین اقوال کا حوالہ دیا تو اس نے سلطان مصر سے ان کی شکایت لگا دی۔ تو حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اس سے کہا کہ سلطان

کو اس معاملے میں کیوں لاتے ہو، آؤ ہم مباہلہ کرتے ہیں۔ تو ابن عربی کے عاشق نے جواب دیا: بسم اللہ۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے اس عاشق کو کہا کہ تم یہ کہو کہ اگر ابن عربی گمراہی پر ہے تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو۔ اور میں یہ کہتا ہوں کہ اگر ابن عربی ہدایت پر ہے تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہم مصر ہی میں ایک مقام پر چاندنی رات میں جمع ہوئے تو وہ ہمیں کہنے لگا کہ میرے پاؤں سے کوئی چیز گزری ہے، ذرا دیکھنا، ہم نے دیکھا تو کچھ نہ تھا لیکن اس کی بصارت جا چکی تھی۔ تو واضح ہو گیا کہ وہ شخص جھوٹا تھا اور ملعون بھی تھا اور یہ بھی کہ اس کا شیخ، شیخ اکبر گمراہ اور گمراہ کرنے والوں میں سے تھا۔ اور یہ بھی تم جان لو کہ جس نے ابن عربی کے جیسا عقیدہ رکھا تو وہ شخص کافر ہے اور اس پر امت کا اجماع ہے البتہ اس شخص کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے جو ابن عربی کے اقوال کی تاویل کرتا ہے۔"

2014ء کی قابل ذکر نعمت

2014ء کے سال کی قابل ذکر نعمت یہ ہے کہ سال بھر میں نہ کوئی فلم دیکھی اور نہ ہی کوئی مووی، اور نہ ہی کوئی گانا سنا۔ البتہ نئی آنے والی معروف فلموں اور موویوں کے بارے بعض اوقات بی۔ بی۔ سی اردو، وکی۔ پیڈیا یا پرنٹ میڈیا میں کوئی تبصرہ پڑھ لیا کرتا تھا۔ سال بھر کوئی ڈرامہ بھی نہیں دیکھا البتہ پی ٹی وی کے ایک بہت ہی پرانے ڈرامے "من چلے کا سودا" کے کچھ ایپی سوڈ ایک موضوع پر سوچ بچار کے دوران دیکھنے کو ملے۔ معروف رائٹر جناب اشفاق احمد کے اس ڈرامے کا موضوع "تصوف" ہے۔

احمد جاوید صاحب کہا کرتے ہیں کہ دس نیکیاں کرنے سے بہتر ہے، ایک گناہ چھوڑ دو۔ یعنی دس نیکیاں کرنے سے جتنا تم اللہ کے قریب ہو گے، اس سے زیادہ ایک گناہ چھوڑ کر قریب ہو سکتے ہو۔ اور یہ اس لیے بھی عرض کر دیا کہ یہاں فیس بک پر بعض علماء یہ پوسٹیں لگا رہے ہیں کہ ہم نے اس سال میں فلاں فلاں مووی دیکھی ہے تو اس سے مجھے ہوا کہ کسی کو یہ بھی ذکر کر دینا چاہیے کہ میں نے اس سال میں کوئی مووی نہیں

دیکھی تاکہ مووی دیکھنا کوئی قابل فخر بات نہ رہے کہ عام لوگ اس حسرت میں ہی رہیں کہ ہم نے ابھی تک کیوں نہ دیکھی۔

جزاک اللہ خیرا

حضرت اسامہ بن زید رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ جب کسی ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کے ساتھ کوئی بھلائی کی تو جس کے ساتھ بھلائی کی گئی تھی، اس نے اس کو "جزاك الله خيرا" کے الفاظ کے ساتھ دعا دی تو اس نے اپنی دعا میں مبالغہ کیا یعنی اسے بہت زبردست دعا دی۔ یہ روایت سنن الترمذی کی ہے اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

ہم اکثر اوقات ایک دوسرے کو "جزاك الله خيرا" کے الفاظ کہہ دیتے ہیں اور یہ بہت بڑی دعا ہے یعنی مبالغہ آمیز دعا ہے۔ اس دعا میں مبالغہ کیا ہے؟ مبالغہ یہ ہے کہ دعا دینے والے یہ کہہ رہا ہے کہ اللہ تمہیں اس نیکی کی بہترین جزا دے اور اللہ تعالی کا بہترین کیا ہوگا؟ اس کے بارے ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ پس جسے ان الفاظ کے ساتھ دعا دی گئی تو اسے بہترین دعا دی گئی۔

بعض لوگ جزاک اللہ خیرا کی جگہ صرف جزاک اللہ کہہ دیتے ہیں، صرف جزاک اللہ کے معنی ہیں کہ اللہ تمہیں اس کا بدلہ دے۔ ایک تو اس میں مبالغہ نہیں ہے اور دوسرا اس کا معنی اچھا برا دونوں قسم کا بدلہ ہو سکتا ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تمہیں پوچھے۔ بہر حال کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بعض الفاظ کو ہم چھوٹا سمجھتے ہیں لیکن اللہ کی نظر میں ان کی بہت وقعت ہوتی ہے، جبکہ وہ کسی دوسرے مسلمان بھائی کے بارے کہے جا رہے ہوں۔